

ائمہ مساجد کے لیے : علمی فکری تربیتی اصلاحی بیش بہا تحفہ

نَهجُ الْاَئِمَّةُ
فِيْ
اِصْلَاحِ الْاُمَّةُ

حصّہ اوّل

از : عبدالحفیظ ایلولوی (گجرات)

ناشر : مکتبہ احمدیّہ
جامعہ حسینیہ راندیر
مورابھاگل، راندیر، سورت، گجرات، انڈیا۔

باسم الفتاح العلیم ۔ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا

ائمہ مساجد کے لیے : علمی فکری تربیتی اصلاحی بیش بہا تحفہ

نَهْجُ الْاَئِمَّةِ فِيْ اِصْلَاحِ الْاُمَّةِ

حصہ اول

از : عبدالحفیظ ایلولوی (گجرات)

99746 04855

✵ تفصیلات ✵

نام کتاب : نَهْجُ الْاَئِمَّةِ فِيْ اِصْلَاحِ الْاُمَّةِ

جامع ومرتب: مولانا قاری عبدالحفیظ صاحب ایلولوی

(خادم الحدیث والفقہ جامعہ حسینیہ راندیر، سورت)

تصحیح : (۱) جناب حضرت مولانا خالد صاحب

(استاذ الحدیث جامعہ حسینیہ راندیر، سورت)

(۲) برادر جناب امداد اللہ صاحب احمد آبادی

کمپوزنگ : مولانا ضیاء الرحیم رحیمی (ہدایت آرٹ، سگرام پورہ، سورت)

صفحات : ۱۲۰

ثانی ایڈیشن : محرم ۱۴۳۹ھ بمطابق اکتوبر ۲۰۱۷ء

ناشر: مکتبہ احمدیّہ،

جامعہ حسینیہ راندیر
مورا بھاگل، راندیر، سورت، گجرات، انڈیا۔

ایلول نزدِ نور مسجد، ہمت نگر، سابر کانٹھا، گجرات

99746 04855

مساجد اسلام کے روز اول سے مسلمانوں میں دینی سرگرمیوں اور غیر اقوام میں اسلامی اشاعت اور عام رشد و ہدایت کا مرکز رہی ہیں۔ مساجد اور اس کے منبر و محراب وہ مراکز ہدایت و مصادر ہیں جہاں سے ماضی میں ''كُونُوا مِثْلَنَا'' کی صدائیں بلند ہوئیں۔ جب اسلام اپنی حقیقت کے ساتھ زندہ تھا تو مسجد صرف مسجد نہ تھی، وہ عبادت گاہ، تعلیمی مدرسہ، اصلاحی و تبلیغی مرکز، اہل اسلام کا دار الندوۃ اور دولت اسلامیہ کا دار القضا بھی تھی۔ اسلامی سارے نظام مسجد و امامت سے منسلک تھے۔ جیسا کہ ذیل کے جدول سے واضح ہو رہا ہے۔

نمبر شمار	احوالِ مختلفہ	منصبِ امامت	نظامِ مساجد
۱	مقتدا بن کر	قوم میں اطاعت خدا اور رسول لانا	نظم طاعت و اتباع
۲	امام بن کر	قوم کو مجتمع رکھنا	نظم وحدت و اتحاد
۳	معلّم بن کر	قوم کو علم سے آراستہ کرنا	نظم تعلیم و تربیت
۴	مبلّغ بن کر	ایمانی جڑوں کو پانی دینا	نظم دعوت و تبلیغ
۵	حکیم و حاکم بن کر	نظریاتی کھائی کو پاٹنا	نظم مملکت و سیاست
۶	عابد بن کر	غفلت و سستی کو چاک کرنا	نظم عبدیت و بندگی
۷	مصلِح بن کر	معاشرے کو صالح بنانا	نظم صلاح و اصلاح
۸	داعی بن کر	اعلاء کلمۃ اللہ (بلند کرنا)	نظم اشاعتِ اسلام
۹	قاضی بن کر	تنازعات و جھگڑوں کو مٹانا	نظم مساوات و اخوت
۱۰	ہادی بن کر	دینی و دنیوی راہ نمائی کرنا	نظم ہدایت و شعور

مسجد و امامت کا مفہوم خیر القرون میں آج کے مفہوم سے زیادہ وسیع تھا۔ کتاب ہذا کا خاص مقصد نظام مساجد اور امامت کو خیر القرون کے نہج پر لاکر ائمہ مساجد کو فعّال بنا کر ان ہی کو اصلاح امت و اصلاح معاشرہ میں افراد ساز بنانا ہے۔

پیش لفظ

فقیہ عصر جناب حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم

مسجدیں اللہ کا گھر ہیں، اس لیے اللہ کے بھیجے ہوئے دین شریعت سے متعلق تمام کاموں کا مرکز بھی یہی مسجدیں ہیں، نماز باجماعت اور اعتکاف تو ایسا عمل ہے جس کو مسجد ہی میں انجام دینا واجب ہے، لیکن مسجد کا کردار ان دو اعمال تک محدود نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجدیں درسگاہ بھی تھیں، یہیں تذکیہ واحسان کی بزم بھی آراستہ کی جاتی تھیں، اسی میں مسلمانوں کے باہمی مقدمات فیصل کئے جاتے تھے، یہیں سے فتاویٰ صادر کئے جاتے تھے اور مسائل شرعیہ کی رہنمائی ہوتی تھی، یہیں مجاہدین اسلام کے لشکر مرتب کئے جاتے تھے، یہیں سے احکام سلطنت جاری کئے جاتے تھے، اور اسی جگہ بیرونی سفراء اور وفود سے ملاقاتیں ہوتی تھیں، غرض کے مسجد مسلمانوں کا ہمہ جہت مرکز تھی، اور مسجد کا امام زندگی کے تمام مسائل میں مسلمانوں کا قائد اور رہنما ہوتا تھا۔

افسوس کہ جیسے زندگی کے دوسرے شعبوں میں اضمحلال آ گیا اور مسلمانوں کا عمل قرن اول سے ہٹ گیا، اسی طرح لوگوں نے مسجد کو نماز واعتکاف تک محدود کر دیا، اور ائمہ صرف پانچ وقتہ نماز کے امام سمجھے جانے لگے، نہ لوگوں میں یہ جذبہ باقی رہا کہ وہ زندگی کے تمام مسائل میں امام کو اپنا قائد ورہنما سمجھیں اور نہ ائمہ میں اپنے درجہ ومرتبہ اور مقام کا احساس باقی رہا کہ وہ صرف نمازوں کے امام نہیں ہیں، بلکہ مسلم معاشرہ کی پوری زندگی کے امام ہیں، آج مسلمان جس

بے دینی، بے راہ روی اور معاملات اور سماجی زندگی میں شریعت سے غفلت کا شکار ہیں، اس کا علاج اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ وہ مسجد کو زندگی کے تمام مسائل میں مرکز ہدایت بنالیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بات کو بار بار کہنے اور لکھنے کی ضرورت ہے، مقام مسرت ہے کہ محبی فی اللہ جناب مولانا عبدالحفیظ ایلولوی صاحب نے اس مسئلہ کی ضرورت واہمیت کو محسوس کرتے ہوئے تفصیل سے قلم اٹھایا ہے، نیز قرآن وحدیث اور سلف صالحین کی تعلیمات سے استفادہ کرتے ہوئے اس موضوع پر ایک مفصل کتاب مرتب کی ہے، جس میں مساجد اور ائمہ مساجد کے مقام اور ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور ائمہ کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ معاشرہ میں مساجد کے کردار کو بحال کریں اور اپنی ذمہ داریوں کو پوری فعالیت اور بصیرت کے ساتھ انجام دیں، یہ ایک مفید کتاب ہے، مصنف نے مناسب سمجھا کہ تدریج پر عمل کرتے ہوئے اس کے تھوڑے تھوڑے حصے شائع کئے جائیں، اس لیے ابھی اس کا پہلا حصہ جس میں مساجد کی اہمیت اور منصب امامت کے تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی ہے شائع کر رہے ہیں۔

یہ حقیر ابھی سفر میں ہے، اس نے مختلف مقامات سے مطالعہ کی سعادت حاصل کی، امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب کتاب ہوگی، موصوف نے نظام مساجد کی اصلاح کا ایک نظام بھی مرتب کیا ہے، اگر واقعی وہ عمل کے سانچہ میں ڈھل جائے تو یہ ایک بڑا کام ہوگا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس کوشش کو قبول فرمائے۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

خالد سیف اللہ رحمانی
نزیل : جامعۃ القرأت، کفلیتہ، گجرات
۷ شعبان ۱۴۳۸ھ
۳ مئی ۲۰۱۷ء

تقاریظ

جامع الشریعت والطریقت

حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم العالیہ

(شیخ الحدیث وسابق صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔

زیر نظر کتاب کے نام سے ظاہر ہے یہ ائمہ مساجد کی وساطت سے امت کی اصلاح کے لیے تالیف کی گئی ہے۔ کتاب کے مطالعہ کا موقع تو احقر کو نہیں مل سکا، لیکن کتاب کی ضخامت اور ابواب کی تقسیم پر سرسری نظر ڈالنے سے ترتیب وانداز قابلِ تعریف نظر آیا، کتاب کے اکثر مضامین حضرات اسلاف واکابر کی کتابوں سے ماخوذ ہیں، مضامین کے مآخذ وحوالہ جات اندر موجود ہیں، اس لیے امید کی جاسکتی ہے یہ کتاب اصلاحی کام انجام دینے والے حضرات کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی انشاء اللہ۔

دل سے دعا کرتا ہوں کہ: مؤلف نے اصلاحِ امت اور اصلاحِ معاشرہ کا جو بیڑا اٹھایا ہے، اور اس سلسلے میں ایک مستقل فکری تنظیم وجود میں لانے کا جو پروگرام طے کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان دونوں نیک مقاصد میں مؤلف کی بے حد مدد فرمائے، شرفِ قبولیت عطا فرمائے، اور اس لائن کی ساری رکاوٹیں دور فرمائے، اپنے خزانۂ غیب سے اسباب ووسائل مہیا فرمائے۔

اس پُرآشوب دور میں موصوف کی اس پیش کش پر اُنھیں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں،

امید ہے کہ ائمہ مساجد اور دیگر اصلاحی تنظیموں میں اس امید آور اصلاحی کام کو سراہا جائے گا اور عملی جامہ پہنایا جائے گا۔

املاہ : العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۲۱ جمادی الثانیہ ۱۴۳۸ھ

پیر طریقت

حضرت اقدس مفتی اسماعیل صاحب کچھولوی دامت برکاتہم العالیہ

(صدر مفتی و شیخ الحدیث جامعہ حسینیہ راندیر)

محترمی و مکرمی محبی فی اللہ حضرت مولانا قاری عبد الحفیظ صاحب دامت برکاتہم بعد سلام مسنون آپ کا گرامی نامہ اور آپ کی تصنیف ''نہج الائمۃ فی اصلاح الامۃ'' موصول ہوئی۔ فللہ الحمد والمنۃ، آپ نے جس بے پناہ محنت و مشقت سے یہ مواد جمع کیا اور ترتیب دیا ہے اس پر بہت ہی مسرت کا اظہار کرتا ہوں۔

منصب امامت اور نظام مساجد کو خیر القرون کے نہج پر لانے کے لیے تالیف کردہ مسودہ ''نہج الائمۃ فی اصلاح الامۃ'' ایک گراں قدر جدوجہد ہے۔ ایسے نایاب موضوع پر مؤلف کی نگاہ کا اٹھنا یہ بھی بفضل خدا ہے۔

اگر چہ اس موضوع پر ''تحفۃ الائمۃ'' بھی ہے جو نہایت ہی عمدۃ کتاب ہے لیکن منصب امامت و نظام مساجد کو مذکورہ بالا طریقہ پر لانے میں اور معروفات و منکرات کے درجات سے اصلاح امت اور اصلاح معاشرہ میں یہ کتاب منفرد ہے۔ سو یہ کاوش نہایت ہی قابل تحسین

ہے اور اس جانب اقدام قابل تعریف ہے۔

اپنے فرائض منصبی کی مصروفیات کی وجہ سے کتاب کو نہ دیکھ سکا تاہم جستہ جستہ مقامات پر نظر سے اندازہ ہوا کہ اصلاح امت اور اصلاح معاشرہ کے لیے امت سے حسن ظن رکھتے ہوئے اور خدائی مدد پر اعتماد کرتے ہوئے جو مضامین پیش کیے گیے ہیں نہایت ہی اہم ہیں جوان شاء اللہ ضرور کارآمد ہوں گے۔

میں علماء حضرات سے اور بطور خاص ائمہ حضرات سے گذارش کرتا ہوں کہ اس کتاب کو اپنی اور اپنے ماتحت مقتدیوں کی اصلاح کے لیے ضرور پڑھیں، اور منصب امامت اور نظام مساجد کو خیر القرون کے نہج پر لانے کی کوشش ضرور کریں۔ ''مَالَا یُدرك کُلُّهٗ لَایُترَكُ کُلُّهٗ'' کو مد نظر رکھنا چاہیے۔

کتاب مذکور کی افادیت کے پیش نظر آپ نے ایک باعمل تنظیم کا بھی ارادہ کیا ہے، اس سے آپ کی فکری پرواز کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''اَللّٰھُمَّ زِدْفَزِدْ'' اللہ کرے وہ وجود میں آ کر ''سونے پر سہاگہ'' کا مصداق بنے، یہ بہت ہی عمدہ فکر ہے کیوں کہ اس میں کتاب ورجال کی دو قوتیں جمع ہوں گی۔ تاہم خاکسار اپنی مصروفیات کی وجہ سے آپ کی سرپرستی کی امید کو پوری نہیں کرسکتا، جس کا افسوس اور ندامت ہے۔ ہاں دعا ضرور کروں گا اور ارادہ رکھتا ہوں کہ دوسرے حضرات اس کو قبول کر کے تنظیم کو قوت بہم پہچائیں۔ آمین

کتبہ العبد اسماعیل کچھولوی عفی عنہ

۱۶ جمادی الثانیہ ۱۴۳۸ھ

۱۷-۳-۱

جناب حضرت علامہ قمر الدین صاحب گورکھپوری دامت برکاتہم العالیہ
(شیخ الحدیث از ہر ہند، دارالعلوم دیوبند)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد!

"نہج الائمۃ فی اصلاح الامۃ" مساجد کا مقام ومرتبہ اور ائمہ کی ذمہ داریوں پر مشتمل ہے آج ائمہ کرام کو صرف نمازوں کے پڑھانے پر خاص کرلیا گیا ہے۔ جبکہ ائمہ کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تابعین ہیں، امت کی اصلاح اور دینی ملی معاملات میں ان کی رائے لینی ضروری ہے۔

سلف کے زمانہ میں مساجد ہی تعلیمی ضرورت اور فیصلہ کی جگہ ہوتی تھی لہٰذا اخیر امت کی اصلاح اسی طرز پر ہوگی جس طریقہ پر خیر القرون کی اصلاح ہوتی تھی۔ لہٰذا مساجد کا احترام نمازوں کی ادائیگی کے ساتھ امت کی رہنمائی اور فیصلے بھی مساجد میں کئے جائیں، ہاں فیصلوں کا اجراء مساجد کے باہر کئے جائیں تاکہ مساجد تلویث سے محفوظ رہے اور ائمہ کرام ان معاملات کے نگراں ہوں۔

والسلام

قمر الدین

(خادم تدریس دارالعلوم دیوبند)

جناب حضرت مفتی احمد صاحب دیولا دامت برکاتہم العالیہ

(مدیر جامعہ علوم القرآن جمبوسر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد!

مسلمانوں کی تاریخ میں طویل عرصہ تک مسجد کو ایک عبادت گاہ ہونے کے ساتھ دیگر دینی مقاصد کے لیے مرکزیت کا درجہ حاصل رہا، چناں چہ عبادت گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ عقائد واحکام کی تعلیم اور قرآن وسنت کے علوم سے آگاہی کے لیے مسجد کو درس گاہ کی حیثیت حاصل رہی ، جہاں باقاعدہ شرعی علوم وعربی علوم کے علاوہ طب اور ہندسہ کی تعلیم بھی ہوتی تھی ، اور یہ ثقافت برصغیر کے علاوہ دیگر اسلامی خطوں میں بھی مساجد کی تعمیر میں نمایاں رہی ہے۔

خلافت اسلامیہ کے طویل دور میں مسجد بہ طور عدالت بھی تھی ، اسلامی معاشرہ میں عدل وانصاف کے حصول اور ظلم وزیادتی کے ازالے کا ایک مؤثر مرکز تھی ، عہد رسالت میں عسکری مہمات کے لیے مسجد ہی سے سپہ سالاروں کو پرچم دیئے جاتے تھے اور مہم کی تکمیل پر رپورٹ اور کارگزاری بھی یہیں پر پیش ہوتی تھی ، حالات کا جائزہ ، آئندہ کے لیے لائحہ عمل ، اہم ریاستی وحکومتی معاملات اور اسلام اور مسلمانوں کے مصالح پر غور وخوض بھی یہیں پر ہوتا تھا ، مسجد باہمی تعارف وتعلق کا بھی مؤثر ذریعہ تھی کہ مسلمان نمازوں کے اوقات میں باجماعت نماز کی پابندی کرتے تھے اور میل جول میں اضافہ ہوتا تھا اور یہی چند اخلاق وتعلیم کے رواج کا ایک بہترین سامان بھی بنتا تھا۔

غرض اسلامی تاریخ کے زریں دور میں مسجد کا معاشرہ ایسا مبارک اور ہمہ گیر سایہ تھا

کہ اس کی ٹھنڈک سے سب ہی سرشار ہوتے تھے اور یہاں دینی منکرات کے مقابلہ میں مدبرانہ حکمت عملی کے ساتھ اصلاح حال کی کوشش ہوتی تھی، آپس میں خیر خواہی اور ہم دردی کے جذبات واحساسات ذاتی مفادات پر غالب رہتے تھے، ہر طرف ایک دوسرے کے لیے سچا درد، باہمی احترام اور رحم دلی کے اسلامی جذبات کا دور دورہ تھا، اب صورت حال بدل گئی ہے، چناں چہ اب مسجد کثیر المقاصد مرکز نہیں رہی اور ذمہ دار حضرات کی جانب سے مناسب توجہ سے محروم ہے، ائمہ کرام کا دائرہ کار امامت کی حد تک اور خطابت کی حد تک محدود ہو گیا ہے۔

اور اگر کچھ توسع کی نظر سے دیکھا جائے تو حالات کی اس تبدیلی کے باوجود مسجد اب بھی وہ مقدس جگہ ہے، جہاں پنج وقتہ فرض نماز ہی ادا کی جاتی ہیں، ائمہ کرام محلے اور علاقے میں سکونت پذیر ہر عمل کے افراد، بالخصوص نوجوانوں کو دین کی راہ پر ڈالنے اور منکرات ومعاصی کے شعلوں سے ان کا رُخ موڑنے کی کامیاب کوشش کر سکتے ہیں۔

پس ضرورت ہے کہ مسجد کی اسی ہمہ جہتی حیثیت اور اس کے کثیر المقاصد ہونے کو اجاگر کرنے اور ائمہ کرام کی بیش بہا صلاحیتوں سے استفادہ کرتے ہوئے، معاشرہ کی بہترین تشکیل کے لیے خصوصی پروگرام تجویز کرتے ہوئے ایک تحریک چلائی جائے۔اس عظیم مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے گرامی قدر مولانا عبدالحفیظ ایلولوی زید مجدہ نے ایک تنظیم قائم کرنے کا مبارک ارادہ کیا، بندہ کے سامنے تنظیم کے مقاصد وطریقۂ کار پر مشتمل ایک مفید تحریر بھی ارسال فرمائی ہے، اور ساتھ ائمہ کی راہ نمائی کے لیے ایک مفصل کتاب بنام ''نہج الائمۃ فی اصلاح الامۃ'' بھی تالیف فرمائی ہے، ماشاء اللہ موصوف محترم کی یہ ساری ہی کاوشیں قابل تحسین ولائق صد مبارک باد ہیں، بندہ دل سے دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف محترم کے ان نیک عزائم کو بار آور فرمائے اور اس تنظیم کے قیام کے مقاصد کو پورا فرمائے اور معاشرہ کی اصلاح کا ذریعہ بنائے اور

ائمہ حضرات کو اس سے جوڑتے ہوئے، اصلاح معاشرہ میں اپنے اہم رول ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

کتبہ :احمد دیولا

۱۸/شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ

کلمات تحسین وتبریک

رئیس العلماء حضرت اقدس مولانا عبداللہ صاحب کاپودرہ دامت برکاتہم العالیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم ۔

بندہ ۱۶ فروری بروز جمعرات ۲۰۱۷ء بعد العصر حضرت مولانا حمزہ دیوا صاحب سلمہ "استاذ الحدیث مرکز اسلامی انکلیشور" کے ساتھ حضرت سے کتاب "نہج الائمۃ فی اصلاح الامۃ" کی تقریظ اور تنظیم برائے کل ائمہ مساجد کی سرپرستی کی درخواست کے لیے حضرت کے گھر پہنچا تو حضرت والا انتہائی علیل تھے۔

اس لیے حضرت کے صاحب زادے حضرت مولانا اسماعیل صاحب نے اس شرط کے ساتھ ملاقات دی کہ حضرت سے کتاب کے لیے صرف دعا کی درخواست کریں۔نہ اس کی تقریظ کی درخواست کریں نہ تنظیم کی سرپرستی کی درخواست،بل کہ تنظیم کے کاغذات تو انہوں نے ہی خود اپنے پاس رکھ لیے۔

حضرت سے اس طرح ملاقات کی کہ حضرت بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ہم سے آنے کی غرض دریافت کی تو ہم نے بتایا کہ یہ کتاب "نہج الائمۃ فی اصلاح الامۃ " تالیف کی ہے اس کے لیے دعا کی درخواست مطلوب ہے حضرت نے جب نام سنا تو حضرت نے اپنی زبان سے نام کا تلفظ فرمایا " نہج الائمۃ فی اصلاح الامۃ" پھر فرمایا لاؤ دکھاؤ تو بندہ نے کتاب کا پہلا صفحہ دکھایا۔

حضرت نے ۸ منٹ تقریباً بغور دیکھا پھر بند کر کے چند باتیں ارشاد فرمائیں۔ جو ذیل میں مرقوم ہیں۔

(۱) حضرت نے سب سے پہلے یہ جملہ ارشاد فرمایا : ''مولانا بہت عمدہ کتاب ہے'' پھر دوسرا جملہ ''بہتر کتاب ہے''۔

(۲) اس کام کی ضرورت تھی جسے ماشاء اللہ آپ نے پوری کی۔

نوٹ : اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر حضرت والا صحت یاب ہوتے اور کتاب کو مزید بغور ملاحظہ فرماتے تو کس قدر خوش ہوتے اور اگر تنظیم کے کاغذات دیکھتے تو کس قدر حیرت کا اظہار فرماتے!

(۳) پھر بندے سے دریافت فرمایا کہ آپ نے مساجد کے بارے میں جو عربی عبارت لکھی ہے وہ کہاں سے لی ہے؟ بندے نے کہا ایک عربی کتاب ''المساجد'' سے جواز ہر قاہرہ کے مصنف کی ہے۔ اور امام غزالیؒ کی کتاب سے بھی لی ہے۔

پھر حضرت نے کتاب کی عبارت ''فان المساجد کانت۔۔۔ قُطبها وحِصنها۔۔۔ پڑھ کر قطب الرّحی سے مطلب واضح فرمایا کہ مساجد پر امور مسلمین کا مدار اس طرح ہے جس طرح چکی کے پاٹ کا اس کے محور ''کیل'' پر جس کے گرد وہ پاٹ گھومتا ہے، پھر اہمیت مسجد کو بتاتے ہوئے فرمایا جامعہ ازہر جو بہت بڑا مدرسہ ہے وہ ابتدا میں مسجد ہی تھی پھر مدرسہ کی شکل اختیار کر گئی،

(۴) مسجد کے ہر امام کو حلیم الطبع ہونا چاہیے، اسے کسی مقتدی یا متولی وغیرہ کے کسی قول وفعل سے ناراض ہو کر جھگڑنا نہیں چاہیے، پھر وہ حدیث شریف عربی میں پڑھی جس میں تذکرہ ہے ایک دیہاتی کا کہ اس نے مسجد نبوی میں پیشاب کیا تھا اور آپ ﷺ نے اسے سمجھایا تھا۔

(۵) آج کل ائمہ حضرات نمازیں بھی مسنون قراءت سے نہیں پڑھاتے۔ مفصل کی جو تقسیم ''طوال، اوساط، قصار'' ہے اس کی رعایت سے نمازیں پڑھانی چاہیے۔

(۶) پھر بندے سے پوچھا کونسی کتابیں زیر تدریس ہیں؟ تو میں نے جواب دیا۔۔۔ تو

تعلیم پر فرمایا: طلباء کو اچھی طرح کتابیں سمجھنے اور یاد کرنے پر انعام بھی ہمیں دینا چاہیے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اطاعت گزاروں کے لیے انعامات دینے کو بیان فرما کر اس کی ہمیں ترغیب دی ہے فرمایا ” جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۔۔۔“ اور ”حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ ۔۔۔ وغیرہ۔

وداعی ملاقات کے وقت حضرت نے فرمایا جو باتیں کہیں انہیں لکھ دینا۔

مختصر ارشادات حضرت مولانا محمود شبیر صاحب دامت برکاتہم العالیہ

(مدیر جامعہ حسینیہ راندیر)

حضرت والا کو برائے تقریظ ”نہج الائمۃ فی اصلاح الامۃ“ کا مسودہ پیش کیا تھا، لیکن حضرت نے فرمایا اس کی ضرورت نہیں۔ بندے نے حضرت سے اس وقت موضوع سے متعلق جو گراں قدر ارشادات سنے تھے انہی کو بغرض استفادہ وتیمن قلم بند کیا ہے۔

فرمایا : ماضی قریب میں مساجد کے ائمہ حضرات آج کی طرح صرف نمازیں پڑھانا اپنی ذمے داری نہیں سمجھتے تھے، بل کہ دین وایمان، عقائد واخلاق میں اصلاح کی غرض سے ان کو اپنے سے خوب مانوس بھی رکھتے تھے، اتنے کہ اس معاشرے میں کوئی فرقہ یا کوئی شخص کوئی مسئلہ یا فتنہ اٹھاتا تو وہ کسی بھی قیمت پر اس نظریہ کو تسلیم نہ کرتے، ان کے پاس یہی ایک جواب ہوتا کہ ”ہمارا امام کیا کہتا ہے“

ان کا مذہبی یہ ربط اتنا پختہ ہوتا کہ بالفرض اپنے ہی مسلک کے علماء سے مگر دوسرے خطے کے علماء سے کوئی مسئلہ نقل کرتے ہوئے مثلاً کہا جاتا کہ ”دیوبند کے مفتی صاحب یہ فرماتے ہیں“ تو اس کے جواب میں بھی یہی کہتے ”ہمارا امام کیا کہتا ہے “مطلب انھیں اپنے اماموں پر پورا اعتماد ہوتا وہ اس کو حقیقی امام تسلیم کرتے اور اپنی زندگی کی پوری لگام امام کے ہاتھ میں

دیدیتے اور امام بھی پوری امانت داری سے اور ذمے داری سے ان کی صحیح قیادت وراہبری کرتا، تنخواہ اس کی نظر میں کوئی حیثیت نہ رکھتی۔لہٰذا آج بھی ائمہ کو چاہیے کہ وہ اپنے مقتدیوں سے گہرا ربط رکھیں اور ان کی پوری دینی ومذہبی صحیح راہبری کریں۔

اصلاح کے بارے میں فرمایا: کہ ائمہ صرف شرعی احکام سنادیا نہ کریں کہ یہ تو حرام ہے اور ناجائز ہے، بل کہ لوگوں کو منہیات سے بچانے میں حکمت اختیار کرتے ہوئے احکام بتانے کے ساتھ اس کا متبادل بھی بتایا کریں۔

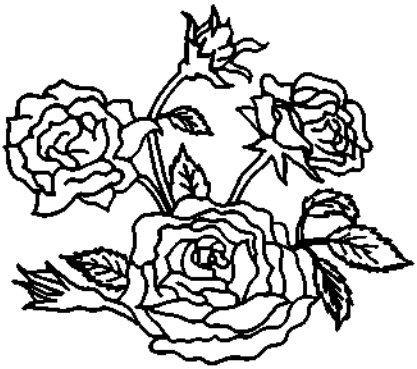
جس طرح سڑک پر جب مرمت وغیرہ کے کام سے عام سڑک کو بند کردیا جاتا ہے تو اس کا متبادل "ڈایورزن" بھی دیا جاتا ہے۔اور فرمایا جب لوگوں کو کوئی ایسی بات کہنی ہو جو انہیں ناگوار ہو تو اسے پسند کے راستے اور پسند کے طریقے سے کہنا چاہیے ورنہ لوگ اسے قبول نہیں کریں گے، جس طرح مریض کو انتہائی کڑوی دوا کپسول سے دی جاتی ہے۔خلاصہ یہ کہ ذہن سازی اور حکمت بہت ضروری ہے۔ فقط والسلام

بقلم عبدالحفیظ ایلولوی

بروز بدھ یکم جمادی الثانیہ ۱۴۳۸ھ

یکم مارچ ۲۰۱۷ء ۱۱/۳۰ آفس

مختصر فہرست (حصہ اول)



مقدمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کتاب کو چاہیے کہ دوران مطالعہ ''نقطہ تالیف'' ملحوظِ خاطر رکھیں تا کہ استفادہ کی راہ ہموار رہے، کیوں کہ خال خال مطالعہ کرنے والوں کو چھوڑ کر اکثر عاشقانِ علم وفن بھی کتابوں، تصنیفوں اور کتابچوں سے صرف حکمتوں، علمی شہ پاروں، ادبی جملوں، قصوں، اہم نصیحتوں اور گراں قدر شخصیتوں کے ملفوظات کے متلاشی ہوتے ہیں، انہیں نقطۂ تالیف اور مدعیٰ کتاب کا پتہ نہیں ہوتا۔

اذواق تصنیف اور اہمیت : بعض تالیفات عملی خرابیوں اور بعض علمی خرابیوں کی اصلاحی راہ نمائیوں کی ترجمان ہوتی ہیں، پھر مذکورہ ہر قسم کی دو قسمیں: (۱) جزئی عملی خرابی (۲) کلی عملی خرابی (۳) جزئی علمی خرابی (۴) کلی علمی خرابی۔ ان میں کلی علمی خرابیوں کی ترجمان آٹے میں نمک کی طرح ہوتی ہیں۔ اس کتاب کی یہی سعادت مندی ہے۔

بے دینی کی وجہ سے کسی کی ذاتی زندگی کا نقصان بطور خاص اسی تک محدود رہتا ہے، لیکن اجتماعی زندگی کا نقصان پوری قوم و جماعت تک متجاوز ہوتا ہے، اور اگر اس بگاڑ کی جڑ اور اصل کا پتہ ہی نہ ہو تو نہ صرف یہ کہ اس کے خطرات ونقصانات کا اندازہ مشکل ہوتا ہے بل کہ تلافی بھی ممکن نہیں رہتی۔ اس تالیف کے ذریعہ ایسی ہی ایک مخفی جڑ کی طرف اور ایسی علمی ونظری کوتاہی کی طرف راہ نمائی کی کوشش کی گئی ہے جو ساری بے دینی کی اصل اور جڑ ہے۔ لیکن ایسی راہ کا مسافر ہوں جس راہ کا مسافر نہ کوئی خاص مؤلف نظر آتا ہے نہ کوئی مصلح نہ کوئی خطیب ومقرر اور

نہ معاشرے میں بنی کوئی اس کی تنظیم۔ جانتے ہیں وہ مخفی جڑ کیا ہے؟ اور نقطۂ تالیف کیا ہے؟

وہ بتانے سے پہلے آپ سے التماساً ایک عہد لینا چاہتا ہوں، لہٰذا آپ وہ عہد مجھ سے فرمائیں کہ کتاب کو پڑھنے اور مخفی جڑ کو جاننے کے بعد اس کو زندہ کرنے آسمان وزمین کے قُلا بے ملانے کھڑے ہو جائیں گے، خون پسینہ ایک کریں گے اور اپنی ہڈیوں کو گھلائیں گے۔ پھر مجھ سے بھی عہد لیجئے کہ پھر اصلاحی انقلاب آنا ہے اور دس بار نہیں سو بار آنا ہے۔ تو پھر جان لیجئے!

تیر بہدف : مسلمانوں کو اپنے مورث پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی جانب سے خصوصاً۔۔۔ اور زمانہ خیر القرون کے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ سے عموماً۔۔۔ پوری اسلامی پونجی کی حفاظت کا ضامن گراں قدر نظام اور منصب کا خزانہ جو بطور موروثی ملا تھا وہ "مساجد، نظام مساجد اور منصب امامت" تھا۔ جس پر اسلام کا پورا پورا مدار تھا۔ لیکن بد قسمتی سے! کتنے عرصے سے وہ تو میں نہیں بتا سکتا شاید زمانہ خیر القرون کے کچھ عرصات کے بعد یہ نظام مساجد اور منصب امامت رسومات کی نذر ہو گیا اور موروثی اس نہج پر سے ہٹ گیے جس نہج پر وہ پہلے تھے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے جملہ نظام وامور سے روح نکل گئی اور جسد بے جان" خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃ "بن کر رہ گیے۔

غیر ممکن تلافی : اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر فکری ونظری کوتاہی یہ ہوئی کہ اتنے بڑے مؤثر اصلاحی منصب "امامت" کو نماز پنج گانہ، جمعہ اور عیدین کی جماعتوں کے ساتھ صرف مخصوص ہونا سمجھ لیا کہ امام کا فرض منصبی صرف نماز با جماعت پڑھا دینا ہے اور بس، نظام مساجد کو تو اس قدر فراموش کرا دیا کہ اب یہ باور کرنا بھی مشکل ہو گیا کہ ماضی میں اس قسم کا بھی کوئی مسجد کا نظام تھا۔ اس کا احساس حضرت مولانا سید احمد بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کو ہوا تھا جیسا کہ

حضرت مولانا ظفیر الدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''اسلام کا نظام مساجد'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔

مساجد کا نیٹ ورک: اسلام نے ائمہ مساجد کو منصب امامت اور منبر ومحراب کا مالک بنا کر اصلاح امت واصلاح معاشرہ کی ایسی نیٹ ورکنگ کا مالک بنایا ہے جو آج کی میڈیائی نیٹ ورکنگ سے بھی زیادہ وسیع اور مضبوط رابطہ کی نیٹ ورکنگ ہے۔ کیوں کہ ہماری مساجد آج ماضی سے بھی زیادہ بستی بستی، قریہ قریہ بل کہ محلہ محلہ موجود ہیں، ہمارا یہ مسجدی نیٹ ورک دیہاتوں، شہروں، صحرا، پہاڑوں اور سمندری چھوٹے بڑے جزیروں میں موجود وقائم ہے۔ دوسری طرف غور کریں کہ ایک مسلمان بلوغ سے لے کر تا موت اپنے امام کے پیچھے شب وروز میں پانچ بار ہفتے میں ایک بار اور سال میں دو بار نمازیں ادا کرتا ہے، اور سارے ہی مسلمان ان نمازوں کو جماعت کی شکل میں مل کر ادا کرتے ہیں ایسی اتباع وپیروی اور ایسی وحدت واجتماعیت کا نظام کیا مسلمانوں کے سوا کسی قوم کے پاس ہے؟

اگر ائمہ مساجد اور مسلمان اس مسجدی نیٹ ورکنگ کی مضبوطی کو اور مسجدی نظام: ایک امیر کی پیروی۔۔۔ اور قوم کی اتحادی طاقت۔۔۔ کو بگڑے معاشروں کی اصلاح میں اور قوم وجماعت کی تعمیر میں صرف کریں تو کیا دنیا میں انقلاب نہیں آسکتا؟ خصوصاً جب کہ اسلام کی جانب سے بروز جمعہ بذریعہ خطابت ذہن سازی کا ایک ایسا نظام بھی فراہم ہوا ہو کہ بغیر کسی اشتہار واعلان کے ہزاروں سامعین اپنی اپنی مساجد میں جمع ہو جائیں، یہ نظام بھی مسلمانوں کے سوا کسی کے پاس نہیں، ''وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ اور بقول مفسر ابن کثیر وَلِكُلِّ قَوْمٍ دَاعٍ آپ ائمہ حضرات کی حیثیت داعی کی ہے جسے کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

اگر یہ نظام مساجد اور منصب امامت ماضی کی طرح اپنی اصل پر آجائیں اور آنے بھی چاہئیں تو معاشروں اور امت کی اپنے اپنے مقامات پر بے مثال اصلاح حاصل ہو اور وہ بھی

رقومات کثیرہ،،، اوقات ثمینہ،،، اور جہود بلیغہ،،،صرف کیے بغیر۔ اس حقیر کاوش کا مقصد یہی ہے کہ اس کے کچھ شواہد اسلاف واخلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کی کتابوں سے جمع کیے جائیں پھر انہیں ماہرین قرآن وحدیث، اکابرین قوم وجماعت، جامع شریعت وطریقت اور متبعین سنت وسلف گراں قدر شخصیات کی خدمت میں پرکھنے کے لیے پیش کیا جائے پھر پرکھ کے بعد اور صداقت کے بعد سارے ہی ملک کے مسلمان بل کہ سارے ہی دنیا کے مسلمان اس گم شدہ گوہر کی تلاش میں اور اس کو جمع کرنے لگ جائیں تا کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف ہندوستان کا بل کہ پوری دنیا کا نقشہ بدل دیں۔

اللہ تعالیٰ کا بے پناہ فضل وکرم کہ ۲۰۱۳ء سے کام جاری تھا اس راہ کی علمی راہیں کشادہ فرماتے رہیں اور کچھ کچھ مواد فراہم ہوتا رہا، اسی میں سرفہرست کتاب ''اسلام کا نظام مساجد'' ہے اور مشکوۃ شریف، مرقات، نبراس پھر تحفۃ الائمۃ بھی ہے۔ یہ کتاب ''نہج الائمۃ فی اصلاح الائمۃ'' پانچ سو صفحات پر دو جلدوں میں ۲۰۱۷ء فروری کو منظر عام پر آیا ہی چاہتی تھی کہ حضرات اکابرین کی تقاریظ کے دوران ضخامت کی شکایت سامنے آئی۔ اس لیے ترتیب بدل کر معتدل حجم پر مشتمل ۴ یا ۵ حصوں میں طبع کرانا طے کرلیا (۱) اولاً اس لیے کہ مختصر کتاب سے مقصدِ تالیف ہر ایک پر واضح ہو سکے (۲) ثانیاً اس لیے کہ معمولی مصارف سے اسے تمام مساجد ہند بل کہ بیرون ہند تک بھی پہنچایا جا سکے۔ ۱

---

۱ کتاب کس قدر مفید ہے! قارئین حضرات پڑھنے کے بعد اس کا فیصلہ کریں گے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ تقریظ وتنظیم کے دوران جلیل القدر علماء حضرات میں سے بعض نے کتاب کا عربی اور بعض نے گجراتی ترجمہ کرانے کا مشورہ بھی دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو یہ بھی ضرور ہوگا۔ چناں چہ ابھی تو بندہ نے اس کی افادیت کے پیش نظر ایک باعمل تنظیم ''تنظیم کل ائمہ مساجد گجرات'' کی تشکیل کا نہ صرف عزم مصمم کیا ہے بل کہ حتی الوسع اس کی سعی بھی کی ہے ''تَقَبَّلَ اللّٰہُ مِنِّی''۔ آپ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے مدد فرمائیں۔ آمین۔

تَنبُّہ: قارئین حضرات سے درخواست ہے کہ اصلاح کی جو بھی بات ہو ضرور مطلع فرمائیں، مجھے اپنی بے بضاعتی وکم مائیگی کا نہ صرف احساس ہے بل کہ فی الحقیقت اعتراف بھی ہے۔ اور نہ میں کوئی صاحب قلم ہوں، فکر وقلم کی دو سواریوں میں فکر کی سواری ذرا تیز ہے قلم کی سست، لہٰذا میں ارباب قلم مصنفین اہل لسان واعظین اور ذی فکر ناصحین امت سے درخواست کرتا ہوں کہ خدارا اس جانب امت کے عوام وخواص کو متوجہ فرمانے کے لیے اٹھیں اور دوبارہ "**نظام مساجد اور منصب امامت**" کو خیر القرون کے نہج پر لانے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ وماتوفیقی الا باللہ۔ تمام مصادر ومراجع کو تبدیلی سے پہلے احوال ہی پر رکھ کر پہلے حصہ میں شامل کر لیے ہیں۔ دعا فرمائیں۔ فقط والسلام

عبدالحفیظ بن عبداللہ ایلولوی عفی عنہما
ہمت نگر، سابرکانٹھا، گجرات
(خادم التدریس جامعہ حسینیہ راندیر۔ سورت)
99746 04855

باب : مساجد اور امامت

فصل اول: مساجد اور نظام مساجد

دنیا ساری فانی ہے پر مساجد!

حضرت مولانا ظفیر الدین رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ کنز العمال ج ۱۱/ ۱۳۹ کی روایت ہے "تَذْهَبُ الْأَرْضُ كُلُّهَا إِلَّا الْمَسَاجِدَ يَنْضَمُّ بَعْضُهَا إِلَى بَعْضٍ قیامت کے روز ساری زمینیں مسجدوں کے سوا فنا ہو جائیں گی۔ رہی مساجد تو وہ ایک دوسرے سے مل جائیں گی۔ مل کر کیا ہوگا اس کی وضاحت تو یہاں نہیں لیکن دوسری احادیث کو سامنے رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے فردوس اعلیٰ کو منتقل ہو جائیں گی۔" اسلام کا نظام مساجد (۱۸)"۔ ۱

اور حضرت اقدس حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے: سب مل کر کعبہ مکرمہ اور مسجد حرام سے مل جائیں گی کیوں کہ وہی سب مسجدوں کی اصل ہے، اور لکھا ہے کہ بعض احادیث میں ہے کہ پھر سب مل کر جنت میں چلی جائیں گی (آداب مساجد ۱۳)۔ گویا ان فقراء امت کے لیے جو مسجد نبوی کے "ریاض الجنۃ" کے متمنی ہیں لیکن بوجہ فقر وہاں تک نہیں پہنچ سکتے اللہ تعالیٰ نے اس مقدس مقام کا ان کے مقام پر انتظام فرمادیا۔ گویا دنیا ساری فانی ہے اور مساجد غیر فانی۔ واللہ اعلم۔ کیا مقام ہے مسجد کا! لیکن کیوں؟

---

۱ حضرت مولانا ظفیر الدینؒ پورہ نوڈیہاوی نے مختلف نظام مساجد کی طرف راہ نمائی کے لیے ضخیم کتاب تصنیف کی ہے، جیسا کہ نام کتاب سے واضح ہے ائمہ اسے ضروری پڑھیں۔

اس لیے کہ وہ معبود کی جائے عبادت ہے، سوچیے تو صحیح ایک جائے عبادت بوجہ عبادت اس قدر تقدیس کا مقام حاصل کر لیتی ہے تو خود عبادت کا مقام کس قدر بلند ہوگا اور اس سے بڑھ کر عابدین (نمازی ائمہ مؤذنین) کا مقام کیا ہوگا!

سوچئے کتنے خوش قسمت ہیں مساجد کے وہ ائمہ جوان مقدس مقامات میں منبر و محراب کے اس حال میں مالک ہیں کہ ان کے ایک ہاتھ میں اگر اسلامی مقدس علوم کی شہادتیں اور سندیں ہیں تو دوسرے ہاتھ میں مقدس و پروقار منصب امامت کی باگ ڈور۔ آیئے معلوم کیے دیتے ہیں کہ ان کا کیا مقام ہے۔

یہ تو معلوم ہو ہی چکا کہ دنیا ساری فانی ہے پر مساجد جنتی، جب کہ جنت ایک مکلف مخلوق کے لیے تیار کی گئی ہے تو کیا اب یہ ممکن ہے کہ مساجد تو جنتی ہوں اور مقتدی ائمہ اور مؤذنین اس میں داخل نہ ہوں؟ ہرگز نہیں یقیناً وہ بھی جنتی ہیں! کیوں کہ احادیث مبارکہ میں وارد ہے مبشرِ امت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "ہر کلمہ گو (صحیح العقیدہ) بالیقین جنتی ہے (عن العباس طیبی ۱/ ۱۲۲، عن عمر مرقات ۲/ ۱۶۲)۔ اب چاہے یہ دخول ابتداءً ہی ہو یا گناہوں پر سزا پانے کے بعد۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ عَلٰی فَضْلِکَ غور کیجیے کتنی بڑی بشارت ہے اور ساتھ ہی سوچئے کہ ہم کون ہیں اور کیوں ہیں؟

مساجد کے کردار

بارشاد حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ: دور ماضی کی مملکت اسلامیہ کی مسجدیں خلفاء، امراء، قائدین، علماء، مفتیان، محدثین، مفسرین، اور ماہرین (مختلف) زبان وغیرہ تیار کرتی تھیں۔

جب اسلام اپنی حقیقت کے ساتھ زندہ تھا تو مسجد صرف مسجد نہ تھی، وہ عبادت گاہ، تعلیمی

مدرسہ، اصلاحی وتبلیغی مرکز، اہل اسلام کا دارالندوۃ اور دولت اسلامیہ کا دارالقضا بھی تھی۔

ہندوستان کی مشہور تاریخی ''جامع مسجد دہلی'' وہ مسجد ہے جہاں سے کئی تحریکیں وجود میں آئیں۔ مثلاً اکبر کے ''فتنہ دین الہیٰ'' کے خلاف اور شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے انگریزوں کے خلاف مختلف تحریکیں۔

مساجد اسلام کے روز اول سے مسلمانوں میں دینی سرگرمیوں، ملی وقومی جدوجہد اور غیر اقوام میں اسلامی اشاعت وتبلیغ کا اور بارش کی طرح عام رشد وہدایت کا مرکز رہی ہیں۔ مساجد اور اس کے منبر ومحراب وہ مراکز ہدایت ومصادر ہیں جہاں سے ماضی میں ایک طرف غیر اقوام میں اسلام کی اشاعت وتبلیغ کا عظیم فریضہ انجام دیا جاتا رہا اور ان کو ''کُوْنُوْا مِثْلَنَا'' کہہ کر اسلام کی طرف مدعو کیا جاتا رہا۔۔تو دوسری طرف ان ہی مساجد سے مسلم معاشروں کو بھی دینی وروحانی غذائیں پہنچا کر ان کی جڑوں کو مستحکم کیا جاتا۔

مساجد وہ پاور ہاؤس تھیں جہاں سے دینی پاور سب ہی جگہ سپلائی ہوتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں، ہر محلہ، قریہ اور شہر میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مساجد بنانے کی توفیق بخشتا رہا تاکہ یہ دونوں فریضے اپنے مرکز سے برابر انجام دیے جاتے رہیں۔

لیکن صد افسوس ! مذکور الصدر دونوں جہتوں سے مساجد آج بانجھ نظر آتی ہیں۔ اور ان کا پورا اسلامی نظام رسومات کی نذر ہو نظر آتا ہے اور منصب امامت کے جو بنیادی مقاصد تھے وہ فراموش کیے نظر آتے ہیں۔ شعر

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے	من اپنا پرانا پاپی رہا برسوں میں نمازی بن نہ سکا۔

یہ تھے مساجد اسلام کے کردار جو آپ نے حیرت سے ملاحظہ فرمائے! اللہ تعالیٰ آپ کی حیرت کو قبول فرما کر انہیں زندہ کرنے کے لیے جدید بے مثال حوصلے نصیب فرمائیں۔ کیا آج

آپ دور حاضر کے مسلمانوں کو کسی ملک کسی خطے کسی شہر یا آبادی میں انہیں انجام دیتے ہوئے دیکھ رہے ہیں؟ حسرت کی نگاہیں ان کو دیکھنے بے چین ہیں اللہ تعالیٰ ایسی نگاہوں کی تڑپ وبے چینی کو قبول فرما کر انہیں زندہ کرنے کی توفیق نصیب فرمائیں۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ اس کی ذمہ داری کا بوجھ سب سے پہلے کس کے کندھوں پر ہے؟ تو جان لیجئے کہ اس کی ذمے داری کا سب سے پہلے بوجھ ائمہ مساجد کے کندھوں پر ہے اور ساتھ ہی مقتدیوں اور سب ہی مسلمانوں کے کندھوں پر بھی ''عَلٰی قَدْرِ مَنَازِلِهِمْ ''۔

حیرت ہے کہ آج مساجد میں ادائے نماز، اقامت جماعت اور جمعہ کے وعظ وخطاب کے سوا نہ کوئی مسلمانوں کی خاص تعلیم وتربیت کا نظام ہے۔۔۔ نہ اصلاح معاشرہ کی کوئی کاروائی اور جدوجہد۔۔۔ اور نہ غیر اقوام میں اشاعت اسلام کا کوئی جذبہ اور اس کا تصور۔ اگر ہم سب مل کر عزم کریں تو مساجد میں نمازیوں کی اتنی بڑی تعداد کی تعلیم وتربیت اور اصلاحی جدوجہد سے معاشرہ کو ضرور مثالی بنا سکتے ہیں۔

خیر القرون میں مسجدوں میں امامت کا جو مفہوم ذہنوں میں تھا آج اسے چھوڑ کر امامت جماعت کے مفہوم میں محدود کر لیا گیا تو اب یہ کہنا بجا ہے کہ جن ائمہ حضرات کے ہاتھوں میں اسلامی نظام (امامت) کی باگ ڈور ہے گویا ان کے ہی حلق میں اصلاحی ذمہ داری کا احساس پورے طور سے نہیں اترا۔ شعر :

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ	ہم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے۔

اس کا احساس حضرت مولانا سید احمد بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کو ہوا تھا جیسا کہ حضرت مولانا ظفیر الدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''اسلام کا نظام مساجد'' میں اس کا ذکر ہے۔ بارشاد قرآن

ہر قوم و جماعت کا ایک ہادی و ذمہ دار ہوتا ہے ''وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ '' جو ان کے دینی و دنیوی امور کا نظم و انتظام کرتا ہے۔ بتفسیر مفسر ابن کثیر '' وَلِكُلِّ قَوْمٍ دَاعٍ '' کہ ہر قوم کا ایک داعی اور راہبر ہوتا ہے۔'' اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ فَالْاِمَامُ الَّذِيْ عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ ''(مشکوۃ ۳۲۰)۔

بقول امام قرطبی '' مَا يَزَعُ الْاِمَامُ اَكْثَرُ مِمَّا يَزَعُ الْقُرْاٰنُ '' کہ قرآن لوگوں کو جتنا ظلم و گناہ سے روکتا ہے اس سے زیادہ امام روکتا ہے (قرطبی ۱۶۸/۱۳)۔ بقول حضرت مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمہ اللہ تعالیٰ اصلاحی نگہداشت کے بغیر اور اسلامی فکر و دعوت کے بغیر قومیں اور جماعتیں بغیر چرواہے کے جانوروں کا ریوڑ بن کر رہ جائیں گی یا سواروں سے بھرا جہاز جس کا ملاح غائب ہو۔

علماء حضرات (ائمہ حضرات) کو انبیاء علیہم السلام کا وارث اسی لیے قرار دیا گیا ہے تاکہ اپنے مورث کی طرح قوم کو دینی مزاج و ماحول پر کھڑا کریں اور یہ صرف اقامت جماعت سے حاصل نہیں ہوتا۔ ائمہ حضرات اپنی جیب کی ڈائری میں لکھ لیں کہ بڑا آدمی وہ ہے جسے دوسروں کے بارے میں ایسا ہی احساس ہو جیسا کسی کو اپنے بارے میں '' لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ ''(بخاری شریف ۶/۱)۔

یہ بات ذہن نشین ہو کہ کسی قوم و جماعت کے افکار و خیالات اور ان کے بگڑے اخلاق کو اچھا بنایا جاسکتا ہے اور مزید توجہ سے انہیں پروان بھی چڑھایا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ انسانی جماعتیں اور معاشرے صاف کاغذ کی طرح ہیں جس پر کوئی معلم جو چاہے لکھے۔ مذکورہ تفصیلی مضامین سے ائمہ مساجد کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی ذمہ داری میں نمازوں کی امامت کے ساتھ معاشرے کو اسلامی ان بنیادوں اور ان تعلیمات پر کھڑا کرنا بھی ہے جس کے ہم قرآن کریم

،سنت نبوی علیہ السلام اور سیرت نبوی ﷺ کی صورت میں وارث بنے ہیں۔

بل کہ امامت کے پردے میں اصل ذمہ داری یہی ہے کہ معاشرہ کو ہمہ جہتی اسلامی مضبوط زنجیروں اور حصاروں میں جکڑا جائے اور تعلیم ودعوت کو زندہ کیا جائے اور بطور خاص ان میں ایسا احساس اخوت پیدا کیا جائے کہ ہر فرد دوسرے مسلمان کو اپنے حقیقی بھائی کی طرح سمجھنے لگے، اس طرح کہ ان میں سے کسی کو ایک محلہ میں چھینک آجائے تو دوسرے محلہ میں یرحمک اللہ کی صدائیں گونج اٹھیں۔ اور معاشرے کو اس قدر اٹھائیں کہ کتابوں کے نقوش نفوس میں ڈھل جائیں کہ ہر فرد دنیا کو چند روزہ آنی جانی سمجھ کر آخرت کی جاویداں زندگی کے لیے عمل کی دنیا میں سرگرم رہ کر مستقبل کی تعمیر میں ہر وقت تازہ دم بنا رہے۔

اور یہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب اہل اسلام کو مساجد کی حقیقت اور اس کے باطنی پاکیزہ مقاصد اور اس کے کردار سے دل سوزی کے ساتھ خوب آگاہ کیا جائے اور صرف آگاہ کرنا نہیں بل کہ اس کے ساتھ ان میں قوت ارادہ اور بلند حوصلے بھی پیدا کئے جائیں۔

ہر مسلمان کو مساجد کے باطنی مقاصد ذہن نشین کرائیں

ائمہ حضرات کو چاہیے کہ وہ اپنے ماتحت مقتدیوں کو اسلامی قلعوں وحصون "مساجد" کی حقیقت اور ان کے باطنی مقاصد خوب ذہن نشین کرائیں،

- مسجد اسلام کے حق میں خدائی قلعہ ہے۔
- مسجدیں اسلامی دنیا کی نگہبان ہیں۔
- مسجد کے ذریعہ اسلام اپنی حیثیت کو زمین پر قائم کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے وہ دلوں کو مسخر کرتا ہے، اس کے ذریعہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد قائم ہوتا ہے۔

- مسجد ایک قسم کا دار الاسلام ہے۔
- مسجد اللہ تعالیٰ کی یاد کی جگہ ہے۔
- مسجد اسلامی اتحاد کی تربیت گاہ ہے۔
- مسجد مسلمانوں کے اعتماد علی اللہ کا نشان ہے۔
- مسجد اسلام کی دعوتی اور اصلاحی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلم حکمرانوں اور قوموں نے ماضی سے لے کر اب تک جا بجا مساجد کی تعمیر کی طرف خصوصی اعتنا کیا۔

غیروں سے کیا شکوہ خود مسلمانوں کو اپنے حفاظتی قلعوں اور اپنی مذہبی مقدس عبادت گاہوں کی حقیقت، اس کے باطنی مقاصد اور اس کے کردار معلوم نہیں۔

مساجد کے بارے میں یہ خیال کہ وہ صرف ادائے نماز کے لیے ہیں، مساجد کا ناقص مفہوم ہے اور اس کی حقیقت کے ساتھ مذاق اور اس کی عظمت کے ساتھ ظلم و حق تلفی ہے۔ سیرت جامعہ ومحکمہ پر اور زمانہ خیر القرون کے مساجد کے کردار پر نظر رکھنے والا مساجد کے بارے میں یہ تصور کبھی بھی ذہنوں میں قائم نہیں کر سکتا کہ وہ صرف ادائے نماز کی جگہیں ہیں۔

(۱) حدیث شریف : وَجُعِلَتْ لَنَا الْاَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدًا (مشکوۃ ۵۴) کا کیا مطلب ہے؟ کیوں کہ پھر تو پوری دنیا ادائے نماز کی جگہ ہے بل کہ خود آپ کا گھر بھی جائے نماز ہے، معلوم ہوا حدیث شریف میں مذکور مسجد اور اصطلاحی مسجد کے معنی و حقیقت میں فرق ہے۔

(۲) آیت شریفہ : اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ ---(سورۃ توبہ ۱۸) میں خشیت خداوندی اور ایتاء زکوۃ کا ذکر کیوں؟ معلوم ہوا کہ ادائے نماز کے ساتھ اور بھی بہت سے مقاصد

ہیں، اگر وہ ملحوظ خاطر نہ ہوں تو گھر کی انفرادی نماز اور مسجدوں کی جماعتوں کی نماز میں کوئی فرق نہ ہوا۔ پھر اسلام نے لوگوں کو مسجدوں میں خواہ مخواہ کیوں جمع کیا؟ یہی وجہ تھی کہ معمارِ اسلام ﷺ نے مکی و مدنی حالات کا جائزہ لے کر ''تعمیر مسجد'' کا دور رس ایک مضبوط فیصلہ فرمایا چناں چہ معمار اسلام ﷺ ہجرت مدینہ کے بعد فوراً معمارِ مسجد بھی خود بنتا ہے۔ حالات کے جائزہ کے بعد مسجد کی تعمیر خود بتاتا ہے کہ اس میں بلند مقاصد پنہاں ہیں، لہٰذا ائمہ حضرات کو چاہیے کہ مسجد میں آنے والے ہر مقتدی کو مساجد کی حقیقت اور اس کے مقاصد خوب ذہن نشین کرائیں۔

مثلاً : طاعت و بندگی۔۔۔ تعلیم و تعلّم۔۔۔ اصلاح و تزکیہ۔۔۔ تذکیر و نصیحت۔۔۔ تبلیغ دین اور اس کی دعوت فی المسلمین۔۔۔ اشاعت اسلام اور اعلاء کلمۃ اللہ فی غیر المسلمین۔۔۔ اتحاد و وحدت فی المسلمین ''بذریعہ جماعتِ نماز''۔۔۔ اطاعت خدا اور سول'' بذریعہ اتباع امام نماز وغیرہ۔ ان میں ہر ہر جز پر احادیث مبارکہ اور آثارِ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم موجود ہیں۔ مثلاً: باب عبادت میں نماز، دعا، ذکر، تلاوت قرآن وغیرہ پر اور باب تعلیم میں تعلیم نماز اور نماز کے دیگر اجزاء کی تعلیم پر مشتمل شواہد بکثرت موجود ہیں اسی طرح بقیہ امور پر بھی لیکن اختصار ملحوظ ہے۔ مذکورہ امور جو مقاصد مسجد ہیں ان میں ۱۳ امور زیادہ اہم ہیں جو کچھ تفصیل طلب ہیں ملاحظہ ہو۔

تعلیم و تعلّم

دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور زمانہ خیر القرون میں تعلیم و تعلّم وغیرہ امور سے مساجد اس قدر آباد تھیں کہ شب و روز کے تمام اوقات میں مختلف حلقے ہمیشہ قائم رہتے تھے، ہماری مسجدوں کی طرح اس پر تالے لگنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ اس وقت مساجد کا تعلیمی ''نظام'' اس قدر عام تھا

کہ ہر طبقہ کا ہر فرد اپنی علمی غذا ان حلقوں سے حاصل کرتا تھا اس وقت مدارس کا کوئی وجود نہ تھا۔ موجودہ طرز کے مدارس کی ابتدا بہت بعد میں ہوئی۔ علامہ مقریزی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مدارس اسلام بعد میں بنائے گیے، دور صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم میں ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا، تعلیمی پورا نظام مساجد سے وابستہ تھا، مدارس کی تعمیر چوتھی صدی ہجری میں ہوئی، چناں چہ اہل نیشاپور نے سب سے پہلے ''مدرسہ بیہقیہ'' کی بنیاد ڈالی، لیکن پھر بھی لوگ اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے پھر۔۔۔۔۔ (کتاب الخطط والاثار ۲/ ۳۶۲)

نظام طاعت ووحدت

اس نظام کی تفصیل یہ ہے کہ مساجد میں دو چیزیں اہم ہیں ایک جماعت کی نماز اور دوسری جماعت میں ایک امام کی لازمی اتباع اور پیروی۔

(۱) اپنے امام کی لازمی اتباع : اسلام نے مقتدی پر اپنے امام کی اتباع کو اس قدر لازم کیا ہے کہ ایک لحہ کے لیے اتباع سے انحراف کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ یہ اتباع صرف سال اور ہفتہ میں ایک دو بار نہیں بل کہ روزانہ ضروری قرار دیا اور وہ بھی پانچ بار جس میں ایک وقت کی بھی معافی نہیں۔ اور حیرت یہ ہے کہ وہ مقتدی یہ اتباع از بلوغ تا موت اختیار کرتا ہے۔

(۲) قوم کی شیرازہ بندی اور اس کا اتحاد: اسلام نے جماعت کی نماز کو مشروع کر کے قوم کی اعلی درجہ کی شیرازہ بندی کا نظم فرمایا اور مزید اسبوعیہ جمعہ اور پھر ترقی کر کے سنویہ عیدین کو بھی مشروع فرما کر کوئی رخنہ نہیں چھوڑا تا کہ نا قابل تسخیر قوت اجتماعیت اور قوت اتحاد حاصل ہو۔

اسلام نے نظم جماعت سے یہ تعلیم دینا چاہا کہ مسلمانوں میں بے مثال اخوت ومساوات قائم ہو نہ بڑا شخص کبراً و عجباً کسی سے قریب بیٹھنے اٹھنے میں کراہت ونفرت کرے نہ چھوٹا

شخص اپنے لیے اس کے قریب ہونے میں ذلت وعار محسوس کرے۔ شعر

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گیے محمود وایاز	نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

بل کہ وہ آپس میں حقیقی بھائی کی سی خوشبو محسوس کریں۔ اور بقول شیخ ابوالحسن علی الحسنی الندوی ایسا احساس اخوت پیدا ہو کہ اگر کسی محلے میں کسی مسلمان کو چھینک آجائے تو دوسرے محلے میں ''یَرْحَمُكَ اللہُ'' کی صدائیں گونج اٹھیں۔ اور وہ سیسہ پگھلائی دیوار کی طرح ''كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضاً'' ہوجائیں۔ جانثار صحابہ رضی اللہ عنہم نے جنگ ومعرکہ اور فقر ونزع جیسے ناگوار احوال میں اس کو ثابت کر کے اپنی جانثاری کا ثبوت پیش کیا۔

قابل توجہ اور قابل غور امر یہ ہے کہ کیا یہ اتباع اور یہ وحدت واتحاد حد نماز تک کے لیے ہے۔ نہیں اور ہرگز نہیں بل کہ اس لیے ہے کہ خارج نماز بھی یہ اتباع اور اتحاد باقی رہے۔ نماز وجماعت دی ہی اس لیے ہے کہ زندگی میں عبدیت واطاعت پیدا ہو اور بے پناہ وحدت واتحاد پیدا ہو۔ خیر القرون کا نظام مسجد اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرتیں شاہد ہیں کہ وہ اپنے امام ''آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم'' کی اس قدر اتباع واطاعت کرتے تھے کہ خارج نماز بھی بال کے برابر انحراف نہیں کرتے تھے اور آپس کا اتحاد اس قدر مضبوط تھا کہ انصار ومہاجرین کے درمیان مواخات ضرب المثل ہے۔ ہم اپنے مقتدیوں کو ایک لمحہ اس نظر سے دیکھیں کہ بے نمازی کو چھوڑ کر پابند نماز شخص میں اطاعت ''خدا ورسول'' واتباع کتنی پیدا ہوئی جب کہ سالہا سال سے نمازی ہے۔

مذکورہ صورتِ حال کے ہوتے ہوئے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ مسجد کے نظام اور منصب امامت سے مقصد ہمہ جہتی معاشرہ کی اصلاح کرنا ہے۔ اگر اس وقت بھی مساجد کے ائمہ حضرات اپنے منصب امامت کو اصلاح کا پلیٹ فارم بنائیں تو اس طرح کی اصلاح سے نہ صرف اصلاح کا کام زیادہ ہوگا۔۔۔اور سہولت سے ہوگا۔۔۔اور جلد بھی۔۔۔

بل کہ ان ہی کے ائمہ ہونے کی وجہ سے ’’ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ‘‘ ان کا حق بھی ہوگا اور ذمہ بعق بھی۔ اوران ہی میں رہنے سہنے سے وہ اصلاحی جہتوں سے اچھی طرح واقف بھی ہوں گے۔جس سے اصلاح صحیح بھی ہوگی۔ اور حقیقی اور واقعہ بھی جیسے کہ مثل مشہور ہے’’ صَاحِبُ الْبَيْتِ أَدْرىٰ بِمَا فِيْهِ ‘‘۔

حیرت ہے کہ غیر علماء ’’تبلیغی احباب ‘‘ بلا منصب ۔ ماشاء اللہ وجزاہم اللہ۔ اصلاح میں نمایاں کردار ادا کریں !اور ائمہ حضرات اپنے اتنے بڑے منصب ’’امامت‘‘ کے باوجود اصلاح امت اور اصلاح معاشرہ میں کوئی خاص کرتب نہ دکھائیں۔

⬅ **ہائے افسوس :** آج مساجد کی حقیقت پر اس قدر ظلم وستم ڈھایا جارہا ہے کہ دیکھا اور سنا نہیں جاتا، اسلام میں جماعت کی حاضری ضروری نہ ہوتی تو گھروں میں ہی نماز پڑھ لینے کو دل چاہتا ہے۔ مان لیجئے کہ مساجد کے مذکورہ اہداف اور اس کے کردار کو چھوڑ کر بھی آج لوگ ادائے نماز تک کے لیے ’’عملاً‘‘ محدود سمجھتے تب بھی معافی کی گنجائش تھی کہ بھول بہر حال قابل عفو ہے،لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہاں تو مساجد میں آمد ورفت کا خاص مقصد دنیوی اور جسمانی راحتوں کا حصول بن گیا ہے کیوں کہ آج کل گھروں سے بھی اچھا انتظام مسجدوں میں کیا گیا ہے کالین، لائٹ، پنکھا، پانی، اے سی، استنجاء خانے وغیرہ۔

اور اس سے بھی ایک قدم آگے آمد کا مقصد اغراض فاسدہ کا حصول معلوم ہوتا ہے۔ تکبیر تحریمہ سے پہلے بھی اور سلام پھیرنے کے بعد فوراً بھی اس طرح لوگ نظر آتے ہیں کہ گویا کسی کی طلب مقصود ہے کسی کی تلاشی منظور ہے۔اور اس سے بھی آگے تو حد ہی نہیں رہی بے امام اشخاص عوام بھی اور خواص بھی اور امام مسجد بھی جب جب موقع پایا لوگوں کے سامنے دینی

اطلاعات واعلانات کے روپ میں مائک لے کر کھڑے ہوجاتے ہیں اور اپنی برتری اپنی عزت کی چھاپ لوگوں پر ڈالتے ہیں اور اس چھاپ کا غلط جگہ استعمال بھی کرتے ہیں اور اشراف لوگ اپنی نجات کے خاطر خاموشی اختیار کیے ہوتے ہیں۔

وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بغیر کسی جدوجہد مفت اپنی برتری جتانے کا اس سے بہتر موقع کہاں مل سکتا ہے، جب کہ محلہ اور بستی کے سارے ہی لوگ جمع ہیں اسے غنیمت سمجھ کر خوب پیٹ بھر کر نفس پرستی اور حب جاہ کے بت کی پرستش بلا جھجک کر لیتے ہیں۔ العیاذ باللہ گویا انہوں نے مسجد کے پاکیزہ بامقصد نظام کو بھی نہ بخشا اسے بھی انہوں نے اپنی اغراض کا نشانہ بنا دیا! پتہ نہیں قیامت کو کیا منہ دکھائیں گے یہ بھول نہیں یہ بالقصد ہے بھول کی بھی بھول ہے۔ بھول پر سجدہ سہو لازم ہوا تھا لیکن خود اسی سجدے میں بھی سہو ہوگیا وہ بھی یاد نہ رہا اور سلام پھیر دیا۔ اس طرح کی مختلف نیتوں سے مساجد میں آنے کی مذکورہ بات حدیث شریف سے مؤید ہے۔ اس میں پیشین گوئی مذکور ہے کہ مسجد میں آنے والے تین قسم (کی نیت) کے ہوتے ہیں (مشکوۃ ۱۲۳)۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ایسے سارے بھائیوں کو معاف فرمائیں ہمیں امید ہے کہ وہ ان شاء اللہ سچی توبہ کرلیں گے اور کتاب کی ہدایات کے مطابق اٹھ کھڑے ہوں گے دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اب اصل مقاصد پر کھڑا فرمائیں۔ آمین۔

مساجد ہیں کیا؟ مساجد کی حقیقت

ایک جلیل القدر عالم لکھتے ہیں کہ مسجد اہل ایمان کے لیے صرف گارے مٹی اور اینٹ اور سمنٹ سے بنی دیواروں کا نام نہیں ہے، جس طرح علم دین بغیر عمل کے صرف اصطلاحات یاد کرلینے کا نام نہیں۔ درحقیقت اگر اسلامی مصادر کو بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسجد اصل میں

بطور خاص نماز وعبادت کی مخصوص جگہ ہے۔۔۔تو ساتھ ہی قیام جماعت سے اجتماعیت ووحدت کی۔۔۔اور اتباع امام سے طاعت رسول وطاعت خدا کی۔۔۔اور اسلامی علوم کی تعلیمی جگہ بھی ہے۔۔۔اور اسلامی پیغام ومشن کو لوگوں میں پھیلانے اور عام کرنے کا ایک مرکز وپلیٹ فارم بھی ہے۔

مساجد دراصل ایک مشن کا پلیٹ فارم ہیں

دراصل مساجد صرف پنج گانہ نمازوں کی ادائیگی کے لیے ہی قائم نہیں کی گئیں ہیں بل کہ اس میں ''اَلْاَسْبَقَ فَالْاَسْبَقَ'' چھوٹے بڑے ''عَلٰی قَدْرِ مَنَازِلِھِمْ'' بہت سے مقاصد ملحوظ ہیں۔تھوڑی دیر کے لیے فرض کیجئے کہ قیام مساجد کا مقصد نمازوں کی ادائیگی ہے بس تو پھر مجھے بتائیں۔

(۱) اسلام نے پوری دنیا کے مسلمانوں پر خواہ مخواہ مساجد آنے کو لازم کیوں کیا؟ کیا یہ ادائیگی اپنے اپنے مقام پر نہیں ہوسکتی، روزوں اور زکوۃ وغیرہ کی ادائیگی مساجد میں کہاں ضروری ہے؟

(۲) تو پھر خواہ مخواہ پانچ بار مسلمانوں پر زحمت دینا نہیں؟ایک تو ایک پانچ بار!

(۳) اذانوں کی پکار کی ہدایت کیوں دی؟

(۴) طریقہ امامت وجماعت اختیار کرنے کا مکلف کیوں کیا گیا؟اپنی اپنی جگہ بھی تو چھوٹی بڑی جماعتوں سے یہ طریقہ اختیار کرکے اسے انجام دیا جاسکتا تھا۔

(۵) اگر قیام مساجد کا کوئی مقصد نہیں تو پھر جمعہ وعیدین میں بڑی تعداد میں جمع کیوں کیا گیا اور اس کا بار مسلمانوں پر کیوں ڈالا؟ جس میں بیچارے بیمار نادار کمزور، کیا یہ زحمت کا باعث نہیں؟ خواہ مخواہ مختلف مشاغل سے نکال کر ان کی معاش کو برباد کیوں کیا گیا؟

(۶) اتنی ساری مساجد کی تعمیر کا مالی بوجھ (رقوم غیر لازمہ) اسلام نے مسلمانوں پر کیوں ڈالا؟ بہتر تھا نادروں کو نقل کیا جاتا۔

کیا ایک عاقل و دانشمند اس کو بے معنی و فضول کہہ سکتا ہے؟ العیاذ باللہ ہرگز نہیں۔ جب نہیں تو اب مساجد کے مقاصد کو تسلیم کیجیے اور صرف نظری طور پر نہیں عملی طور پر تسلیم کیجیے ورنہ روز قیامت میں ہم اور آپ جواب دہی کے لیے تیار ہو جائیں، اللہ تعالیٰ پوری امت کو توفیق عمل نصیب فرمائیں۔ پھر ایک اور سوال لیجیے۔

(۷) آپ کا اور ہمارا وہ تمغۂ امتیاز جسے ہم فخریہ کہتے رہتے ہیں یہ ہے کہ مذہب اسلام ایک جامع کامل و مکمل مذہب ہے، وہ کوئی آبائی، انسانی، شخصی، زمانی، مکانی مذہب نہیں بل کہ آفاقی یعنی انٹرنیشنل (عالمگیر) دائمی مذہب ہے۔ جب اسلام آفاقی مذہب اور قیام مساجد کا کوئی مقصد نہیں، واہ رے واہ جس کے جی میں جو آئے کہے مذہب ہے کہ خواہش پرستی؟ کیا ایسی بات کوئی مجنون بھی باور کر سکتا ہے، بچہ بھی مان سکتا ہے؟

معلوم ہوا مساجد کا قیام بہت سے مقاصد، بہت سے نظاموں کے تحت ہوا ہے، جن میں سے بعضوں کو اس سے پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے لیکن بطور خاص جس کے لیے مساجد قائم کی گئیں ہیں وہ اسلامی پیغام اور اسلامی مشن کو دنیا میں عام کرنا اور اسے اہل دنیا تک پہنچانا ہے۔ گویا مساجد ایک مستحکم پیغام اور ایک مشن کی اشاعت کا پلیٹ فارم ہے۔

جس مشن کو لے کر اصلاً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، اور (تبعاً لہ علیہ السلام) وارثین انبیاء علیہم السلام یعنی علماء عظام بل کہ پوری امت پیدا ہوئی۔ ”اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ“ (ال عمران ۱۱۰)۔

مختلف نظام مساجد

مذکورہ مضمون میں جہاں مساجد کی حقیقت، اس کے باطنی مقاصد اور اس کے ایک پلیٹ فارم ہونے کو ذکر کیا گیا ہے وہاں مختلف نظاموں کا بھی اشارہ دیا گیا ہے۔ مثلاً: عبادتی، تعلیمی، اتحادی، اتباعی واطاعتی اور اشاعتی نظام وغیرہ۔ مزید نظاموں کو سطور ذیل میں بھی ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔

جب اسلام اپنی حقیقت کے ساتھ زندہ تھا تو مسجد صرف مسجد نہ تھی بل کہ وہ عبادت گاہ۔۔۔ تعلیمی مدرسہ۔۔۔ اصلاحی وتبلیغی مرکز۔۔۔ دولت اسلامیہ کا دار القضاء ودار الندوۃ۔۔۔ جنگی فوجوں کو روانہ کرنے۔۔۔ اور اسلامی قوانین کو عام کرنے کی شاہی مرکزی جگہ بھی تھی۔ کتنی عمدہ تعبیر ہے! اس میں بھی اصلاحی، سیاسی اور ملکی نظاموں کی طرف اشارہ ہے۔

گویا مسلمانوں کو مسجد میں پنج وقتہ نمازوں کے لیے جمع کر کے پورے ہی دین اور سارے ہی نظاموں کی طرف متوجہ ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ حتی کہ نکاح جیسی دنیوی رسم کے بارے میں ہدایت دی گئی کہ اسے مسجدوں میں کیا کرو حدیث شریف میں ہے ”أَعْلِنُوا هٰذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ“ (مشکوۃ ۲۷۲)۔

مساجد کے کردار کا اثر اس قدر وسیع ہے کہ مسجد تو مسجد پیغمبر عالم ﷺ نے عید گاہ میں بھی وعظ فرما کر اور وہیں سے (عبادت سے فارغ ہو کر) فوجوں اور دستوں کو باطل طاقتوں کو دبانے کے لیے روانہ فرما کر پیغمبر عالم پیغمبر امت ﷺ نے عالم اور امت کو اس بات کی تعلیم دی ہے کہ اسلام میں سیاسی اور ملکی نظاموں کا تعلق بھی اپنی جائے عبادت سے ہے چاہے وہ جائے عبادت مسجد ہو کہ عید گاہ۔ عیدین کی حدیث شریف میں ہے ”فَيَعِظُهُمْ وَيُوْصِيْهِمْ وَيَأْمُرُهُمْ

وَاِنْ كَانَ يُرِيْدُ اَنْ يَّقْطَعَ بَعْثًا قَطَعَهٗ اَوْ يَأْمُرَ بِشَيْئٍ اَمَرَ بِهٖ ثُمَّ يَنْصَرِفُ'' (مشکوۃ ۱۲۵)۔

بعض احادیث میں وارد ہے کہ عیدگاہ میں آپ کے ساتھ برچھی بھی لے جائی جاتی تھی (مشکوۃ ۴۳۷) جس کا مقصد علمائے اسلام نے یہ بتایا ہے کہ اسے نماز کے وقت سترہ بنایا جاتا۔ اور دوسرا مقصد یہ بتایا ہے کہ آپ اسے مسلمانوں کی جمعیت میں ساتھ رکھ کر حربی وجنگی گوشے کی طرف اشارہ دینا چاہتے ہیں۔ یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ اور ایک حدیث شریف میں ہے اس پر آپ ٹیک دے کر خطبہ دیتے (مشکوۃ ۱۲۵)۔

صاحب تحفۃ الائمۃ ''حضرت مولانا محمد حنیف عبدالمجید صاحب دامت برکاتہم'' نے شیخ صالح بن غانم کی کتاب ''المسجد ودورہ فی التربیۃ والتوجیہ وعلاقتہ بالمؤسسات الدعویۃ فی المجتمع '' سے ایک اقتباس پیش کیا ہے۔ کتاب کا نام ہے: معاشروں اور سوسائٹیوں پر مسجد کے تربیتی اور اس کے بنیادی دعوتی کردار، جس میں حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ''مساجد'' کے بارے میں ارشاد مرقوم ہے۔

مساجد بارشاد حجۃ الاسلام امام غزالی

● فَالْمَسْجِدُ كَانَ جَامِعَةً كُبْرٰى لِلتَّعْلِيْمِ وَتَخْرِيْجِ الْاَكْفَاءِ لِاِقَامَةِ الدَّوْلَةِ الْاِسْلَامِيَّةِ وَاِمْدَادِهَا بِالْعَامِلِيْنَ فِيْ كُلِّ مَجَالٍ مِنْ مَجَالَاتِ الْحَيَاةِ.

● وَقَدْ كَانَتِ الْمَسَاجِدُ فِي الْعَالَمِ الْاِسْلَامِيِّ تُخَرِّجُ الْخُلَفَاءَ، وَالْاُمَرَاءَ، وَالْقُوَّادَ وَالْعُلَمَاءَ، وَرِجَالَ الْقَضَاءِ، وَالْفُتْيَا، وَالْمُحَدِّثِيْنَ، وَالْمُفَسِّرِيْنَ، وَاللُّغَوِيِّيْنَ وَغَيْرَهُمْ۔

● وَقَدْ اَفْتَقَرَتْ اَكْثَرُ مَسَاجِدِ الْمُسْلِمِيْنَ عَنْ اَدَاءِ هٰذَا الْاَمْرِ الْعَظِيْمِ اِلَّا مَا نَدَرَ. وَاِنَّ اِعَادَةَ الْمَسْجِدِ اِلٰى مَكَانَتِهٖ مَرْهُوْنَةٌ بِاِعْطَاءِ الْمَسْجِدِ مَكَانَتَهُ الْاُوْلٰى كَمَا

كَانَ فِيْ صَدْرِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، حَيْثُ كَانَ مَصْدَرًا رَئِيْسًا مِنْ مَصَادِرِ التَّوْجِيْهِ وَالتَّرْبِيَةِ وَالتَّعْلِيْمِ "(تحفۃ الائمۃ ۲۹۴)

ترجمہ: ● مسجد تعلمی اور باصلاحیت افراد تیار کرنے کا بڑا ایسا ادارہ ہے جو اسلامی سلطنت کو قائم کرسکیں اور ساتھ ہی زندگی کے جملہ شعبوں میں کارنامے انجام دینے کے مالک (وہ) افراد سلطنتی مختلف امور کو مدد بہم بھی پہنچا سکیں۔

● دور ماضی کی مملکت اسلامیہ کی مسجدیں خلفاء، امراء، قائدین، علماء، مفتیان، محدثین، مفسرین، اور ماہرین (مختلف) زبان وغیرہ تیار کرتی تھیں۔

● سوائے چند مساجد کے آج اس عظیم کارنامے کو انجام دینے سے مسلمانوں کی ساری مسجدیں قاصر و عاجز ہیں، اور اب مسجد کو دوبارہ گذشتہ مرتبے پر پہنچانا جس پر وہ اس امت کی ابتدائی دور میں قائم تھی (وہ اُس وقت تعلیم وتربیت اور ہر قسم کی ہدایت وراہ نمائی کا صدر مقام تھی) اسی وقت ممکن ہے جب اہل اسلام کی جانب سے اسے وہ مقام "جہد ومحنت سے" عطا کیا جائے۔ یہ تھے حجۃ اسلام امام غزالی رحمہ اللہ کے مسجدی کردار کے متعلق تاثرات۔

مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوا کہ قرون اولیٰ میں امت کی ہر قسم کی تعلیم وتربیت کا انتظام مسجد سے وابستہ تھا، وہ دوسرے اداروں کی طرح افراد تیار کرنے کا اہم ادارہ تھا۔ اور یہ بھی واضح کردیا کہ اب قرون اولیٰ کے فوائد اسی وقت حاصل ہوسکتے ہیں جب کہ مساجد کو ان بنیادوں پر دوبارہ لوٹایا جائے، اور انہیں دوبارہ ان نظاموں پر لایا جائے جن پر وہ تھیں۔

ازہر قاہرہ کے عربی کتاب "المساجد" کے مؤلف "حسین مؤنس" اپنی کتاب میں اسی طرح کی بات ذیل کی سطور میں یوں پیش کررہے ہیں۔

● "اَنَّ الْمَسَاجِدَ فِيْ ذَاتِهَا مَرَاكِزُ لِلدَّعْوَةِ الْإِسْلَامِيَّةِ، وَمِنْ ثَمَّ فَلَا بُدَّ اَنْ

یَّعْمَلَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰی اِنْشَاءِ الْمَسَاجِدِ فِی الْبِلَادِ الَّتِیْ یُرِیْدُوْنَ تَثْبِیْتَ دَعَائِمِ الْاِسْلَامِ فِیْهَا وَتَوْسِیْعَ نِطَاقِهٖ۔ زَاوِیَةٌ صَغِیْرَةٌ یَقُوْمُ فِیْهَا اِمَامٌ مُخْلِصٌ نَشِیْطٌ اَبْلَغُ اَثَرًا مِنْ مَرْکَزٍ ضَخْمٍ فِیْهِ عَدَدٌ کَبِیْرٌ مِنَ الْمُوَظَّفِیْنَ اَوِ الدُّعَاةِ۔۔۔" (۴۳ساجد)۔

● "فَاِنَّ الْمَسَاجِدَ کَانَتْ وَلَا تَزَالُ رُوْحَ الْجَمَاعَاتِ الْاِسْلَامِیَّةِ وَقُطْبَهَا وَحِصْنَهَا وَمَرْکَزَهَا الدِّیْنِیَّ وَالسِّیَاسِیَّ وَالْاِجْتِمَاعِیَّ، بِحَیْثُ تَسْتَطِیْعُ اَنْ تَقُوْلَ: لَا جَمَاعَةَ اِسْلَامِیَّةٌ بِلَا مَسْجِدٍ۔ اَوْ بِتَعْبِیْرٍ اَدَقَّ، لَا بَقَاءَ لِجَمَاعَةٍ اِسْلَامِیَّةٍ بِلَا مَسْجِدٍ۔" (ساجد ۴۵)۔

● "وَالْقُرٰی هِیَ اَحَقُّ بِاَنْ یُّقِیْمَ فِیْهَا کِبَارُ الْاَئِمَّةِ وَالْخُطَبَاءِ، وَلَاشَكَّ اَنَّ اَهْلَ قَرْیَةٍ صَغِیْرَةٍ اَحَقُّ بِالْاِمَامِ الْکَبِیْرِ الْوَاسِعِ الْعِلْمِ الْقَادِرِ عَلَی الْقِیَادَةِ وَالتَّوْجِیْهِ مِنْ مَسَاجِدِ الْمَدِیْنَةِ الْکَبِیْرِ حَیْثُ الْعِلْمُ وَافِرٌ وَالْعُلَمَاءُ کَثِیْرُوْنَ وَالْحَاجَةُ اِلَی التَّوْعِیَةِ وَالتَّوْجِیْهِ اَقَلُّ" (ساجد ۳۴۵)۔

● "فِیْ اَوَّلِ اِنْشَائِهَا کَانَتِ الْمَسَاجِدُ اَمَاکِنَ لِلصَّلٰوةِ وَمَعَاهِدَ لِلتَّعْلِیْمِ وَالتَّعَلُّمِ وَمَرَاکِزَ اِجْتِمَاعِیَّةٍ وَاِنْسَانِیَّةٍ لِلْجَمَاعَةِ وَدُوْرًا لِلْقَضَاءِ" (ساجد ۳۵۹)۔

خلاصہ: ● جان رکھئے کہ مساجد فی نفسہا اسلامی دعوت کے مراکز ہیں، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان شہروں میں زیادہ سے زیادہ اسلامی دعوت کے خاطر مساجد بنائیں جہاں وہ ان مراکز کے طالب ہوں، اس میں امام کا ایک حجرہ بھی رکھیں وہ امام اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں مخلص وباثر ہو۔ اس امام کا قیام ائمہ کے انتظامی امور کے لیے قائم شدہ ادارے کی جانب سے ہو۔

● "اللہ اکبر" مساجد مختلف اسلامی جماعتوں کی روح وجان ہیں بل کہ ان کے حق میں مدار وقلعہ ہیں، اور سمجھئے کہ ان کے حق میں دینی، سیاسی اور سماجی ایسا مرکز ہے کہ اس کے بغیر نہ

اسلامی جماعت ہوسکتی ہے نہ اس مسجد کے بغیر اسلامی جماعت کا وجود ممکن ہے۔

● دیہات میں بھی بڑے ائمہ وخطباء طے ہونے چاہئیں۔ رہا بڑے شہروں کا مسئلہ تو چوں کہ وہاں علمی فضا پہلے سے ہے اور وہاں تو علماء پہلے سے موجود ہیں جس کی وجہ سے وہاں ترتیبی ضرورت کم رہتی ہے البتہ وہاں سے چھوٹے دیہات کے لیے قوم کی قیادت کر سکنے والے ماہر وجان کار امام ضرور طے ہونا چاہیے۔

● مساجد اپنے دور آغاز میں کیا تھیں؟ وہ نمازوں اور تعلیم وتعلم کا ٹھکانہ تھیں، اور اتنا ہی نہیں بل کہ وہ سماجی جملہ مسائل کے لیے بھی اور انسانی ہر قسم کی جماعتوں کے لیے بھی مراکز تھیں، حتی کہ انسانی تنازعات کے لیے دار القضا (کورٹ) بھی وہ ہی تھیں۔ یہ تھی مساجد کی حقیقت اور اس کے کردار۔

☜ **تَنَبُّه:** جیسا کہ سطور بالا سے معلوم ہوا کہ مساجد ماضی میں اسلام ومسلمانوں کے حق میں حفاظتی مضبوط حصون قلعہ تھیں جن سے مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت ہوتی تھی۔

بے شک وہ محافظ قلعہ تھیں لیکن سوچیے آج خود ان قلعوں کا اور قلعوں کے اندر کا حال کیا ہے!!!

یہی نا کہ خود قلعہ اور قلعے والے بے دینی کی لپیٹ سے محفوظ نہیں۔ قلعوں میں کیا ہو رہا ہے وہ قلعے والے ہی جانتے ہیں، تب ہی تو آج اغیار کی جسارتیں بڑھ گئی ہیں۔ نیز وہ مساجد مختلف افراد: مفسرین، محدثین، مفتیان، ماہرین زبان مبلغین اسلام اور حکمران تک تیار کرتی تھیں، تو آج کیوں نہیں؟ غور وتدبر کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ''نظام مساجد اور منصب امامت'' خیر القرون کے نہج سے ہٹ چکے ہیں۔ تو اب کتاب ہذا کی اہمیت واضح ہو چکی اللہ تعالیٰ اسے اپنے اہداف میں کامیابی نصیب فرمائیں۔ آمین۔ یہ تھی مساجد کی حقیقت اور اس کے کردار۔

اسلامی پیغام واسلامی مشن

تھوڑے فاصلے پر مذکورہ اسلامی مشن کا خلاصہ یہ کہ اولاً کسی مسلمان کا ازخود اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت ووحدانیت، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت اور آپ کی ختم نبوت کو دل وجان سے ماننے اور تسلیم کرنے کے بعد پوری زندگی کے ہر شعبہ میں ایسی اطاعت وفرمابرداری بجالانا جس کی وجہ سے قرآن وسنت کی زبان میں واقعتہً اسے مسلمان کہا جائے پھر اسی پیغام کو دنیا کے تمام انسانوں تک اس طرح پہنچانا کہ ”بذریعہ توحید وعبادت“ مخلوق اپنے خالق سے جڑ جائے۔۔۔اور ”بذریعہ ادائے حقوق“ مخلوق مخلوق سے جڑ جائے۔۔۔اور ”بذریعہ اقامت حدود“ اسلامی معاشرہ بڑے جرائم سے پاک ہو جائے۔۔۔اور ”بذریعہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ اسلامی معاشرہ ایمانی تازگی حاصل کر کے چھوٹی بڑی ہر برائی سے محفوظ ہو جائے۔۔۔اور غیر اقوام میں اس پیغام کو بلا اکراہ پھیلا کر سب کو خدائی رحمت کے سائے میں شامل کیا جائے۔۔۔اور اس پیغام کے پہنچانے میں جو رکاوٹیں پیش آئیں ان کو ”بذریعہ جہاد“ دور کیا جائے۔

چاہے وہ رکاوٹیں خارجی ہوں جیسے کفار ومشرکین کی جانب سے یا داخلی ہوں جیسے مسلمان باغیوں کی جانب سے تاکہ ایک طرف خدائی پیغام کی اشاعت بھی ہو اور دوسری طرف دارالاسلام کے امن وامان کی حفاظت بھی۔

یہی وجہ ہے کہ مشن عطا کرنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مکۃ المکرمہ میں جب مساجد کی بنیاد نہ ڈال سکے تو ہجرت مدینہ کے مراحل سے گزر کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے مدینہ منورہ تشریف لاکر مسجد کی بنیاد ڈالی۔

کیا آپ نے اسلامی مشن کو بغور ملاحظہ فرمایا؟ شاید آپ کو اس میں قرآن وحدیث

کا۔۔۔شریعت وطریقت کا۔۔۔حقوق العباد وحقوق اللہ کا۔۔۔اخلاق وکردار اور امن وامان کا۔۔۔وجود اسلام اور اس کے ترقی کا۔۔۔تبلیغ فی المسلمین اور اشاعت فی غیر المسلمین کا نچوڑ ان حقیر سطروں میں ضرور نظر آیا ہوگا۔

اگر اعتراف ہے تو پھر اب جدید حوصلے، گرم سرخ گردش کرنے والے خون کے ساتھ آپ اس مشن کو زندہ کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں، اور ایسے کھڑے ہو جائیں کہ اب اپنی مسجد سے لے کر کم از کم اپنے اضلاع تک کی مساجد میں اس مشن کو زندہ فرمائیں اور جب تک زندہ نہ ہو تھکتے رہیں۔ صاحب مشن ﷺ نے امت کے لیے اپنے کو اتنا تھکایا تھا کہ خود رحمن ورحیم نے رحم فرما کر تسلی کا سامان فرمایا۔

کیا میرا اور آپ سب کا حق نہیں بنتا کہ اب ہم اس کے لیے تھکیں اور کھڑے ہی رہیں، کیا ہم نہیں جانتے ہمارے لیے اسوہ کون ہے؟۔۔۔اور وہ کیسا ہے؟۔۔۔اور ہے تو کیوں ہے؟۔۔۔اور اسوہ کس کو کہتے ہیں؟ پھر ہمیں قرآن وحدیث نے وارث ابنیاء کا لقب نہیں دیا؟ ۔۔۔آپ کہیں گے کیوں نہیں (بلیٰ) تو پھر جو کام اسوہ سے مفہوم ہوا اور جو میراث مورث ﷺ نے ہم وارثوں کو دی چاہیے کہ اسے گلے کا ہار بنائیں۔ آیئے یاد کرا دیتے ہیں کہ یہ اسلامی مشن تھا اسلام پیغام تھا اور مساجد اس کا پلیٹ فارم تھیں اور اب بھی ہیں۔ اسلام کی جامعیت اور آفاقیت کے تذکرے کی مناسبت سے مختصراً اُس کے دو فریضے کی وضاحت مناسب ہے جو درج ذیل ہیں۔

امت اسلامی جامعیت کے دو فریضوں تلے دبی ہوئی

اسلام کی جامعیت وآفاقیت کے ناتے ہر ایک کے دو وظیفے اور دو فریضے ہیں۔

(۱) پہلا فریضہ مسلمانوں میں دینی وتبلیغی جدوجہد اور ان میں احیاء سنت وشریعت کی

کوشش۔ اس لیے کہ آں حضرت ﷺ خاتم النبیین بنا کر مبعوث فرمائے گئے ہیں "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِّجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَّسُوْلَ اللهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ وَكَانَ اللهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا" (سورۃ الاحزاب ۴۰)، محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں (کے سلسلہ) کو ختم کرنے والے ہیں۔

دراصل انبیاء سابقین علیہم السلام اور ہمارے نبی ﷺ کی بعثت میں یہ بھی ایک فرق ہے کہ جب انبیاء مبعوث ہوتے تھے تو ان کے بعد قوم میں جو خرابیاں پھیلتی تھیں ان کی اصلاح بعد کے انبیاء علیہم السلام فرما لیتے تھے لیکن اب ہمارے نبی ﷺ کے بعد کوئی نبی پیدا ہونے والا نہیں جو خرابیوں کی اصلاح کرے اور گمراہیوں کو دور کرے۔

لہٰذا اب یہ ذمہ داری پوری امت پر ہے۔ ارشاد خداوندی ہے "كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" اور "وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" (آل عمران ۱۰۴، ۱۱۰)۔

بخاری شریف اور مسلم شریف میں ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "بنی اسرائیل کی سیاست اور انتظام (کا کام) خود انبیاء کے ہاتھ میں تھا، جب ایک نبی کی وفات ہو جاتی تو دوسرا نبی اس کے قائم مقام ہو جاتا، اور میرے بعد کوئی نبی آنے (پیدا ہونے) والا نہیں البتہ میرے خلفاء ہوں گے جو بہت ہوں گے"۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں اس حدیث نے یہ بھی واضح کر دیا کہ آں حضرت ﷺ چوں کہ خاتم النبیین ہیں آپ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا تو پھر امت کی ہدایت کا انتظام کیسے ہوگا؟ تو فرمایا کہ امت کی تعلیم وہدایت کا انتظام آپ کے خلفاء کے ذریعہ ہوگا جو رسول اللہ ﷺ کے

خلیفہ ہونے کی حیثیت سے مقاصد نبوت کو پورا کریں گے (معارف القرآن ۷/۱۶۶)۔

تو اب اس کی ذمہ داری نہ صرف علماء کی ہے بل کہ اپنی طاقت کے بقدر امت کے ہر فرد کی بھی ہے کہ وہ بھی تبلیغ دین کی اور اصلاح دین کی کوشش کرے۔

(۲) دوسرا فریضہ : غیروں میں دینی اشاعت کی جدوجہد۔ کیوں کہ

● اللہ تعالیٰ رب العالمین ہیں۔ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ''

● حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔ ''وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ''

● اللہ تعالیٰ رب الناس ہیں۔ '' قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ''

● حضور صلی اللہ علیہ وسلم کافۃ للناس۔ کے نبی ہیں ''وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ''

● قرآن ھدی للناس ہے۔ '' اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ''

ان میں عالمین اور ناس کا ذکر ہے نہ کہ مومنین و مسلمین کا، مطلب اللہ تعالیٰ تمام کے رب ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب ہی کے نبی ہیں، تو اب تمام انسانوں تک دین کی اشاعت و تبلیغ مسلمانوں پر لازم ہوئی۔ گویا یہ دین مسلمانوں کے پاس غیر اقوام کی امانت ہے جن تک پہنچانے کی ذمہ داری اہل اسلام کی ہے۔ لیکن اہل اسلام خود ضعف ایمان کی وجہ سے تجدید دین اور احیاء اسلام کے سخت محتاج ہیں کیوں کہ نہ ان کے عقائد مستحکم نہ ارکان اسلام محفوظ، لہٰذا وہ بھی تواصی بالحق اور تواصی بالصبر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعہ اپنے عقائد کے استحکام کے اور ادائیگی ارکان اسلام کے اور دین و ایمان کی بقاء و حفاظت کے مکلف ٹھہرے۔

خلاصہ یہ کہ اب اگر یہ دونوں محنتیں کسی مقام پر ٹھہر جائیں اور اہل اسلام اس فریضہ میں کوتاہی برتیں تو نہ صرف غیر اقوام اس نعمت عظمی سے محروم رہیں گے بل کہ خود اہل اسلام کے

قدم بھی لغزش کھا جائیں گے۔العیاذ باللہ۔معلوم ہوا یہ دونوں محنتیں اپنی جگہ ضروری ہیں اور دونوں اتنی اہم ہیں کہ کوئی بھی فرد امت اس سے مستثنیٰ نہیں،البتہ اس تبلیغ میں افراد امت میں ان کے مقام کے ناتے درجات ضرور ہیں جن میں ائمہ حضرات پر یہ ذمہ داری بنسبت اوروں کے زیادہ عائد ہے۔اس لیے ائمہ حضرات سے ہماری درخواست ہے کہ وہ نمازوں کو پڑھانے کے ساتھ دوسری ذمہ داریوں کو سمجھیں اور انہیں نبھانے کی کوشش کریں۔

مسلمان جماعت اور مخصوص پیغام

دور حاضر کے مسلمانوں کے احوال پر اگر کوئی صاحب قلم لکھنا چاہے تو کتابوں کا ڈھیر لگادے۔مختصر یہ کہ امت ساری رسومات میں کھوگئی۔۔۔جاہلیت کی طرف پلٹ گئی۔۔۔دین وایمان کا احساس مٹادیا۔۔۔عقیدہ واعمال کے شعور تک سے محروم ہوگئی۔۔۔مسلم جماتیں اور اسلامی معاشرے شکوک وشبہات کے شکار ہوگئے۔۔۔دینی استخفاف و بے وقعتی اور اسلامی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔۔۔اور معاشرہ ذہنی و عملی ارتداد میں جاگرا۔۔۔اور غیر اقوام کی اسلامی تہذیب کے ساتھ تمسخر واستہزاء کی جسارتیں بڑھ گئیں۔۔۔اور اسلامی پوری بنیادیں متزلزل ہوگئیں۔

سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد ہے ’’تم زمین کے نمک ہو، جب نمک ہی سے نمکینیت ختم ہوجائے تو پھر کھانا کیسے نمکین بنایا جاسکتا ہے!‘‘۔غرض کہ تمام انسانی بلند جذبات صرف کتابوں۔۔۔رسالوں۔۔۔کتابچوں۔۔۔اخباروں۔۔۔اور پوسٹروں میں نقوش بنے دھرے کے دھرے رہ گئے جن سے شخصی واجتماعی زندگیاں یکسر خالی ہیں۔

اسی طرح کے احوال پر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ کے زبان پر دل

سوزی کے یہ جملے امنڈ آئے تھے" جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی دیواریں پے در پے گر رہی ہیں، اوراس کی بنیادیں بکھرتی جارہی ہیں، اے لوگو آؤ جو گر گیا ہے اسے مضبوط کردیں اور جو ڈھے گیا ہے اس کو درست کردیں یہ چیز ایک سے پوری نہیں ہونے کی سب ہی کو مل کر کرنا چاہیے، اے سورج، اے چاند، اے دن تم سب آؤ (فیوض یزدانی۔ملفوظات ۴۹۸)۔

جب کہ مسلمان جماعت، وہ جماعت ہے جو پروردگار عالم کی جانب سے دنیا کی ساری قوموں اور جماعتوں کے لیے مخصوص پیغام لے کر مبعوث ہوئی ہے۔علماء۔۔۔وائمہ۔۔۔قراء۔۔۔وحفاظ۔۔۔،عوام۔۔۔وخواص اور قوم کے سربراہ۔۔۔اور چھوٹے بڑے عہدے کا ذمہ دار۔۔۔اور قوم کا ہر فرد اپنے اپنے بس کا مکلف ہے کہ جتنا وہ دین جانتا ہے اس پر عمل کرتے ہوئے اس کی دوسروں میں تبلیغ واشاعت کرے۔خصوصا ائمہ کرام کیوں کہ وہ ایک اہم دینی منصب پر فائز ہیں ان کا صرف یہی کام نہیں کہ وہ صرف نمازوں کی امامت کرلیں۔

علماء اور ائمہ حضرات جس طرح وصف علم وعمل میں عوام سے ممتاز ہیں اس طرح وہ نظر وفکر کے اوصاف میں بھی ان سے ممتاز ہیں۔بل کہ ان کی خاص ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں میں دینی ماحول قائم کریں،لوگوں کا مزاج دینی مزاج بنائیں اور لوگوں میں دینی صلاحیت اجاگر کریں۔

چناں چہ صاحب تحفۃ الائمہ حضرت مولانا محمد حنیف عبدالمجید صاحب دامت برکاتہم رقم طراز ہیں کہ حضرت مولانا ابن الحسن عباسی مدظلہ العالی (استاذ حدیث جامعہ فاروقیہ) فرماتے ہیں: مسجد کا امام، مسجد سے تعلق رکھنے والے عام لوگوں اور اہل محلہ کا دینی پیشوا اور مربی ہوتا ہے اس کی ذمہ داریوں میں صرف نماز پڑھانا نہیں، بل کہ متعلقہ لوگوں کی دینی تربیت بھی داخل ہے۔وہ اگر اپنی ذمہ داری محسوس کرکے اخلاص اور مکمل منصوبہ بندی اور ایک جامع نظام تربیت کے ساتھ اہل محلہ کی دینی تربیت کا کام شروع کردے تو اس کی محنت سے سارے محلہ میں دینی انقلاب آسکتا ہے اور لوگوں کی زندگیاں بدل سکتی ہیں (تحفۃ الائمہ ۱۹۹)۔خیر القرون میں مسجدوں

میں باقاعدہ ایسے نظام قائم تھے۔

چناں چہ گجرات کے ابھی ماضی قریب کے جید مفتی، حضرت مفتی احمد بن ابراہیم بیمات رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔ حضرت نے علامات قیامت پر مشتمل احادیث مبارکہ کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ قرب قیامت میں امت مساجد کے بابرکت نظام سے محروم ہوجائے گی، وجہ محرومی علم کے اٹھ جانے کو قرار دیا ہے۔ [1]

حضرت فرماتے ہیں کہ علم کے اٹھ جانے سے مسجد کا بابرکت نظام بھی اٹھ جائے گا۔ پھر فرمایا کہ ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اوپر پڑھ چکے، کہ مساجد رنگ روغن، بہترین صفوں، پھولوں، میناروں اور عمدہ ٹاوروں سے آباد ہوں گی، مگر ہدایت سے ویران ہوں گی، موجودہ دور سے ہم گذر رہے ہیں کہ تعلیم وتبلیغ اور اتباع سنت سے مساجد ویران ہیں۔

مسجد بنانے کا مقصد یہ ہے کہ پانچوں وقت کی نمازیں باجماعت ادا کی جائیں اور نماز کی صحت کے لیے قرآنی تعلیم اور ضروری مسائل سکھے جائیں، فرض نمازوں کے لیے مؤذن اور امام متعین کیے جائیں، ایسے جو شرعی معیار کے مطابق ہوں لیکن آج کے مؤذن وامام کا حال یہ ہے۔۔۔(علامات قیامت ۹۱) اس میں حضرت نے یہی شکایت کی ہے کہ لوگوں کو اس کا بھی علم نہیں رہا کہ مساجد کا قیام کیوں ہے؟

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ ”امام کی قیادت صرف نماز تک محدود ہو کر رہ گئی، اور ساری ذمہ داری متولی اور ٹرسٹی کی ہوگئی جو دین سے خالی اور احکام شریعت سے ناواقف ہوتے ہیں، ان کا ادب واحترام صرف زبان تک محدود، اور دین کے خدام، متولی اور ٹرسٹیوں کے احسان کے تحت دبے رہتے ہیں (۱۰۲ علامات قیامت)۔ اس میں بھی حضرت نے یہی رونا رویا ہے کہ نہ مقتدیوں کو

---

[1] آپ نے اگر مقدمہ کتاب پڑھا ہوا اور یاد ہو تو اس کی تصدیق آپ کو یہاں نظر آرہی ہوگی۔ ہم نے لکھا ہے کہ تالیف کا مقصد کلی علمی کوتاہی کی نشاندہی کرنا ہے کہ آج لوگوں کے علم میں یہ بھی نہ رہا کہ مسجدوں میں اس قسم کا بھی کوئی نظام ماضی میں تھا اور منصب امامت پر بہت ساری ذمہ داریاں عائد تھیں۔

اپنے حال کا علم ہے نہ امام کو اپنے مقام اور ذمے داریوں کا علم ہے۔ آپ اب تک مساجد کے مختلف نظام کو مختصراً ملاحظہ فرما چکے ہیں لیکن ان میں دو نظام بطور خاص قابل ذکر ہیں ملاحظہ ہو۔

نظامِ وحدت واتحاد

حضرت مولانا ظفیر الدین رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ اگر مسجدوں کے نظام پر غور کریں گے تو اس میں بطور خاص دو چیزیں ضرور پائیں گے۔ ایک امام کی لازمی اتباع، دوسری قوم کی شیرازہ بندی اور اس کا اتحاد۔

کیسا اتحاد؟ ایسا کہ محلہ، قریہ اور شہر کے لوگوں کو اپنی اپنی مسجدوں میں شب وروز میں پانچ مرتبہ ایک امام کے پیچھے اس طرح جوڑ دیا جس طرح تسبیح کے دانوں کو ایک دھاگے میں جمع کردیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ سب مل کر شیطان رجیم کا مقابلہ کریں اور اپنے معبود برحق کی اس خیال سے عبادت کریں کہ وہ اپنے معبود کو دیکھ رہے ہیں یا کم از کم اس خیال سے کہ ان کا معبود تو ان کو ضرور دیکھ رہا ہے۔[1]

اس اجتماعی نظام سے بڑھ کر اور کوئی نظام ممکن ہے؟ کسی مذہب میں اس کی کوئی نظیر ہے؟ دنیوی حکومتیں اتحاد ومساوات قائم کرنے کے لیے پانی کی طرح روپے بہا رہی ہیں، لیکن کیا پولیٹکل کوئی نظام اسلامی اس نظام کے گرد بھی پہنچ سکتا ہے؟

---

[1] نماز کی کیفیت میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی جو بات حدیث میں بیان ہوئی ہے اس سے اعتقادی دیکھنا مراد ہے، ظاہری بینائی سے دیکھنا مراد نہیں۔ مطلب آدمی پورے طور پر دھیان سے اس طرح نماز پڑھے کہ گویا وہ اپنی اعتقادی بینائی اور باطنی بصیرت سے خدا کو دیکھ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم تمام مسلمانوں کو اپنی دلی کدورتوں کو دور کر کے ایک جسم بن کر رہنے کی توفیق عطا فرمائیں، اور اس عظیم المرتبت نعمت کی قدردانی نصیب فرمائیں۔ اس نظام میں مزید اتحاد کو ملاحظہ فرمائیں۔

نظام اتحاد میں تدریجی ترقی

ہفتے کے بعد جب مخصوص دن آپہنچے تو اب پورے شہر کے لوگ نہا دھو کر اور عمدہ خوشبو سے معطر ہو کر بغیر کسی اشتہار کے ایک مسجد میں جمع ہو جائیں، وہ مسجد سینکڑوں ایمانی شمعوں سے بھر جائے، بغض وحسد، عداوت وکینہ کا جنازہ نکل جائے، اذان ثانی دی جائے، امام خطبہ دے جس سے اللہ تعالیٰ کی خشیت اور مولیٰ سے امید کی ملی جلی کیفیت سے لوگوں کے دل لرز جائیں۔

آپ نے غور کیا یہ کون دن تھا؟ اور کون سی مسجد؟ یہ جمعہ کا مبارک دن تھا اور شہر کی جامع مسجد۔ ”یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ“ (جمعہ ۹) لیکن سال میں دو دن ذرا اور امتیازی شان کے آتے ہیں۔ ان دنوں میں فرزندانِ توحید کے قلوب وفورِ مسرت سے سرشار، لباس عمدہ، کھانے پینے کا خاص اہتمام، جوان بچے اور بوڑھے سب ہی تکبیر کہتے ہوئے ایک ہی سمت روانہ ہیں، تھوڑی ہی دیر میں ایک وسیع میدان میں ایک عظیم الشان اجتماع ہو جاتا ہے، لاکھوں پیشانیاں خدائے واحد کی پرستاری میں خاک آلود ہو جاتی ہیں۔

آپ نے سمجھا یہ اجتماع کیسا ہے؟ یہ بھی ایک مسجد ہی کا ابر کرم تھا جو ہر خطہ ارض پر برستا ہے جسے ہم عید گاہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

عالم اسلام کی یکجائی

اب ضرورت صرف اس کی رہ گئی تھی کہ کوئی ایسی بھی مسجد ہوتی جو ساری دنیا کے خدا کے پرستاروں کو یکجا کر دیتی اور یہ نظام عالمگیر ہونے کا دعویٰ کرتا۔ الحمد اللہ اللہ تعالیٰ نے اس کمی کو بھی پورا کر دیا۔ ان دو مخصوص دنوں میں ایک ایسا دن بھی ہر سال آتا ہے۔ یہ ذی الحجہ کے مہینے اور سنت ابراہیمی علیہ السلام کی یاد تازہ کرنے کا دن ہے۔ جس دن پوری دنیا سے مسلمان دور دراز کی مسافت طے کرتے ہوئے ایک ہی لباس ایک ہیئت میں ایک ہی صدا "لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ الخ" بلند کرتے ہوئے ایک ہی جگہ جمع ہوتے ہیں، حرم محترم کی اس طرح قدر کرتے ہوئے کہ شکار کرنے کی جرأت نہ اس کے گھاس کاٹنے کی مجال نہ بدن کی جوں مارنے کی ہمت۔

آپ نے غور کیا یہ اجتماع کہا ہوتا ہے؟ اور یہ کس ابر کا کرم ہوتا ہے؟ یہ بھی ایک مسجد ہی کا فیض و کرم ہے جس کا نام مسجد حرام ہے، جسے بیت اللہ اور خانہ کعبہ بھی کہتے ہیں۔ "وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَاَمْنًا" (بقرہ ۱۲۱)۔ اس اجتماعی نظام سے بڑھ کر کوئی اور نظام ممکن بھی ہے؟ اس نظام کی خوبی یہ ہے کہ اس سے اہل اسلام کی دنیا بھی بنے گی اور دین بھی سنورے گا۔۔۔

اتحاد و اتفاق کی ناقابل تسخیر قوت بھی پیدا ہوگی۔۔۔ عروج و ترقی کا جذبہ بھی لوگوں میں ابھرے گا۔۔۔ مرکزیت و اجتماعیت کی جڑیں مضبوط ہو کر سیاسی قوت کی راہیں پیدا ہوں گی۔۔۔ دوسری طرف یہ بھی اس کی خوبی ہے کہ ایک امام کی پیروی اس نظام کی روح ہے۔ لشکر و فوج کو اپنے امیر و کمانڈر کی اتباع کی تعلیم دی جاتی ہے، دنیا اس شعبہ پر اپنی ساری پونجی اور صلاحیت صرف کرتی ہے لیکن اسے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔

ادھر دیکھئے کہ نظام مسجد میں امام کی پیروی کا حال یہ ہے کہ دس سال کی عمر سے لے کر

موت تک اس کی مشق کرائی جاتی ہے کہ اہل اسلام اپنے امیر وامام کی اتباع بغیر کسی جھجک کیسے کریں اور کمال یہ ہے کہ کسی دن ناغہ ہونے کا نام نہیں۔

نظام طاعت ووحدت

اس نظام کی تفصیل یہ ہے کہ مساجد میں دو چیزیں اہم ہیں ایک جماعت کی نماز اور دوسری جماعت میں ایک امام کی لازمی اتباع اور پیروی۔

(۱) اپنے امام کی لازمی اتباع : اسلام نے مقتدی پر اپنے امام کی اتباع کو اس قدر لازم کیا ہے کہ ایک لحہ کے لیے اتباع سے انحراف کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ یہ اتباع صرف سال میں اور ہفتہ میں ایک دو بار نہیں بل کہ روزانہ ضروری قرار دیا اور وہ بھی پانچ بار جس میں ایک وقت کی بھی معافی نہیں۔ اور حیرت یہ ہے کہ وہ مقتدی یہ اتباع از بلوغ تا موت اختیار کرتا ہے۔

(۲) قوم کی شیرازہ بندی اور اس کا اتحاد: اسلام نے جماعت کی نماز کو مشروع کر کے قوم کی اعلیٰ درجہ کی شیرازہ بندی کا نظم فرمایا اور مزید اسبوعیہ جمعہ اور پھر ترقی کر کے سنویہ عیدین کو بھی مشروع فرما کر کوئی رخنہ نہیں چھوڑا تا کہ نا قابل تسخیر قوت اجتماعیت اور قوت اتحاد حاصل ہو۔

قابل توجہ اور قابل غور امر یہ ہے کہ کیا یہ اتباع اور یہ وحدت واتحاد حد نماز تک کے لیے ہے۔ نہیں اور ہرگز نہیں بل کہ اس لیے ہے کہ خارج نماز بھی یہ اتباع اور اتحاد باقی رہے۔ نماز و جماعت دی ہی اس لیے ہے کہ زندگی میں عبدیت واطاعت پیدا ہو اور بے پناہ وحدت واتحاد پیدا ہو۔ خیر القرون کا نظام مسجد اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیر تیں شاہد ہیں کہ وہ اپنے امام ''آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم، کی اس قدر اتباع واطاعت کرتے تھے کہ خارج نماز بھی بال کے برابر انحراف

نہیں کرتے تھے اور آپس کا اتحاد اس قدر مضبوط تھا کہ انصار ومہاجرین کے درمیان مواخات ضرب المثل ہے۔ ہم اپنے مقتدیوں کو ایک لمحہ اس نظر سے دیکھیں کہ بے نمازی کو چھوڑ کر پابند نماز شخص میں اطاعت ''خدا اور سول'' واتباع کتنی پیدا ہوئی جب کہ سالہا سال سے نمازی ہے۔

مذکورہ صورت حال کے ہوتے ہوئے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ مسجد کے نظام اور منصب امامت سے مقصد ہمہ جہتی معاشرہ کی اصلاح کرنا ہے۔ اگر اس وقت بھی مساجد کے ائمہ حضرات اپنے منصب امامت کو اصلاح کا پلیٹ فارم بنائیں تو اس طرح کی اصلاح سے نہ صرف اصلاح کا کام زیادہ ہوگا۔۔۔اور سہولت سے ہوگا۔۔۔اور جلد بھی۔۔۔

بل کہ ان ہی کے ائمہ ہونے کی وجہ سے ''وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ'' ان کا حق بھی ہوگا اور ذمہ بعتق بھی۔ اور ان ہی میں رہنے سہنے سے وہ اصلاحی جہتوں سے اچھی طرح واقف بھی ہوں گے۔ جس سے اصلاح صحیح بھی ہوگی۔ اور حقیقی اور واقعہ بھی جیسے کہ مثل مشہور ہے'' صَاحِبُ الْبَيْتِ أَدْرىٰ بِمَا فِيْهِ''۔

حیرت ہے کہ غیر علماء ''تبلیغی احباب'' بلا منصب۔ ماشاء اللہ وجزاہم اللہ۔ اصلاح میں نمایاں کردار ادا کریں! اور ائمہ حضرات اپنے اتنے بڑے منصب ''امامت'' کے باوجود اصلاح امت اور اصلاح معاشرہ میں کوئی خاص کرتب نہ دکھائیں۔

خلیفہ کی پالیسی کا اعلان منبروں سے

عہد رسالت اور عہد صحابہؓ کی تاریخ دیکھئے کہ اس وقت اس نظام کو کس قدر قبولیت حاصل تھی، جس سے وہ کتنے کامیاب وبامراد تھے۔ خلاف راشدہ تک بہت ساری باتیں انہی مساجد کے ذریعہ طے پاتی تھیں۔

- خلیفہ کی پالیسی کا اعلان ان کے منبروں سے ہوتا تھا۔
- گورنروں کے فرائض میں امامت بھی داخل تھی۔
- جمعہ وعیدین کی امامت بھی یہی لوگ کرتے تھے۔
- جہادی سرگرمیوں کی تعلیم بھی مسجدوں میں دی جاتی تھی۔
- اشاعت اسلام اور تبلیغ دین کے قافلے یہی سے اٹھتے تھے۔
- تعلیم وتعلّم کے وفود کی آمدورفت بھی مسجد میں ہوتی تھی۔

خلفائے راشدین نے برابر امامت کی بل کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے تو اسی منصب کی ادائیگی میں جام شہادت نوش فرمایا۔ اپنے تو اپنے غیروں نے بھی ہمارے خلفائے راشدین کے اس منصب/نظام کو بنسبت اسلامی دیگر منصبوں/نظاموں پر ترجیح دی ہے، اور اسے سراہا ہے۔

کیا یہ واقعہ نہیں کہ مسجد کے منبر کو دستوری حکومت کے تخت کی حیثیت حاصل تھی، جہاں سے جمہوری حکومت کی پالیسی کا اعلان ہوتا تھا (اسلام کا نظام مساجد۔ ۳۲)۔

حضرت مولانا ظفیر الدین رحمہ اللہ تعالیٰ کی مذکورہ کتاب کے ۳۰ صفحات کا خلاصہ ہم نے صرف ۳ یا ۴ صفحات میں پیش کیا ہے اس کتاب کو ائمہ حضرات ضرور پڑھیں۔ گذشتہ بحثوں (مساجد۔۔۔اسلامی مشن۔۔۔نظامِ وحدت۔۔۔منبروں سے اعلان) کو پیش کرنے کا مقصد اس بات کو سمجھانا ہے کہ صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کے مسجد کے نظام کو قائم کر کے ائمہ مساجد کو نمازوں کی جماعتوں کے ساتھ اس نظام کے سارے تقاضوں کو پورا کرنے پر آمادہ فرمایا ہے۔

دنیوی امور کی راہ نمائی بھی مساجد سے

احادیث مبارکہ اور سیرت طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے منصب امامت پر سے اپنی امت کی جس طرح مسجد سے دینی امور کی طرف راہ نمائی فرمائی ہے جو منصب نبوت کا اصل منشا ہے، اس طرح منصب نبوت سے ہٹ کر منصب امامت پر سے مسجد میں دنیوی امور کی طرف بھی حسب ضرورت راہ نمائی فرمائی ہے۔ کیوں کہ اسلام میں چاہے روزمرہ کے کام (عادتیں) ہوں کہ خالص دنیوی امور حسن نیت اور حسن طریقہ سے وہ بھی کسی درجہ میں شعبۂ دین بن جاتے ہیں۔

آپ ﷺ امت کو اس قدر تہذیب سے آراستہ کرنے پر متوجہ اور فکر مند تھے کہ مشرکین اور اہل کتاب کو بھی سخت حیرت تھی! حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے بعض مشرکین نے بطور مزاق کہا کہ عجیب بات ہے کہ تم کو تمہارے نبی ﷺ طریقہ استنجاء بھی سکھاتے ہیں! تو میں نے کہا ہاں۔۔۔(مشکوٰۃ ۴۴)۔ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ کے پاس ڈھال تھی جس کو (بطور حجاب زمین پر) رکھا اور پھر اس کی طرف رخ فرما کر آپ نے بیٹھ کر پیشاب فرمایا تو اہل کتاب کے ایک شخص نے کہا دیکھو یہ (نبی ﷺ) عورتوں کی طرح بیٹھ کر پیشاب کرتے ہیں (مشکوٰۃ ۴۴)۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ غیروں کو بھی سخت تعجب تھا۔

ہم ذیل میں دنیوی امور پر امت کے حق میں آپ ﷺ کی توجہ مبذول کرانے کی چند مثالیں سیرت طیبہ سے پیش کرتے ہیں، جن سے ہمیں یہ درس عبرت حاصل کرنا چاہیے کہ جب آپ ﷺ نے منصب امامت پر سے ''دنیوی'' فوائد پر بھی توجہ مبذول کرائی ہے تو ہم

ائمہ کو ''دینی'' امور کی طرف توجہ دلانے کا کس قدر اہتمام کرنا چاہیے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی طویل روایت ہے ہم مختصراً پیش کرتے ہیں۔ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سوال کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تمہارے گھر میں کچھ ہے؟ تو اس نے کہا ایک چادر ہے اور ایک پیالہ ہے آپ نے ان کو منگا کر دو درہم میں بیچ کر سائل سے کہا یہ ایک درہم کا کھانے کا سامان خرید کر گھر والوں کو دیدو اور ایک درہم سے کلہاڑی خرید کر میرے پاس لے آؤ۔ وہ شخص کلہاڑی لے کر آیا تو آپ نے اس میں لکڑی لگا کر فرمایا اس سے لکڑیاں کاٹ کاٹ کر بیچتے رہو اور پندرہ روز کے بعد مجھے ملو، وہ شخص دس درہم کما کر لایا جن سے کچھ کپڑے اور غلہ خریدا۔ تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ صورت حال بہتر ہے بنسبت پہلی صورت کے کہ جس میں تم لوگوں سے سوال کرتے جس کی وجہ سے تم قیامت کے دن اس حالت میں آتے کے تمہارے چہرے پر سوال کا اور رسوائی کا نشان ہو (مشکوۃ ۱۶۳)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں کو جو کاہل وست بن کر بیٹھے رہتے، نہ دین کا کام کرتے نہ دنیا کا اور مسجد میں ڈیرہ لگا لیتے یوں کہہ کر ڈانٹتے ''اُخْرُجُوْا وَاطْلُبُوْا الرِّزْقَ فَإِنَّ السَّمَاءَ لَا تُمْطِرُ ذَهَبًا وَلَا فِضَّةً'' (بیٹھے مت رہو) جاؤ روزی حاصل کرو (کیوں کہ بغیر کوشش کے) تمہارے لیے آسمان سے سونا اور چاندی اتارے نہیں جائیں گے (لا تحزن ۲۵۳)۔

روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم محبت سے پوچھتے اس کا پیشہ کیا ہے؟ جب لوگ کہتے کچھ نہیں ہے تو وہ شخص میری نگاہ سے گر جاتا ''هَلْ لَهُ حِرْفَةٌ... فَإِنْ قَالُوْا لَا قَالَ سَقَطَ مِنْ عَيْنِيْ''

(الجامع لاخلاق الراوی ۱/۹۸)۔

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسلمان اپنے اہل وعیال پر کچھ خرچ کرتا ہے اور اس میں ثواب کی توقع رکھتا ہے تو یہ خرچ اس کے حق میں (مقبول) صدقہ ہو جاتا ہے (مشکوۃ ۱۷۰)۔ آپ نے پہلے واقعہ میں پڑھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک

غریب اور نادار شخص کو کمائی پر لگا کر دنیوی ترقی پر ڈالا۔ اور دوسری روایت سے معلوم ہوا کہ بیوی بچوں کو کھلانا بھی ایک باعث اجر وثواب عمل ہے حالاں کہ تمام دنیا والوں کے نزدیک شوہر پر بیوی بچوں کا پالنا ضروری ہے جس میں ثواب کا کوئی تصور نہیں۔

(۱) روایت میں بیت الخلاء میں داخل ہونے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کو کہا گیا ہے اور اس کا فائدہ یہ بیان کیا ہے کہ جن (وشیاطین) تمہارے ستر کو دیکھنے نہیں پائیں گے (مشکوۃ ۴۳)۔

روایت میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص کسی (جانور کے) سوراخ میں پیشاب نہ کرے (مشکوۃ ۴۳)۔

(۲) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل خانہ میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا کہ پھر وہیں نہائے یا وضو کرے کیوں کہ اس سے اکثر وسوسے پیدا ہوتے ہیں (مشکوۃ ۴۳)۔

(۳) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام راستوں پر اور درختوں وغیرہ کے سایوں میں بول و براز کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ کیوں کہ لوگوں کی راحت میں خلل ڈالنے سے لوگ ایسے شخص پر لعنت کریں گے (مشکوۃ ۴۳)۔

(۴) اسی طرح دھوپ سے گرم شدہ پانی سے غسل کرنے سے منع فرمایا کیوں کہ اس سے برص کی بیماری پیدا ہونے کا خطرہ ہے (مشکوۃ ۵۲)۔

آپ نے ان مختلف روایتوں کو ملاحظہ فرمایا جن سے معلوم ہو رہا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو دنیوی نقصانات سے بچنے کی تدبیریں بتائیں۔ مثلاً: جن وشیاطین کے اثرات سے، برص سے اور لوگوں کی لعن طعن اور گالیوں وغیرہ سے۔ اس طرح کی اور بھی روایتیں موجود ہیں لیکن ہم نے اختصار سے کام لیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ آں حضرت ﷺ نے لوگوں کی نہ صرف دینی فکر فرمائی ہے بل کہ دنیوی فوائد کے حصول اوران کی مضرتوں سے حفاظت کی بھی فکر فرمائی ہے۔جب آپ ﷺ کا یہ حال ہے تو آپ کے نائبین علماء(ائمہ) کو بھی چاہیے کہ وہ نمازوں کے علاوہ نمازیوں کی دین کے تمام شعبوں میں فکر رکھیں۔اوران کو منکرات ومعاصی سے بچانے اورمعروفات پر کھڑا کرنے کی فکر کریں۔

حتی کہ آپ ائمہ مریضوں اور پریشان حال لوگوں کا سہارا بنیں۔کیوں کہ مختلف امراض پر صبر اور پریشانیوں کے سہنے کے فضائل پر مستقل احادیث وارد ہیں۔لہٰذا وہ سنائیں ہم ان کو بیان کرنے سے معذور ہیں آپ دوسری کتابوں سے معلوم کر کے آپ مسلمانوں کی پریشانیوں میں ہاتھ بٹائیں،ان کوان فضائل کے ذریعہ خدا سے قریب کریں،ان میں حسن ظن پیدا کریں۔بہت سے لوگ بچارے مایوسی اور لاچاری میں زندگی کاٹتے ہیں،بندہ کواس کا بارہا تجربہ ہوا ہے ہم چوں کہ اس سے بھی اہم چیز کو بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں اس لیے وہ آپ کے معلوم کرنے پر چھوڑ دیتے ہیں۔

جن وشیاطین سے بچنے کی تدابیر

مذکورہ پریشان حال لوگوں میں کچھ ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کے بارے میں معاشرہ میں یہ مشہور ہوجاتا ہے کہ فلاں مرد یا فلاں عورت کو جن کا اثر ہے یا اس پر کسی نے جادو کرر کھا ہے یا بھوت پریت کا اثر ہے یہ شہرت کسی عامل کے بتانے پر ہی ہوتی ہے۔لہٰذا ائمہ حضرات خود بھی اور ایسے پائے جانے والے مریضوں کو بھی بہادر بنائیں۔جس کا راستہ یہ ہے کہ اندر کے ایمان ویقین کو مضبوط بنائیں۔

اوراس کے لیے حضرت جی مولانا محمد یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ جامع ملفوظ سنائیں

حضرت فرماتے تھے کہ مخلوقات سے ڈرنا ایسا ہی ہے جیسا مشرکین مکہ کا اپنے (پتھر کے) بتوں سے۔ ایٹم سے ڈرنا ایسا ہے جیسا مشرکین کا اپنے بتوں سے، ایٹم اور ایٹم والوں کی گردنیں اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں ان سے وہ ہوگا جو اللہ چاہے گا۔ اور یہ بتائیں کہ جن وشیاطین اور جادو یہ سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، ان سے بھی وہی ہوگا جو اللہ چاہے گا۔ پہلے اللہ تعالیٰ کا یقین بٹھائیں اور اللہ سے ڈرنا سکھائیں کیوں کہ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اس سے ساری مخلوق ڈرتی ہے حدیث شریف میں ہے ''مَنْ هَابَ اللهَ هَابَهُ كُلُّ شَيْءٍ'' ۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سماوی وارضی کسی مخلوق سے بھی نہیں ڈرے، چاہے جنگل کے درندے ہوں کہ سانپ وبچھو اور موذی جانور۔ عقبہ بن نافع رحمہ اللہ تعالیٰ فتح افریقہ کے موقع پر کہنے لگے'' اے سانپو اور درندو ہم رسول اللہ ﷺ کے اصحاب ہیں سو تم یہاں سے چلے جاؤ اس کو ہمارے رہنے کے لیے خالی کر جاؤ اگر اس کے بعد ہم کسی کو پائیں گے تو اسے قتل کر دیں گے'' أَيَّتُهَا الْحَيَّاتُ وَالسِّبَاعُ إِنَّا أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ اِرْحَلُوْا عَنَّا فَإِنَّا نَازِلُوْنَ وَمَنْ وَّجَدْنَاهُ بَعْدَ ذٰلِكَ قَتَلْنَاهُ'' (الکامل لابن الاثیر ۲/۳۰۷ ولایۃ عقبۃ بن نافع)۔ چناں چہ سارے جانور چل دیے اس کو دیکھ کر دشمن قوم ''قوم بربر'' کے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس خلیفہ متوکل کی طرف سے ایک آدمی آیا اور کہنے لگا کہ امیر المومنین کے گھر میں ایک لڑکی پر جن کا اثر ہے میں علاج ودعا کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکڑی کے بنے جوتے دیئے اور فرمایا اس لڑکی کے سرہانے بیٹھ کر جن سے کہنا ''يَقُوْلُ لَكَ أَحْمَدُ أَيُّمَا أَحَبُّ إِلَيْكَ تَخْرُجُ مِنْ هٰذِهِ الْجَارِيَةِ أَوْ أَصْفَعُ الْآخَرَ بِهٰذِهِ النَّعْلِ... '' ''تجھے احمد کہتا ہے دو چیزوں میں سے ایک

چیز پسند کر یا تو اس لڑکی سے نکل جا اور پریشان کرنا چھوڑ ورنہ جوتے کھانے کے لیے تیار ہو جا'' چناں چہ اس آدمی نے ایسا ہی کیا تو جن اس لڑکی کی زبان میں کہنے لگا ''اَلسَّمْعَ وَالطَّاعَةَ'' کہ میں احمد کی بات مانتا ہوں اگر وہ ہمیں حکم دیں کہ اس پورے جزیرہ عراق سے نکل جاؤ تو ہم عراق سے بھی نکل جائیں گے کیوں کہ احمدؒ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے اور اس سے ڈرتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور اس کی اطاعت کرے تو پھر ہر چیز اس کی اطاعت کرتی ہے اور اس سے ڈرتی ہے (ھکذا فی تحفۃ الائمۃ ص۱۳۶ از طبقات الحنابلۃ ۱/۲۳۳)۔

لہٰذا ائمہ حضرات ان کو چند کام بتائیں: (۱) توبہ و استغفار کرائیں۔ (۲) اللہ تبارک و تعالیٰ کا یقین دلوں میں جمائیں۔ جس کی علامت یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے تمام اوامر کو اچھی طرح بجالائیں۔ (۳) صدقہ کی ترغیب دیں۔ (۴) ذہن سے جن کا وہم نکالنے کی خوب کوشش کریں اور ذیل کے وظیفے معانی کے استحضار کے ساتھ پڑھا کریں۔

۱۔ معوذتین ۲۔ سورۃ بقرۃ ۳۔ پانچ سو مرتبہ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ ۴۔ پانچ سو مرتبہ ''حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل'' ۵۔ پانچ سو مرتبہ ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ۔ ۶۔ یہ دُعا بھی پڑھا کرے اَعُوْذُ بِوَجْهِ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ الَّذِيْ لَيْسَ شَيْءٌ اَعْظَمُ مِنْهُ وَبِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِيْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ وَبِاَسْمَاءِ اللّٰهِ الْحُسْنٰى مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ اَعْلَمْ وَمِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذَرَأَ وَبَرَأَ۔ (مشکوٰۃ ۲۱۸)۔ یہ بہت اہم دعاء ہے حضرت کعب احبار یہودی تھے وہ مسلمان ہو گئے تو فرماتے ہیں اگر میں ان کلمات کو نہ پڑھتا تو یہود دشمنی سے مجھے گدھا بنا دیتے۔ ۷۔ پھر دعا مانگے۔

ان علاجوں سے ایک اہم فائدہ یہ حاصل ہوگا کہ خود میں اللہ تعالیٰ کی ذات کا یقین پیدا ہوگا اور اللہ

تعالیٰ سے مانگنے والا بنے گا جو شریعت کا مقصود ہے جس کے نتیجہ میں پریشانی سے خلاصی بھی حاصل ہوگی ان شاء اللہ۔

صاحب تحفۃ الائمۃ دامت برکاتہم فرماتے ہیں: آج آدمی کو نہ فرائض کا اہتمام نہ حرام سے اجتناب بل کہ نہ خدا پر یقین جب کوئی پریشانی آتی ہے تو کسی عامل کی تلاش وجستجو میں لگ جاتا ہے۔ خدا نماز روزہ کرنے کو کہے، جھوٹ حرام کمائی سے روکے تو کوئی توجہ نہیں لیکن عامل جو کہے وہ سب کچھ ماننے پر تیار۔ اور اگر تعویذ دھاگے سے بھی کام نہ بنے تو پھر پیر ولی کی تلاش ان کی اپنے گھر دعوت بھی کرے گا۔ اپنی سواری بھی پیش کرے گا یہ سب رشوتیں جتا کر کہے گا۔ حضرت ایک پریشانی ہے اب حضرت نے کچھ وظیفہ دیا کہ اتنے ہزار اتنی دفعہ اس کو پڑھ لیا کرو۔

آپ اہل علم ہیں کیا اس طرح پڑھ لینے سے مسئلہ کا حل نکل آئے گا جب کہ حرام کی کمائی پیٹ میں جارہی ہے، بیوی کو تنگ کر رکھا ہے، پڑوسی لوگ اس کی شرارت سے غیر محفوظ ہیں، والدین ناراض ہیں، نمازیں ادا نہیں کرتا ان سب سے بڑھ کر دلوں کا رخ خالق سے ہٹ کر مخلوق کی طرف ہے، کبھی ایمان ویقین کی بات بھی کانوں میں نہیں پڑتی۔ اب بتائیں ان وظیفوں سے کیسے مسئلہ حل ہوگا؟۔ لہٰذا ان مقتدیوں پر رحم کھائیں ان کو دین وایمان پر کھڑا کریں ان شاء اللہ سارے مسئلے حل ہو کر رہ جائیں گے۔

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ مدینہ منورہ کے اہل علم نہ صرف دینی امور میں مرجع تھے بل کہ دنیوی امور میں بھی مرجع تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اصحاب شوریٰ کے علاوہ ہر طبقہ کے علماء وقراء کو اپنی مجلس میں بلا کر اہم امور میں مشورہ لیتے تھے۔

صحابہ کرام کے بعد اہل علم خلافت وامارت کے امور ومعاملات میں حکم وفیصل تھے اور امراء عمال ان سے ہر بات میں مشورہ لیتے تھے۔ حضور ﷺ کے عمال وامراء ''معاذؓ، عثمانؓ، ابوزیدؓ، خالدؓ، علیؓ، ابوعبیدہؓ'' وغیرہ اپنے اپنے مقام کے معلم وامام تھے اور مسلمانوں کے جملہ امور ان کے سپرد تھے۔ (خیر القرون کی درسگاہیں ۲۴۹، ۱۲)۔ لہٰذا آپ کو بھی اقامت جماعت وجمعہ کے ساتھ مسلمانوں کے جملہ امور کی فکر کرنی چاہیے۔

زبانی جملوں کی اصلاح بھی

آں حضرت ﷺ کی اصلاحی توجہ پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی امت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اصلاح اس حد تک فرمائی ہے کہ عام بول چال اور زبانی غلط جملوں کا پوسٹ مارٹم (اصلاح) بھی کیا ہے اور اصطلاح شرع کی حفاظت بھی کرائی ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ گنوار لوگ تمہارے (نماز) مغرب کے نام پر غالب نہ آجائیں جس کو وہ لوگ (قبل اسلام) عشا (اول) کہتے (نام رکھتے) تھے، اور وہ لوگ تمہارے (نماز) عشا کے نام پر غالب نہ آجائیں جس کو کتاب اللہ (قرآن شریف) میں عشا کہا گیا ہے (مشکوٰۃ ۶۲)۔ یعنی زمانۂ جاہلیت میں یا ابتداء اسلام میں لوگ مغرب کی نماز کو عشاء اول اور عشا کو عتمہ کہتے تھے تو آں حضرت ﷺ نے جاہلیتی اس اثر کے باقی رہنے کو بھی ناپسند فرمایا اور ہدایت دیدی کہ تم لوگ اس طرح نام نہ لینا بلکہ مغرب اور عشا نام لینا۔

اس طرح کی اصلاح خود قرآن کریم کی راہ نمائی سے بھی معلوم ہوتی ہے جس کو ائمہ جانتے ہیں مثلاً قرآن کا ارشاد ہے ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا

" (بقرہ ۱۰۴)۔اے ایمان والو راعنا (ہماری رعایت کیجئے) نہ کہو (بل کہ) انظرنا کہو اور برابر سنا کرو۔آیت کا شان نزول آپ دیکھ لیں۔ یہاں صرف اتنی بات عرض ہے کہ لفظ "راعنا" کہنے کی ممانعت ہے اور لفظ "انظرنا" کہنے کی ہدایت ہے۔کیوں کہ راعنا سے اہل کتاب راعینا بول کر دوسرا معنیٰ (اے ہمارے چرواہے) مراد لیتے تھے۔

حدیث بالا کی تدریس میں راقم نے طلبہ کو دو مثالیں بتلائی تھیں وہ پیش کرتا ہوں تا کہ ائمہ کی توجہ اس طرح کے عوامی جملوں کی طرف ہو تو ان کی اصلاح کی جا سکے۔ ہمارے یہاں گجرات سورت راندیر ہی میں غیر مسلم طبقہ کا ایک بڑا محلہ ہے جس کا نام "ہنومان" ٹیکری ہے ،جس میں چند مسلمانوں کے مکانات بھی ہیں۔تبلیغی حضرات وہاں ایک گھر میں ہفتہ کا گشت اور نماز با جماعت ادا کر کے دینی بات کرتے ہیں، جب کارگزاری وغیرہ میں اس محلہ کا نام لیتے ہیں تو "نعمان" ٹیکری کہتے ہیں۔بندے نے جب سنا تو بڑی حیرت ہوئی کہ عوام ہیں لیکن کس قدر اصلاح کی فکر ہے سبحان اللہ کیسی دور اندیشی ہے۔

دوسری مثال، راقم نے کئی حضرات کو بازاروں میں جب استنجاء کی ضرورت ہوتی ہے تو ایک دوسرے کو یہ کہتے ہوئے سنا اور ان کو متنبہ کیا کہ "میں مسجد میں پیشاب سے فارغ ہو کر آتا ہوں" اگر چہ مراد مسجد کے احاطہ کے پیشاب خانوں میں پیشاب کرنا ہوتا ہے،لیکن ظاہری جملہ قابل اصلاح ہے۔

ایک مرتبہ سورت کے تبلیغی مرکز رانی تلاؤ مسجد کے ہفتہ واری اجتماع میں راقم شریک تھا، مرکز حضرت نظام الدین دہلی سے حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب دیولوی دامت برکاتہم تشریف لائے تھے جب بیان و تشکیل اور دعا ختم ہوئے تو ایک ساتھی نے کہا "بھائی مولانا کے

جانے کے لیے راستہ کرو"، تو حضرت مولانا نے کھڑے کھڑے اصلاح فرمائی کہ "مسجد میں راستہ نہیں ہوتا یوں کہو دائیں بائیں ہو جاؤ"۔ یعنی بازاروں کی طرح مسجد کو راستہ نہیں بنایا جاتا۔

☜ **تَنبُّه:** اس راہ نمائی کے تحت ذکر کردہ بحثوں سے اندازہ کیجیے کہ امت کس کس جہت سے اصلاح کی محتاج ہے۔ احساس ضرورت کے بعد آپ پوری فکر کے ساتھ مقتدیوں کی اصلاح فرمائیں۔ اور اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ "ہفتے میں دو بار" کسی ایک نماز کے بعد آپ کھڑے ہو کر اس کی اچھی تمہیدی گفتگو کے بعد حکمت ونرمی اور ترغیب ومثبت انداز سے ایک ایک چیز سوچ سمجھ کر پیش کریں اور منکرات سے بچا کر معروفات پر کھڑا کریں۔ کام کا طریقہ حصہ دوم میں مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ خوب آسان فرمائیں۔ آمین

يَارَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا   عَلَى حَبِيبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ



فصل دوم: منصب امامت، اس کے اہداف و کردار

امامت تمام منصبوں سے بالاتر

دین اسلام میں جتنی عبادتیں ہیں ان میں سب سے افضل عبادت نماز ہے۔ نماز تمام اعمالِ اسلامیہ کا معجون مرکب ہے۔ جس میں تمام عبادتوں کی کچھ نہ کچھ جھلک ضرور ہے۔ نماز وہ عبادت ہے جسے عطا کرنے کے لیے اللہ جل شانہ نے اپنے بندے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں اپنے پاس بلایا، اور اس کی باقاعدہ تعلیم کے لیے سید الملائکہ حضرت جبرئیل امین کو نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، انہوں نے باقاعدہ امامت کے ذریعہ نماز کی پوری تعلیم دی۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تادم حیات اس منصب کو سنبھالا اور دنیا سے رخصت ہونے کے وقت منصب امامت کے لیے ایک ایسی جامع شخصیت کا انتخاب فرمایا جو نہ صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بل کہ انبیاء ورسل علیہم السلام کے بعد تمام انسانوں میں افضل ہے یعنی صدیق اکبرؓ۔ تمام خلفائے راشدین نے خلافت کے فرائض کے ساتھ امامت کے منصب کو بھی سنبھالا بل کہ ان کے دور میں جو بھی گورنر بنایا گیا اس نے بھی اس کے ساتھ منصب امامت کو ضرور سنبھالا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ منصب امامت ایک عظیم منصب ہے۔

لہٰذا ائمہ حضرات کو اپنے اس عالی منصب سے واقف ہو کر اس کے تقاضوں کو بکمالہ پورے کرنے چاہئیں اور انہیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ دین کے خادم ہیں اور یہ تصور کبھی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ایک تنخواہ دار ملازم ہیں۔ (مسائل امامت سے بحث ان شاء اللہ جزء ثالث یا رابع میں ہوگی)۔

منصب امامت تقسیم کی زد میں

منصب امامت کی عظمت کا ستارہ مسلمانوں کی سنہری تاریخ میں ایک طویل عرصے تک چمکتا رہا، لیکن زمانہ خیر القرون کے بعد جب سیاست، حکومت، تعلیم، تذکیہ، تبلیغ، افتاء، قضاء اور امامت وغیرہ کے سارے شعبے تقسیم کی زد میں آ گئے تو امامت کی عظمت کا ستارہ بے نور ہو کر رہ گیا اور وہ منصب صرف اقامت جماعت میں سمٹ کر محدود ہو کر رہ گیا۔

پھر وہ ایک زمانہ تک شعبہ حکومت کے تابع ہو کر اس کے ماتحت محسوب ہونے لگا (جیسا دور حاضر میں مملکت سعودیہ وغیرہ کے یہاں ہے) یا تو وہ غیر اسلامی سلطنتوں میں معاشروں اور اس کے نمائندگان کے حوالے ہو گیا (جیسا دور حاضر میں ملک ہندوغیرہ میں ہے) بہر حال منصب امامت کو اب بھی دوبارہ اس پر لوٹانے کی فکر و کوشش ضرور کرنی چاہیے، پچھلی صدیوں میں اس کی فکر و کوشش چھوٹ جانے سے نہ تو اس کی ضرورت ختم ہوتی ہے نہ تو اس کا انکار مناسب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی تمنا فرما رہے ہیں کہ منصب امامت کو ''زمانہ خیر القرون کے نہج منصب امامت'' پر لایا جائے جیسا کہ گذشتہ اوراق میں آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے۔

اس کتاب کی یہی سعادت مندی ہے کہ اس کے ذریعہ اس کی کوشش کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ شرف قبولیت سے نوازے، حقیقت میں اصلاح حال ''امت و معاشرہ'' میں بڑی ہی خیر کا ذریعہ ہوگی۔ ان شاء اللہ۔ مزید تفصیل منصب امامت اور احساس کہتری میں ملاحظہ ہو صفحہ ۸۴ پر۔

منصب امامت منصب خلافت بھی ہے

ہم کیا جانیں کہ منصب امامت کتنا عظیم منصب ہے! اسلام کے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے اور جو زمانہ خیر القرون میں اس منصب پر فائز رہا ان سے پوچھئے وہ اس کی عظمت اور اس کی شان وشوکت بتائیں گے، بل کہ اس کے بعد کے محدثین عظام اور مصنفین رحمہم اللہ تعالیٰ بھی بتائیں گے۔ یہ رہے علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ جنہوں نے منصب امامت کی عظمت پر قلم توڑ دیا اور یہ فرما کر ائمہ مساجد اور مابعد والوں کو حیرت میں ڈال دیا کہ ”منصب امامت پر فائز ہونا درحقیقت منصب خلاف پر فائز ہونا ہے کیوں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں نیابت ہے“

قَالَ الطِّيْبِيُّ طَابَ اللهُ ثَرَاهُ: وَالْإِمَامُ خَلِيْفَةُ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ“ (مرقات شرح مشکوۃ ۲/۱۶۵)۔

اللہ اکبر کتنا عظیم منصب ہے!! اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی قدر کرنے کی توفیق نصیب فرمائیں۔ ہمارے گجرات کے جید مفتی، حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی تقریباً یہی بات ارشاد فرمائی ہے، فرمایا! ”اسلام میں منصب امامت کی بڑی ہی اہمیت ہے، یہ مصلیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مصلیٰ ہے، اور امام نائب رسول ہوتا ہے۔ صاحب مرقات رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے“ اَلْإِمَامُ خَلِيْفَةُ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ وَالْمُؤَذِّنُ خَلِيْفَةُ بِلَالٍ' (مرقات ۲/۱۶۶)۔

امامت من وجہ خلافت سے بھی افضل ہے

غور تو کیجئے کیا منصب امامت کی عظمت کی کوئی حد ونہایت بھی ہے!!! اوپر کہا تھا کہ منصب امامت منصب خلافت بھی ہے، یہاں مدعیٰ ہے کہ وہ من وجہ خلافت سے بھی افضل ہے، اور یہ دعویٰ محض نہیں یہ دعوی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک زریں قول کی روشنی میں کیا جارہا ہے (جن کا قول بلا تامل حجت ہے وہ حدیث ہے وہ خبر ہے وہ اثر ہے) جو انہوں نے حضرت

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی تعیین پر اس وقت ارشاد فرمایا تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نماز میں امامت کرنے کا حکم فرمایا تھا : ''رَضِيَهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِدِيْنِنَا أَفَلَا نَرْضَاهُ لِدُنْيَانَا'' (مرقات ۹۶/۳)۔ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ کو ہمارے دین (کی پیشوائی یعنی نماز کی امامت) کے لیے پسند فرمایا تو کیا ہم انہیں اپنی دنیا (کی پیشوائی یعنی خلافت) کے لیے پسند نہ کریں۔ صحابہ کرامؓ کے اس جملہ (جس میں اعلیٰ منصب سے ادنی پر استدلال کیا ہے) سے معلوم ہوا کہ بعض وجوہ سے امامت صلوٰۃ کا منصب امارت وخلافت کے منصب سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ [1]

اس میں صاف اشارہ ہے آپ ائمہ حضرات کی ذمے داریوں کی طرف، کیوں کہ آپ خلیفہ اور امیر کا مطلب بخوبی جانتے ہیں، اس کا مطلب صرف یہ نہیں کہ وہ اس منصب ومسند پر جلوہ افروز ہوکر صرف نام کمالے اور لوگوں کا تفریحاً نظارہ کرتا رہے، بس اس طرح امام کا مطلب بھی صرف یہ نہیں کہ نمازیں پڑھا کر فارغ ہوجائے اور پانچ بار صرف مصلے پر حاضری دے لے۔

امام صرف نمازوں میں ہی ضامن ہے

اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو بوجہ خاتم نبوت ''جوامع الکلم'' عطا ہوئے ہیں لیکن انہیں چھوڑ کر بھی آپ کی زبان مبارک کا ہر جملہ اور جملے کا ہر کلمہ اور کلمے کا ہر ہر لفظ بھی جامعیت ومعنویت کا ترجمان ہے جس میں فصاحت وبلاغت اور علوم ومعارف کے دریا بہتے نظر آتے ہیں کیوں کہ یہ بھی وحی خفی اور وحی غیر متلو ہے'' وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ''۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء شریعت رحمہم اللہ تعالیٰ حدیث مبارکہ کے ایک ہی لفظ پر مختلف مفاہیم ومعانی کا کرتب دکھاتے ہیں۔ آپ کو حیرت ہوگی بعض علماء کے اس قول سے جسے صاحب

---

[1] اور اس جہت سے بھی امامت افضل ہے کہ وہ صرف دینی نیابت ہے، جب کہ خلافت صرف دینی نیابت نہیں بل کہ دینی و دنیوی نیابت ہے

مرقات رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک حدیث شریف ''اُنزِلَ القران عَلیٰ سبعۃِ احرفٍ لِکُلِّ ایۃٍ مِنْھَا ظھرٌ وبطنٌ۔۔۔(مشکوٰۃ ۳۵) کے تحت نقل کیا ہے،

قال بعض العلماء : لِکُلِّ ایۃٍ سِتُّونَ اَلفَ فَھْمٍ۔ حتی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''لَوْ شِئْتُ اَنْ اُوَقِّرَ سَبْعِیْنَ بَعِیْرًا مِنْ تَفْسِیْرِ الْقُرْآنِ لَفَعَلْتُ '' (مرقات ۱/۲۹۶) نقل کا مقصد یہ بتانا ہے کہ الفاظ نصوص بہت سے معانی کے محتمل ہوتے ہیں۔ نیز شراح حدیث نے ایک مطلب یہ بھی تو بیان کیا ہے کہ امام مقتدیوں اور ان کے رب کے درمیان دعامیں سفارتی کام انجام دے رہا ہے'' وَیَتَعَھَّدُ لِلسَّفَارَۃِ بَیْنَھُمْ وَبَیْنَ رَبِّھِمْ فِی الدُّعَا '' (مرقات ۲/۱۶۶) دعا کا عام اطلاق عرفاً خارج نماز پر ہوتا ہے۔

مذکورہ تمہیدی روشنی میں جامع مذاہب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو حل کیجیے اور پرکھیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا ہے'' اَلاِمَامُ ضَامِنٌ وَالْمُؤَذِّنُ مُؤْتَمَنٌ '' (مشکوٰۃ ۶۵)۔ اس کا ایک مفہوم یہ لیا جائے کہ امام اپنے مقتدیوں کی نماز کا ہی ضامن ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ لیا جائے کہ امام اپنے مقتدیوں کی نماز کا بطور خاص۔۔۔ اور نمازوں کے علاوہ ان کی دینی تعلیم وتربیت کا بھی بطور عام۔۔۔ ضامن وذمے دار ہے تو اس دوسرے مطلب میں جامعیت ومعنویت زیادہ بھی ہوگی اور واضح بھی اور مقصود کے لیے مفید بھی۔ اور یہ مطلب پہلے مطلب کے معارض بھی نہ ہوگا کیوں کہ اس کی نفی نہیں ہے، اور نہ یہ مفہوم، محدثین واسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ مفہوم سے معارض ہوگا کیوں کہ ان کے زمانے میں تو امام واقعۃً بھی مقتدیوں کی دینی تعلیم وتربیت کا ضامن ''عملاً'' ہوتا ہی تھا۔

اس پوری وکالت کا مقصد ائمہ حضرات کو یہ بتانا ہے کہ وہ نمازیوں کی خارج نماز بھی تعلیم وتربیت کے ذمہ دار ہیں لہٰذا ان کو چاہیے کہ وہ اس کی فکر کریں اور ان کی ہر لحاظ سے اصلاح

کی فکر دکوشش کریں وہ اس کو نماز کی طرح اپنی ذمہ داری سمجھیں اور خدارا اس کو بجالائیں۔(مزید ملاحظہ ہو اگر شکوہ ہے مصروفیات کا تو)۔

فقیہ عصر علوم اسلامیہ کے ترجمان حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم نے ائمہ مساجد وعلماء کے اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا [۱]: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا الامام ضامن کہ امام ضامن ہے، اب لوگوں نے اس حدیث کو نماز تک محدود کردیا کہ امام کی نماز درست ہونے پر باقی مقتدی کی نماز درست ہوجاتی ہے، یہ بات درست ہے، مگر ہم رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان میں یہ بات کیوں نہ تلاش کریں کہ امام اپنے مصلیوں اور مقتدیوں کی پوری زندگی کا ضامن ہے، وہ اس بات کے بھی ضامن ہوں کہ اس کے مقتدی کسب حلال کریں، اس کی خاندانی وعائلی زندگی صحیح ہو، وہ ان کی معیشت کا بھی خیال رکھیں۔ چنانچہ آقا ﷺ نے جہاں مسلمانوں کے نماز پڑھنے کے لیے مدینہ المنورہ میں مسجد کی بنیاد رکھی، علم حاصل کرنے کے لیے صفہ کی بنیاد رکھی وہیں آپ ﷺ نے مسلمانوں کی معیشت کے سدھار کے لیے سوق المدینہ، مدینہ مارکیٹ بھی بنوایا تھا، پھر آپ اس مارکیٹ کا انسپیکشن (معاینہ) بھی فرماتے تھے۔

اور حضرت مولانا اسرار الحق صاحب دامت برکاتہم نے خطاب کرتے فرمایا: اسلام اور مسلم معاشرے میں امامت ایک معزز منصب رہا ہے اور اس پر فائز رہنے والے لوگوں کو عام

---

[۱] جب کوئی صدق دل سے کسی کام کو لے کر اٹھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضرور مدد فرماتے ہیں۔ حضرت نے یہ خطاب گجرات کے وسا میں کیا تھا۔ جب کہ ''تحفۃ الائمۃ فی اصلاح الامۃ'' کا مسودۂ تقاریظ کے مرحلے سے گزر رہا تھا یہ مضمون میری تائید کے لیے بہتر تھا تو اسے کتاب میں شامل کرلیا حضرت کا یہ مضمون رسالہ (اذان ہند ۹) فروری میں طبع ہوا ہے۔ اسی میں حضرت مولانا اسرار الحق صاحب قاسمی دامت برکاتہم کا بھی خطاب ہوا تھا اسے بھی شامل کیا گیا ہے

وخاص ہر طبقے میں احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ جب دنیا کے بیشتر خطوں میں سیاسی وسماجی اور تہذیبی وعلمی اعتبار سے مسلمانوں کا غلبہ تھا اور مسلم تہذیب دنیا کی مقبول ترین تہذیب تھی، اس وقت امام کا مرتبہ اس اعتبار سے غیر معمولی تھا کہ وہ نہ صرف پنج وقتہ، جمعہ وعیدین اور جنازے کی نمازوں میں مسلمانوں کے پیشوا ہوتے تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ لوگ اپنے روزمرہ کے مسائل ومشکلات کے حل کے لیے بھی انہی سے رجوع کیا کرتے تھے۔ ماضی میں دین ودنیا کے کئی اہم کارنامے انجام دینے والے بے شمار اشخاص مساجد کے منبروں سے ہی وابستہ تھے۔ اسلامی کتب خانے کا اچھا خاصا حصہ ائمہ کی علمی وفکری قابلیتوں کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ان کی اہمیت وبرتری اور فضیلت کو دراصل اللہ کے نبی ﷺ نے اپنے قول وعمل کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں بٹھایا تھا۔ ایک موقع پر اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ ''امام اس لیے بنائے گئے ہیں کہ ان کی اقتدا کی جائے''۔

اس کا ایک ظاہری مطلب یہ ہے کہ نماز کے دوران اماموں کی اقتدا کرنی چاہیے اور ان کے عمل کے مطابق عمل کیا جائے تا کہ ہماری نماز درست اور مکمل ہو سکے۔ لیکن ایک مطلب اس کا یہ بھی ہے کہ معاشرے میں امام کے منصب کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے اچھے اور اعلیٰ اخلاق وکردار کو اپنایا جائے اور اس سلسلے میں بھی انہیں اپنا راہنما بنایا جائے۔ نبی اکرم ﷺ پوری زندگی مسجد نبوی کے امام وخطیب رہے اور مسلمانوں کو دی جانے والی تمام تر تعلیمات مسجدوں کے ذریعے ہی پایۂ تکمیل کو پہنچتی تھیں۔ چاہے معاشرتی مسائل ہوں یا اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے نکلنے کی تدبیریں، چاہے تعلیم وتعلم ہو یا دیگر امور سب امام یعنی نبی پاک ﷺ کے ذریعے ہی لوگوں تک پہنچتے تھے۔

ایک گذارش ائمہ کرام سے بھی ہے کہ وہ معاشرے میں اپنے مقام ومرتبے سے باخبر رہیں، وہ صرف نمازوں کے امام نہیں ہیں بلکہ ان کے اعمال واخلاق اور کردار کا اثر دوسرے لوگوں پر بھی پڑتا ہے۔ آپ کوئی ایسا عمل نہ کریں جو آپ کی شان اور مرتبے کے خلاف ہو، صرف نماز پڑھادینا ہی آپ کی ذمے داری نہیں ہے بلکہ لوگوں کے اعمال وعقائد کی اصلاح کا ذمہ بھی شریعت نے آپ کے اوپر رکھا ہے، مسلمانوں کی اخلاقی وعملی بدکرداری کے خاتمے میں ائمہ کرام اہم کردار ادا کر سکتے ہیں اور ان سے یہ مطلوب بھی ہے۔ یہ حقیقت ہر وقت ذہن میں رہنا چاہیے کہ جو منصب یا مقام جتنا اہم اور عظیم ہوتا ہے، اس کی ذمہ داریاں بھی اسی قدر اہم ہوتی ہیں۔ جہاں آپ کے اچھے اور عمدہ اخلاق واعمال معاشرے پر اچھے اثرات مرتب کرتے ہیں، وہیں آپ کی معمولی لغزش بھی بے شمار لوگوں کے لیے فساد اور برائی کا سبب بن جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''امام ضامن ہوتا ہے''۔ مطلب یہ کہ امام نہ صرف اپنے مقتدیوں کی نمازوں کا ضامن ہے اور اس کی نماز کی صحت پر مقتدیوں کی نمازوں کی درستگی موقوف ہے،

بل کہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اپنی عملی زندگی میں بھی امام اپنے مقتدیوں کا ضامن ہے، اگر کوئی اس کے اچھے اخلاق واعمال سے متاثر ہو کر اچھے راستے کو اپناتا ہے تو اس بندے کے ساتھ امام بھی ماجور ہوگا، جب کہ اگر کوئی شخص اس کی غلط نقل وحرکت کی وجہ سے دین اور مسجد سے متنفر ہو جاتا ہے تو اس کا بھی ذمے دار وہی ہوگا۔ بہر کیف یہ بے حد ضروری ہے کہ ائمہ اور مقتدی دونوں اپنے اپنے مطلوبہ کرداروں کو ادا کریں۔ یہ عمل ہمارے معاشرتی نظام کو بہتری کی طرف لے جانے میں کلیدی رول ادا کر سکتا ہے۔ [1]

---

[1] آپ نے ان گراں قدر شخصیات کے ارشادات کو ملاحظہ فرمایا جس میں راقم کے مدعی کے لیے مضبوط تائیدات موجود ہیں جیسے کہاوت ہے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، ذلک فضل اللہ۔

فوت بعثت بوجہ فوت حق!!

آپ ذرا عنوان پر گہری توجہ فرمائیں، آپ بخوبی واقف ہیں کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جتنی ذمہ داریاں تھیں وہ ساری بوجہ ختم نبوت امت کے مختلف طبقات پر ”عَلٰی قَدْرِ مَنَازِلِهِمْ“ تقسیم فرمادیں، اس تقسیم میں جس کے حصہ میں جو ذمے داری سپرد ہوئی وہ اس کا ”عِنْدَ اللهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖ“ ذمے دار ہے، یہ تعلیم وتزکیہ، دعوت وتبلیغ، یہ امامت وخلافت سب ہی اس نبوت وبعثت کی فروعات وشاخیں ہیں۔

اب ذرا ذہن کو متوجہ فرمائیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ بعثت کی جانب کہ آپ کی بعثت کیوں ہوئی؟ اسے بتانے کی ضرورت اس لیے نہیں کہ یہ ”اَظْهَرُ مِنَ الشَّمْسِ“ ہے۔ کیا ہم یہ باور کرسکتے ہیں کہ ناصح وامین امت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات سے مقصد بعثت میں ذرہ بھر کوئی کسر چھوڑی اور کوتاہی برتی ہو۔ نعوذ باللہ من ذلك۔ ہرگز نہیں۔ یہ تو آپ نے باور کرنے کی بات تھی۔ اب اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حال خود اسی کی زبان سے ملاحظہ فرمائیں۔ حدیث شریف میں طویل واقعہ مذکور ہے مختصر عرض یہ کہ اسلامی سلطنت کے مالک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو انصار کی آبادی کے درمیان بطور جاگیر مکانات عطا فرمائے جہاں عبد بن زہرہ کے بیٹوں کے بھی مکانات یا کھجور کے درخت تھے تو عبد بن زہرہ کے بیٹوں کو پسند نہ آیا انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر کہا کہ عبداللہ بن مسعودؓ کو کسی دوسری جگہ مکانات عطا کیے جائیں انہیں ہمارے درمیان نہ رکھیں جائیں۔

تو اس کے جواب میں آپ نے جو فرمایا وہ جملہ قابل استدلال ہے آپ نے فرمایا پھر مجھے اللہ تعالیٰ نے کیوں بھیجا ہے؟ یعنی میری بعثت اسی لیے تو ہے کہ حق والے کو حق پہنچے۔ اللہ

تعالیٰ اس قوم کو پاکیزگی عطا نہیں کرتا جس میں کمزور کے حق کو تحفظ حاصل نہ ہو (مشکوۃ ۲۵۹)۔

آپ نے ملاحظہ فرما ہی لیا کہ بالفرض اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے ایک فرد کو صرف ایک حق نہ دلا سکیں تو مقصد بعثت فوت ہو جائے، کتنی بڑی ذمہ داری کی بات ہے۔ آپ سوچئے کہ منصب نبوت کو لوگوں کے دنیوی حقوق سے اس قدر تعلق ہے کہ اگر ایک حق کے تلف پر بعثت فوت ہو سکتی ہے تو کیا اتنے عظیم منصب ''نبوت'' کی نیابت ''امامت'' کا تعلق امور شرعیہ سے نہیں ہوگا، اور اس کا مقصد صرف نمازوں کی امامت ہی ہو سکتا ہے؟ عقائد و اخلاق کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کرنا مقصد سے خارج ہوگا؟ نہیں بل کہ پورے معاشرے کی اصلاحی بہت ساری ذمہ داریاں اس میں داخل ہوں گی اور ہیں، منصب امامت کے یہ اصلاحی حقوق آج پامال ہونے ہی کی وجہ سے ہزاروں کوششوں کے باوجود اصلاحی محنتوں کا خاطر خواہ کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ لہٰذا ٹھان لیجیے کہ اب ان شاء اللہ اس کام کے لیے ابھی سے اٹھنے تیار ہیں اور جب تک اصلاح کے اثرات نظر نہ آئیں دم ہی نہ لیں گے۔

ایک نظر مقتدیوں اور مسلمانوں کے احوال کی جانب بھی

مولانا محمد ہلال الدین ابراہیمی اشاعتی دامت برکاتہم فرماتے ہیں: احکام شریعت و عقائد اسلام کو بلا چون و چرا قبول کرنے والے مسلمان، احکام خداوندی پر آمنا و صدقنا کہنے والے مسلمان، آج عقائد اسلام میں قیل و قال کرتے ہیں، احکام شریعت میں نقص نکالتے ہیں،

بڑا المیہ ہے !! مسلم بچے؛ اور قرآن پڑھنا نہیں آتا! کلمے یاد نہیں، سیرت صحابہ و اکابرین معلوم نہیں، بنیادی عقائد تک سے لاعلم اور غافل ہیں۔ اب تو ایسی ایک نسل جوان ہو گئی ہے اور ایسے بچے باپ بن گئے ہیں، بچیاں ماں بن گئی ہیں، انہی کو خود کچھ نہیں آتا تو بچوں کو کیا

خاک سکھائیں گی۔

مسلم گھرانوں سے آج سے ۲۰، ۳۰ سال پہلے تلاوت قرآن کی آواز آتی تھی، اب گانے بجانے کی آواز آتی ہے، جو بچیاں بے پردہ نکلنے میں عار محسوس کرتی تھیں، آج انہیں اوڑھنی کی بھی ضرورت نہیں، پھول سے ننھے بچے اپنی توتلی زبان سے کلمہ پڑھتے تھے، آج وہ کچھ اور ہی سناتے ہیں اور والدین اس پر پھولے نہیں سماتے۔

پھر ائمہ کو ذمے داری کا احساس دلاتے فرمایا: خود کو اور خود پر عائد ذمہ داری کو جاننا اور اس کے نبھانے کی فکر کرنا اس وقت از حد ضروری ہے، کیوں کہ وارثین انبیاء ہونے کی حیثیت سے امت کی ناخدائی ہم پر ہے، اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کام نہیں چلے گا، امت میں تیزی سے سرایت کردہ شہوات وشبہات کے وائرس کی تشخیص اور اس کا تیر بہدف علاج ضروری ہے۔

لہٰذا اب مزید غفلت کی گنجائش نہیں رہی۔ رب کے حضور پیشی اور اپنی رعیت کی نگہداشت ان کی پرورش و پرداخت اور سلامتی افکار وخیالات کے متعلق سوالات کے جوابات کی تیاری کا خیال کریں اور اس کے پیچھے لگ جائیں، اپنا مشن بنالیں۔ اور مسلم معاشرے کو ایک صالح نوجوان، ایک انقلابی مسلمان دینے کی فکر میں جٹ جائیں، جو آپ کی دنیا کی پونجی اور آخرت کا سرمایہ ہوگی۔ [1]

[redacted]

حدیث شریف میں ہے " فَالْاِمَامُ الَّذِیْ عَلَی النَّاسِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ " (مشکوۃ ۳۲۰) یہ ایک طویل حدیث شریف کا ایک جز ہے یہاں کی مناسبت سے اتنا حصہ

[1] یہ اقتباس ماہنامہ شاہراہ علم اکل کوا جمادی الثانی ۱۴۳۸ھ، مارچ ۲۰۱۷ء سے اخذ کیا ہے جب کہ مسودہ تقاریظ کے مرحلے میں تھا۔

لینے پر اکتفا کیا گیا ہے۔امام لوگوں کا نگراں ہے اس سے اپنی رعیت کے بارے میں باز پرس کی جائے گی۔علمائے اسلام رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہاں امام سے ''حاکم وقت'' مراد لیا ہے کہ وہ اپنی رعیت کے حق میں دین ودنیا کی بہتری کا ذمہ دار ہے اوراس سے قیامت میں سوال ہوگا اوراس پر جزاوسزا مرتب ہوگی۔

لیکن اگر امام کو عموم پر محمول کرتے ہوئے امام صلوٰۃ بھی مراد لیا جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد جامعیت کا حامل ہوکر اس کی دلیل بنے گا اور سمندر بکوزہ کا مصداق ہوگا۔نیز دلیل عموم یہ بھی کہ امامت کی دوقسمیں ہیں جو خود حدیث شریف سے ثابت ہے کبری وصغری جس کا ذکر ابھی آگے آرہا ہے۔نیز جس طرح ایک حکمراں امام علی الناس ہے اوراس کی رعیت ہے تو اسی طرح امام صلوٰۃ بھی امام علی الناس ہے اوراس کی بھی رعیت ہے،بل کہ صاحب خانہ بھی ذمے دار ہے اوراس کی بھی رعیت ہے جیسا اسی حدیث شریف میں مذکور ہے،تو یہ مفہوم،معارضِ منطوق کسی طرح بھی نہ ہوگا تو پھر حدیث کے عموم میں امام صلوٰۃ کو مراد لینے کی پوری گنجائش ہے۔واللہ اعلم۔

خلاصہ یہ کہ مساجد کے ائمہ بھی اپنے اپنے مقتدیوں کے دینی احوال وامور کے ذمے دار ہیں اور صرف نمازوں کے احوال کے ہی نہیں بل کہ ان کے علاوہ ان کے اخلاق وکردار ان کے عقائد وعبادت سب ہی کے۔بل کہ نظر غائر کا تقاضا بھی یہی ہے، کیوں کہ جب ایک دنیوی منصب کا شخص (حکمراں وقت) لوگوں کے دینی معاملات کا نگراں اور ذمے دار ہوسکتا ہے تو دینی منصب کا شخص ''امام صلوٰۃ'' تو بطریق اولی اس کا ذمے دار ہوگا۔اس کی بھی تائید ''حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحقیق'' میں آرہی ہے۔حضرت مولانا ہلال الدین بن علیم الدین صاحب اشاعتی دامت برکاتہم نے حدیث پر سیر حاصل بحث فرمائی ہے ہم خلاصہ نقل کردیتے ہیں۔

اس حدیث شریف کو صرف امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے دسیوں مقام پر ذکر فرمایا ہے۔ یہ حدیث اس قدر عام اور کلی ہے کہ کوئی فرد اس سے خالی نہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی کی بیوی نہ ہو اور نہ ہی کوئی خادم، اسی طرح اولاد بھی نہ ہو، وہ بھی اس حدیث کا مصداق ہے، بایں معنی کہ وہ اپنے اعضاو جوارح کا نگراں ہے، یہاں تک کہ وہ فعلاً، نطقاً اور اعتقاداً مامورات کو بجالائے اور منہیات سے باز رہے۔ تو اس کے جوارح وقوی اور حواس اس کی رعیت ہیں۔ نیز کسی کا صفت راعی سے متصف ہونا اس بات کو مستلزم نہیں کہ وہ دوسرے اعتبار سے مرعی (ماتحت) نہ ہو۔

حدیث کی تشریح سے یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ ''کلکم راع'' حدیث میں ذکر کردہ جزئی کے ساتھ خاص نہیں۔ بل کہ عام ہے اور وہ جزئیات بہ طور تمثیل ہیں۔ اس حدیث کا مخاطب ہر مکلف ہے خواہ بہ ظاہر اس کے ماتحت کوئی نہ بھی ہو۔

اور بیک وقت ایک آدمی راعی اور مرعی، سرپرست اور ماتحت دونوں ہوسکتا ہے۔ نگراں اعلیٰ کے اعتبار سے وہ ماتحت ہے تو اپنے ماتحت کے اعتبار سے نگراں، لہٰذا جہاں اس پر اپنے ماتحتوں کی مکمل نگرانی لازم ہے وہیں اپنے سرپرستوں کی اطاعت بھی ضروری ہے اور حیثیتوں کے مختلف ہونے سے ذمہ داریاں بھی مختلف ہو جاتی ہیں، اس اعتبار سے غور کریں تو آج ہم پر کتنی ساری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ عمومی ذمہ داری لیں تو ایک باپ ہونے کی حیثیت سے اولاد کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری، اس کی ضروریات کا خیال، شوہر ہونے کی حیثیت سے بیوی کے حقوق کی رعایت، دینی امور میں اس کی نگہداشت، گھر کے ماحول کی مکمل نگرانی، بیٹا ہونے کی حیثیت سے اپنے ضعیف والدین کی خدمت اور حقوق کی رعایت، خود اپنے اوپر عائد واجبات کی مکمل پاسداری۔ بہ حیثیت ملازم امور مفوضہ کی بجا آوری، اس طرح کی بہت ساری

ذمہ داریاں ہیں اور خصوصی اعتبار سے حکام پر ماتحتوں کی ذمہ داری، علماء پر عوام کی، ائمہ پر مصلیان کی، اساتذہ پر طلبہ کی وغیرہ۔

دور حاضر میں اس حدیث کے مقتضا کو اچھی طرح زندہ کرنے اور ہر ایک کے سامنے لانے کی اشد ضرورت ہے؛ کیوں کہ آج مقتدا اپنے مقتدی کی ذمہ داری سے۔۔۔اور مقتدی اپنے مقتدا کی اقتدا سے۔۔۔غافل ہے، حاکم اپنے محکوم کے حقوق سے۔۔۔اور محکوم اپنے حاکم کے حقوق سے۔۔۔بے خبر اور بے پرواہ ہے، راعی اپنی رعیت کی نگہداشت سے۔۔۔اور رعیت اپنے راعی کی اہمیت ومقام سے۔۔۔نا آشنا اور غفلت کی شکار ہے، نگراں اپنے ماتحتوں کی نگرانی سے۔۔۔بے سروکار ہے اور ماتحت اپنے نگراں کی نگرانی سے۔۔۔بے نیاز۔ غرض ہر ایک اس فریضے کی ادائیگی میں کسی نہ کسی حد تک کوتاہ قاصر ہے جس کا خمیازہ ساری قوم بھگت رہی ہے۔

ائمۂ مساجد اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں

اسلام نے جو ہمیں منبر ومحراب دیا ہے، یہ آج بھی ان کی نیٹ ورکنگ میڈیا سے زیادہ مضبوط ہے بستی بستی اور قریہ قریہ منبر ومحراب قائم ہیں، ہمارا نیٹ ورک دیہاتوں، پہاڑوں، صحرا، اور ٹاپوؤں میں بھی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس نیٹ ورک کا صحیح استعمال کریں، صرف پانچ وقت کی نماز اور جمعہ کے دن بس کسی بھی موضوع پر لب کشائی کر کے ہم اپنی تنخواہ تو حلال کر سکتے ہیں، لیکن لفظ امام اور منصب امامت کے تئیں عائد اسلامی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ ہمیں فتنوں اور سازشوں سے آگاہ ہونا ہوگا اور اپنے مقتدیان ومصلیان کو بروقت آگاہ کرنا ہوگا۔ ہم معاملات ومعاشرت میں پیدا ہو رہی غیر اسلامی چیزوں سے فوری باخبر ہوں، ان کی تشخیص کریں اور لوگوں کو بتائیں۔

نوجوانوں کی تنظیمیں بنائیں، انہیں جوڑیں، سمجھائیں اور ان کے ساتھ مل کر دیگر نوجوانوں پر محنت کریں۔ نوجوانوں کے ذریعہ ہمیشہ انقلاب آیا ہے۔ [1]

ہمارے ایسے علماء وائمہ بھی گذرے ہیں جنھوں نے دین وملت کی خدمت کے لیے اپنی ہڈیوں کو گھلایا، ڈاڑھیاں سفید کرائیں اور امت کے سفینہ کی اس وقت ناخدائی کی جب حالات مخالف اسلام تھے۔ لہٰذا آپ بھی ذہن وفکر کو اسلامی تقاضوں کو سمجھنے میں مجبور کیجیے۔ کیوں کہ آپ جب تک اپنی فکری قوت کو اسلامی ڈھانچے میں نہیں ڈھالتے آپ چاہے علم وفن کے کتنے ہی بڑے شہسوار کیوں نہ ہوں آپ انفرادیت اور ذاتیات کی خول میں قید وبند ہیں اور انفرادیت کبھی اسلام میں انقلاب نہیں لاسکتی، آپ کے وجود کا مقصد امت کی اور اجتماعیت کی تشکیل ہونی چاہیے۔

اصلاح امت اور اصلاح معاشرہ کا خاص منصب

بگڑے معاشروں اور بگڑی قوموں اور جماعتوں کی اصلاح کا کلیدی منصب، منصب امامت ہے چاہے امامت کبریٰ ہو کہ صغریٰ۔ آج جو معاشرے اور قومیں بگاڑ کی سخت لپیٹ میں نظر آتے ہیں اور ہزاروں محنتوں، جلسوں، پروگراموں کے باوجود اصلاح وسدھار تو کیا بگاڑ وفساد بڑھتا نظر آرہا ہے۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اس کی وجہ پر غور کرنے کے بعد ماننا پڑے گا کہ اصلاحی کوشش چاہے کی جارہی ہے لیکن یا تو وہ <u>جزئی ہے کلی نہیں یا صحیح منصب سے نہیں</u> کی جارہی ہے کیوں کہ یہ بھی تو ناممکن ہے کہ کسی چیز کی جدوجہد کی جائے اور اس کا فائدہ حاصل نہ ہو۔

[1] شاہراہ علم اکل کوا ۱۸ ۱۴۳۴ھ جمادی الثانی حضرت مولانا ہلال الدین صاحب دامت برکاتہم۔

بات دراصل یہ ہے کہ اصلاح امت اور اصلاح معاشرہ کا صحیح اور خاص منصب ہی، منصب امامت ہے، ائمہ مساجد امت و معاشروں میں جس قدر اصلاحی انقلاب لاسکتے ہیں اتنی اصلاح شاید ہی کوئی لاسکے (سوائے تحریک ایمانی کی جدو جہد یعنی تبلیغی محنت کیوں کہ اس کا اصلاح میں مؤثر ہونا مشاہدہ میں آچکا ہے اور مشاہدہ وتجربہ کا انکار بداہت کا انکار ہے اور راقم خود اس سے وابستہ بھی ہے) کیوں کہ اسلامی ساری دینی سرگرمیوں کا مرکز و مصدر ماضی میں مساجد اور منصب امامت رہے ہیں، اور آج یہ فراموش کیا گیا کہ ماضی میں منصب امامت کا اصلاح میں کلیدی کردار رہا ہے۔

اس منصب کا اور مساجد کے منبر ومحراب کا مالک ہونا ایک ''اصلاحی'' سلطنت کا مالک ہونا ہے۔ مان لیجئے کہ وقت جماعت میں کسی مسجد میں بڑے سے بڑے شیخ الحدیث صاحب، بڑے سے بڑے مہتمم صاحب، بڑے عالم صاحب، بڑے مفتی صاحب اور قاری صاحب بھی اپنے اپنے مقام کے منصبوں کے ساتھ تشریف لائیں تو کیا از روئے شرعی استحقاق ان مقدس ہستیوں میں سے کوئی بھی آگے بڑھ کر امامت کرنے کی کوشش کرے گی؟ ہرگز نہیں، کیوں کہ اسلام نے یہ حق صرف اس مسجد کے معین امام ہی کو دیا ہے۔ '' وَلَا يُؤَمَّنَّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِي سُلْطَانِهٖ '' (مشکوۃ ۱۰۰)۔ اور یہ بھی فرض کیجئے کہ اگر اسلام امام کو اس قدر حق نہ دیتا تو کیا امام صاحب اتنے جلیل القدر مناصب کے مالک حضرات سے آگے بڑھنے کی ہمت وجسارت کرسکتے؟ ہرگز نہیں اب غور کریں کہ پھر یہ کتنا عظیم منصب ہوا۔ پھر یہ بھی کہ یہ کیوں عطا ہوا؟ تو ذمہ داریاں خود بخود سمجھ میں آجائیں گی۔

سابق منصب جلیل کی وجہ اور نقطۂ تالیف

سیرت ہادیہ میسرہ سے واضح ہوتا ہے کہ اصلاحِ مسلمین اور ملّی و مذہبی ساری ترقی کا اصل مرکز'' مساجد اور منصب امامت'' رہے ہیں۔ بقول علمائے اسلام مسجد وامامت کا مفہوم خیر القرون اور زمانۂ اسلاف میں آج کے مفہوم سے وسیع رہا ہے۔ جب منصب امامت کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ بلکہ بغیر کسی اور ٹھکانے اور تحریک کے ہمہ جہتی امت کی اصلاح وترقی صرف مسجد اور منصب امامت سے سرانجام پاتی تھی۔ لہٰذا ہمہ جہتی امت کی بتدریج اصلاح ائمہ مساجد ہی سے ہوسکتی ہے اور خوب ہوسکتی ہے!۔

(الف) اولاً: اس لیے کہ خیر القرون میں امت کی اصلاح اسی منصب سے ہوئی ہے۔

(ب) ثانیاً: اس لیے کہ عامۃ المسلمین کا بلاواسطہ پختہ ربط اور ہمہ وقت ربط جتنا ائمہ حضرات سے ہے اتنا کسی سے نہیں۔ مثلاً: یومیہ صلوات خمسہ میں۔۔۔ اسبوعیہ صلوٰۃ جمعہ میں۔۔۔، سنویہ صلوات عیدین وتراویح میں۔۔۔، اور مساجد ومکاتب کے جلسوں اور ولیمہ، عقیقہ اور جنازہ وغیرہ کی تقریبات میں مزید براں، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ تعلق از بلوغ تا موت رہتا ہے۔

(ج) ثالثاً: کثرت مساجد و کثرت ائمہ کا وجود۔ اور اس کا مضبوط نیٹ ورک۔

مذکورہ صورتِ حال کے ہوتے ہوئے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ اگر مساجد کے ائمہ حضرات ہی اپنے منصب امامت کو اصلاح کا پلیٹ فارم بنائیں تو شاید اس سے اصلاح ضرور حاصل ہو۔ اس طرح کی اصلاح سے نہ صرف اصلاحی کام زیادہ ہوگا۔۔۔ اور سہولت سے ہوگا۔۔۔ اور جلد بھی۔۔۔

بل کہ ان ہی کے ائمہ ہونے کی وجہ سے ''وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ'' ان کا حق بھی ہوگا

اور ذمہ بعتق بھی۔ اوران میں رہنے سہنے سے وہ اصلاحی جہتوں سے اچھی طرح واقف بھی ہوں گے۔ جس سے اصلاح صحیح بھی ہوگی اور حقیقی اور واقعہ بھی جیسے کہ مثل مشہور ہے ''

صَاحِبُ البَیتِ اَدریٰ بِمَا فِیْہِ''

حیرت ہے کہ غیر علماء ''تبلیغی احباب '' بلا منصب۔ ماشاء اللہ وجزاہم اللہ۔ اصلاح امت میں نمایاں کردار ادا کریں! اور ئمہ حضرات اپنے اتنے بڑے منصب ''امامت'' کے باوجود اصلاح امت اور اصلاح معاشرہ میں کوئی خاص کرتب نہ دکھائیں۔[۱]

منصب امامت اور احساس کہتری

جیسا کہ صفحہ ٦٨ پر ذکر کیا جاچکا ہے کہ زمانہ خیر القرون میں شعبہ حکومت، شعبہ امامت کے ماتحت یا کم ازکم اس کے مساوی مفہوم ہوتا تھا لیکن بعد میں اس کے برعکس امامت، شعبہ حکومت کے ماتحت مفہوم کیا جانے لگا۔ جب حکومت وسیاست، تعلیم وتزکیہ، افتاو قضاء اور تبلیغ وامامت وغیرہ سارے شعبے تقسیم کی زد میں آگیے جس کی وجہ سے اس منصب کی عظمت دلوں سے ختم ہوگئی، چناں چہ غور کے بعد منصب امامت کے تئیں جو احساس کہتری پائی جاتی ہے اس کی چند وجوہ یہ سامنے آتی ہیں۔

الف : منصب امامت حکومت کے تحت آگیا جس کی وجہ سے ائمہ کا تقرر حکومت کے حوالے ہوگیا۔

---

[۱] اسی وجہ سے کہ یہ کام صرف ائمہ سے ممکن ہے اور سارے ہی ائمہ نہ فکر مند ہوتے ہیں اور نہ سارے ہی اتنی صلاحیت رکھتے ہیں کہ کتاب پڑھ لینے سے کما حقہ طریقہ کار سمجھ سکیں دونوں مقاصد کے پیش نظر ضروری تھا کہ ائمہ مساجد کی تنظیم بنائی جائے جس سے ان کو کام کے لیے فعال بنایا جائے اور انہیں حرکت میں لاکر کام پر کھڑا کیا جائے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کے دل میں خیال ڈالنے سے بندہ نے ایک باعمل تنظیم '' تنظیم کل ائمہ مساجد گجرات'' بنانے کا نہ صرف ارادہ کیا ہے بلکہ کافی حد تک اس کی کوشش بھی کی ہے۔

ب: غیر اسلامی مملکت میں یہ منصب معاشروں اور قوم کے حوالے ہوگیا جس کی وجہ سے ائمہ کا تقرر قوم اور اس کے نمائندگان (مسجد کی کمیٹی) کے حوالے ہوگیا۔

بہر دو صورت ائمہ یا تو حکومت سے یا قوم کے نمائندگان سے مرعوب ہو کر رہ گیے اور اس منصب کی عظمت کی روح نکل گئی۔

ج: معاشروں اور قوم میں علماء مدارس کی کثرت، خصوصاً ایسے بڑے علماء جو کسی ادارے میں مسند حدیث، تفسیر، افتاء اور اہتمام پر فائز ہیں۔

د: عصری تعلیم سے دنیوی عہدوں پر فائز افراد کی کثرت۔

ھ: معاشرے میں خوش حال رئیس افراد کی کثرت۔

ان چند وجوہ سے ائمہ میں احساس کہتری پائی جاتی ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔

مجرب علاج

الف: سب سے پہلے یہی جو ہم نے بتایا کہ اس منصب کی عظمت ذہن نشین کر لی جائے کہ اس سے بڑھ کر کوئی منصب نہیں، جب تک اس کی عظمت دل میں نہیں اترے گی تب تک احساس کہتری سے نہیں نکل سکیں گے۔

ب: جہاں تک مسئلہ ہے معاشرے کے بڑے علماء کا تو اس بارے میں آپ کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بیشک وہ قابل قدر بڑے علماء ہیں لیکن جہاں ان کا ایک مقام ہے وہاں آپ کا بھی اپنا ایک مقام ہے، دونوں مقام میں کوئی تعارض نہیں بایں معنی قوم کی اصلاح کے خاطر جو قدم بھی بتقاضی شرع آپ اٹھائیں اس میں وہ مزاحم نہ ہوں گے بل کہ وہ شرعاً آپ کے معاون ہوں گے بشرطیکہ آپ کی بات عین موافق شرع ہو اور آپ کے دل میں ان کا حقیقی مرتبہ ومقام موجود ہو تو

پھر مرعوب ہونے کی ضرورت کیوں؟

تعاون فی البر کا حال تو یہ ہے کہ ایک بات حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کہہ رہے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کی بات کو تسلیم کر کے ان کی تائید کر رہے ہیں، مخالفت کا تو تصور بھی محال ہے، جس کی بکثرت مثالیں شریعت میں ہیں۔

لہٰذا اصلاح امت واصلاح معاشرہ کا کام شروع کرنے سے پہلے آپ فرداً فرداً ان کی خدمت میں جا کر درخواست پیش کریں کہ اس کتاب کے نہج پر کام میں ہمارا تعاون فرمائیں، بل کہ جمعہ وغیرہ میں ان سے خطاب بھی کرائیں۔

ج: جب مذکورہ دو طریقے آپ اختیار کرلیں گے تو مابعد ''عصری تعلیم اور مال'' والوں کا علاج تو خود بخود ہو جائے گا۔

د: رہا مسئلہ منتظمین مساجد ''کمیٹی ومتولیان'' کا تو اس بارے میں آپ صاحب وقار بڑے علماء کو ساتھ لے کر ان کی ملاقات کریں، وہ اولاً منصب امامت اور امام کے مقام سے ان کو باخبر کریں اور پھر اصلاح امت واصلاح معاشرے کی اس جدید تحریک سے باخبر کریں اور نرمی وحکمت سے یہ بتائیں کہ وہ اس میں مزاحم نہ بنیں بل کہ معاون بنیں۔ ان کی ذمہ داری ہے کہ امام کے کام میں ہاتھ بٹائیں ورنہ عنداللہ وہ ماخوذ ہوں گے۔ اور اس سے بھی باخبر کریں کہ منصب امامت کوئی منتظمین مساجد کے ماتحت منصب نہیں کہ خلاف شرع امور میں ائمہ کو مرعوب کیا جائے اور ان کو اپنے زیر اثر رکھنے کی کوشش کی جائے، اصل منتظمین مساجد کا کام مسجد کے ظاہری اسباب ''تعمیر، لائٹ پانی وغیرہ'' سے ہے، اس کے باطنی امور سے نہیں لہٰذا وہ اس میں بے دخل

ہوجائیں۔ یہ اس خیال پر لکھا ہے کہ کچھ منتظمین اس طرح کے سلوک کرنے والے ہوتے ہیں، ورنہ بہت سے متولیان اور منتظمین مساجد اللہ تعالیٰ کے گھر کی خدمت کے خیال سے ائمہ کے مقام کا لحاظ بھی رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے جذبہ سے حق کی پیروی کرنے والے اور ناحق سے اجتناب کرنے والے بھی ہوتے ہیں جو مساجد میں صحیح دینی فضا قائم ہونے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ ہم ان کے مقام و مرتبہ کو تسلیم بھی کرتے ہیں اور اس پر ان کو مبارک باد بھی دیتے ہیں۔ اس بارے میں تنظیم نے ان کو اور موذنین کو بھی جوڑنے کا پروگرام طے کیا ہے اس میں مزید ان شاء اللہ کام ہوگا۔

ھ: اس جدید تحریک کے بعد جب کہ اس کے منشا کے مطابق کام ہو تو پھر منصب امامت پر تقرری کے وقت ہی خودداری سے کام لیں۔ (جیسے بندے نے ایک زمانے میں خودداری سے کام لے کر اصلاح کا ایک مثالی کام کیا تھا)۔

آج نہ صرف غیر اقوام سے فتنوں کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں، بل کہ مسلم جماعتوں سے بھی اس کی صدائیں اٹھ رہی ہیں آج ہمارے ملک میں ۳ طلاق کا مسئلہ بہت زور وشور سے جو اٹھایا جا رہا ہے اس کی حقیقت جو کچھ بھی ہو نام تو بہر حال مسلمان خواتین کا ہی لیا جا رہا ہے۔ العیاذ باللہ۔ مذکورہ بالا مباحث اور موجودہ مسلمانوں کے دینی حالات کے تناظر میں از روئے <u>اصلاح امت و اصلاح معاشرہ</u> انتظار کے بعد ایک اور مسئلہ یہ حل ہو جاتا ہے کہ ائمہ مساجد نہ صرف مصلے کے امام ہیں اور نہ محراب و منبر اور مسجد و نماز تک کے امام ہیں۔

بل کہ مسجدوں کے دروازوں سے باہر نمازیوں کے گھروں، محلوں، آبادیوں اور ان

کے معاشروں میں اٹھنے والے ایسے فتنوں اور مسائل میں بھی مقتدیوں کے امام ومرجع ہیں جو فتنے اور مسائل مساجد کی بنیادوں کو متزلزل کرنے والے ہیں، کیوں کہ ملک ہند جیسے ممالک میں کوئی ذی قوت وشوکت حکمراں نہیں جس کی گرفت ونظر تمام مسلمان مرد وخواتین پر ہو اور نہ کسی شیخ الحدیث صاحب اور کسی ارباب اہتمام مہتمم صاحب اور دار الافتاء کے کسی مفتی صاحب کی ہے جو ملک ہند کے وسیع وعریض رقبہ میں ''پرندۂ ہدہد'' کی طرح معلوم کرسکیں کہ کہاں کیا فتنہ جنم لے رہا ہے ہاں جنم لینے اور جڑوں کے پختہ ہونے کے بعد ان کے کانوں تک آوازیں پہنچتی ہیں لیکن وہاں تک وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔

اس کے بالمقابل یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ تمام مسلمانوں میں ائمہ کو ایک خاص مقام ومرتبہ حاصل ہے، ان کی نظر اور ان کی ان پر گرفت ہوتی ہے کیوں کہ مساجد کا نیٹ ورک اس سے بھی زیادہ وسیع ہے جتنا رقبہ ہندوستان کا اور تمام مسلمان کا مذہبی سم کارڈ اس نیٹ ورک سے مربوط بھی ہے جہاں (مساجد) اس کارڈ کی بندش واجرا اور اس کی تفتیش کے اختیار کے مالک ''منبر ومحراب'' ائمہ موجود ہیں۔تو اب یہ مسئلہ حل ہوجاتا ہے کہ ائمہ اپنی اپنی ماتحت قوموں کے لیے'' اولی الامر اور امیر'' بھی ہیں واللہ اعلم بالصواب۔ ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ''(سورۃ نساء ۵۹)۔ وعن ابی ھریرۃ ... وَمَنْ يُّطِعِ الْأَمِيْرَ فَقَدْ أَطَاعَنِيْ وَمَنْ يَّعْصِ الْأَمِيْرَ فَقَدْ عَصَانِيْ ''(مشکوۃ ۳۱۸)۔

جب آپ اپنی قوم کے حق میں اولی الامر وامیر بھی ہیں تو ساتھ ہی آپ اپنی قوم میں پیش آمدہ مقدمات وتنازعات میں عدل وانصاف اور حکمت وبصیرت کے ساتھ فیصلہ کرنے میں قاضی بھی ہیں۔پس آپ کو چاہیے کہ اپنی قاضیانہ شان اور مسجد کی عدلیہ شان واضح کریں۔

اتنا ہی نہیں بل کہ چاہیے کہ قوم میں نت نیے بڑھتے جرائم ومنکرات کے انسداد کے لیے آپ سدّ سکندری اور مصلح بن کر قوم ومعاشرے کے قلب ودماغ میں اس کی نمایاں چھاپ کھڑی کریں اور معاشرے کو پوری طرح صالح بنائے رکھیں۔

پھر یہ بھی فراموش نہ کریں کہ آپ قوم کے حق میں ہادی ومعلم اور داعی ومبلغ بھی ہیں۔ کہ ان سارے ہی امور کو زندہ کرنے کا نام منصب امامت ہے، اور ان میں آپ ہی اپنی قوم کا مرجع ہیں۔

کیا آپ بذریعہ مملکت اصلاح کے منتظر ہیں؟

مذکورہ بالا مباحث کے بعد کہنے دیجیے کہ یا تو آپ کو یہ بات ہی پسند نہیں کی منصب امامت کو اتنا بلند مقام کیوں حاصل ہے؟ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے یا ہو سکتے ہیں طبائع مختلف ہوتی ہیں، اور اگر یہ بات نہیں تو پھر اس کے تقاضوں کو جان جان کر آستن وایزار چڑھا کر انہیں انجام دینے میں خوب مصروف ہوجائیں۔ اگر منصب کی عظمت اور حالات کے تقاضوں کو تسلیم کرنے کے بعد بھی انہیں انجام دینے کی طرف آپ توجہ نہیں فرماتے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ پھر شاید آپ اس کے منتظر ہیں کہ اسلامی مملکت قائم ہو اور وہ امت کی اور معاشروں کی اصلاح کرے، تو پھر جان لیجیے کہ یہ تو صرف تمنا ہی تمنا ہے جو ''لَیْتَ الشَّبَابَ یَعُوْدُ'' کی طرح صبح قیامت تک حاصل ہونے والی نہیں۔

آج کتنے ممالک ہیں جہاں مسلمان حکمراں اس فریضے کو انجام دے رہے ہیں؟ حکمران کی کوئی کمی نہیں، کمی انجام دینے کی ہے، لہٰذا اب یہ ماننا ہوگا کہ یہ کام صرف مملکت ہی کا نہیں، مملکت کا بھی ہے اور علماء وائمہ مساجد کا بھی ہے، تفصیل اختصار کے لیے مضر ہے حدیث

شریف میں ہے، ”صِنْفَانِ مِنْ أُمَّتِي إِذَا صَلُحَ صَلُحَ الْأُمَّةُ فَإِذَا فَسَدَ فَسَدَ الْأُمَّةُ اَلسُّلْطَانُ وَالْعُلَمَاءُ او کما قال رسول اللہ ﷺ “ الفاظ حدیث میں فرق ہے، سلطان کی جگہ امراء اور علماء کی جگہ فقہاء بھی ہے۔ مصلح امت ﷺ نے صلاح وفساد کو امت کے دو طبقوں کے ساتھ جوڑا ہے ایک طبقہ علماء کے ساتھ اور دوسرا طبقہ امرا کے ساتھ ہمارے یہاں اس طرح کے امراء کا کوئی تصور نہیں لہذا ایک ہی طبقہ باقی رہ گیا اور اصلاح کی صرف ایک ہی صورت رہ گئی۔

اب امت کو صلاح کے راستے پر چلانے اور بگاڑ کے راستے سے بچانے کی ذمہ داری تنہا علماء کی بن گئی، اور علماء اپنے اپنے محدود احاطے میں قید و بند۔ اگر وہ بھی اپنے احاطے کا کما حقہ صلاح کا نمونہ پیش کر دیں تب بھی بساغنیمت حالاں کہ یہ ان کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔

ادھر اکثر عوام ائمہ مساجد سے وابستہ پابستہ تو اب ائمہ پر یہ ذمے داری قوت کے ساتھ عائد ہوتی ہے ان ہی ذمے داریوں کو سمجھانے ہی کے لیے تو آپ نے فرمایا تھا ”اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ“ آپ نے ”اَلْأُمَرَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ“ نہیں فرمایا تھا اور یہ تو معلوم ہے ہی کہ دینار و درہم میں وراثت مراد نہیں جس کی نفی حدیث شریف میں خود موجود ہے بل کہ حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے صراحت فرما دیا کہ آپ کے وصال کے وقت (گھر کے فاقہ کا حال یہ تھا کہ) آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس ۳۰ صاع جَو کے عوض رہن رکھی ہوئی تھی (مشکوٰۃ ۲۵۰) دینار و درہم کی وراثت کا شبہ ختم ہو گیا۔

اگر شکوہ ہے مصروفیات کا تو۔۔۔

اگر آپ نے پیش کردہ جملہ مباحث کو (بوجہ دلائل) تسلیم کر کے اپنی دانشمندی کا ثبوت یوں پیش کیا کہ واقع میں اصلاح امت اور اصلاح معاشرہ کا یہ کام ہم ائمہ مساجد ہی کا ہے، لیکن

اس کا کیا کیا جائے کہ مصروفیات اس قدر سوار ہیں کہ اس طرف توجہ کی اجازت ہی نہیں دیتیں۔تو ہم آپ کو یاد دلا دیتے ہیں کہ ایسی صورت میں آپ کی نظر کہاں اٹھنی چاہیے، آپ کی نظر کو چاہیے کہ وہ اپنے اسوے اور قرآن وسنت کی طرف اٹھے " لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ " آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تمام انسانوں کے لیے نمونہ ہے چاہے جس کا جو حال ہو اس حال میں آپ کی ذات اسوہ ہے، آپ کی ذات میں تمام کے لیے ہدایت وراہ نمائی موجود ہے۔

آپ ذرا ٹھنڈے کلیجے سے سوچیے ایک امام مسجد کی مصروفیات زیادہ ہوں گی یا امام الانبیاء کی! ایک مدرسہ ومکتب کے معلم کی مصروفیات زیادہ ہوں گی یا اس کی جو ساری امت کا معلم ہے۔آپ نبی بھی ہیں داعی بھی، آپ قاضی بھی ہیں مفتی بھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم (نماز میں) امام صحابہ بھی ہیں امام الانبیاء بھی، آپ ہادی قوم بھی ہیں سربراہ مملکت بھی۔کسی طرح بھی آپ کا عذر معقول نظر نہیں آتا۔

اور بڑی حیرت کی بات فقیہ عصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم بیان فرماتے ہیں (جو حدیث مسیئ الصلوٰۃ عن ابی ہریرۃ (مشکوٰۃ ۷۵) میں مذکور ہے) ایک نوجوان نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جلدی جلدی نماز پڑھی تو آپ نے فرمایا " اِرْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ "اس نوجوان نے دوبارہ چار رکعات جلدی جلدی پڑھ لی تو آپ نے پھر فرمایا کہ جاؤ دوبارہ نماز پڑھو کیوں کہ تم نے نماز نہیں پڑھی اسی طرح تین بار ہوا آپ اس کی نماز کو غور سے دیکھتے رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کی نماز کی اصلاح کے لیے اس کی بارہ رکعات پڑھنے تک مشاہدہ کرتے رہے اور اتنا وقت اس کی نماز کو عنایت کیا کیا ہم بھی ایسا حوصلہ رکھتے ہیں۔

(اذان ہندص:۸ ۲۰۱۲ء) ۔کیااب بھی یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ امام صرف نمازوں میں ضامن ہے یا ہماری ذمے داری توصرف نمازیں پڑھا دینا ہے یاہماری مصروفیات زیادہ ہیں ۔ ہرگز نہیں تواب شکوہ کامنھ اصلاحی قدم اٹھا کر بند کیجئے ۔

مصروفیات نہیں شکوہ ہے صلاحیت کا تو۔۔۔

اگر آپ کہیں کہ اتنے بڑے فریضے کوانجام دینے کے مقابلے میں مصروفیات کی کیا حیثیت ، یہ فریضہ اتنا اہم ہے کہ بالفرض اگر مصروفیات ہوں بھی تو یک لخت بھلانے '' نَسْیاً مَنْسِیًّا'' کے لیے تیار ہیں، مسئلہ تو صلاحیت کا ہے وہ کہاں سے لائیں؟ کیوں کہ ہم اپنے کواہل ہی نہیں پارہے ہیں، نہ علمی صلاحیت نہ معاشرے (مقتدیوں) میں اتنا مقام کہ انہیں ہم کچھ کہیں اوروہ لبیک کہہ کر مان لیں۔ یہ توایسا ہے کہ''چاہتے ہیں پر چاہا نہیں جاتا ''اگر صلاحیت کا کوئی متبادل نکل آئے اوراس کے حاصل کرنے کا طریقہ معلوم ہوجائے اوراس آخری منزل سے گزر جائیں یاہم کوکوئی ہاتھ پکڑ کر گزار دے تو ہم پورے عزم وعہد کے ساتھ بسم اللہ پڑھنے کے لیے تیار ہیں بس کوئی بسم اللہ پڑھادے ہمارا اگلا قدم کام کے میدان میں ہوگا جوپیش پیش بھی ہوگا۔

صلاحیت اوراس کا حل!!

حقیقی بسم اللہ تو اللہ تعالیٰ ہی پڑھانے والے''معلم ومربی ''ہیں غار حرا میں حکم ہوا اقرأ۔۔۔تاہم میں اس کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔آپ نے شکایت کی اہلیت وصلاحیت کی کہ آپ میں صلاحیت نہیں۔ یہ آپ کہہ رہے ہیں(کہ صلاحیت نہیں) کیا آپ کی ہربات ہمیشہ سچ اورحقیقت ہی ہوتی ہے؟؟؟ کتنا سونا (دھات) سونے کی شکل میں پیتل ہوتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہے! کمی صلاحیت کی نہیں احساس کی ہے،آپ جواس کی کمی محسوس کر

رہے ہیں وہ خود احساس ہے، مطلب فکر و احساس کی کمی ہے، آپ نے شاید اس کی صحیح معنی میں چوں کہ فکر ہی نہیں ہے تو کام کے مواقع بھی سامنے نہیں آئے اور جب کام کے مواقع سامنے نہیں آئے تو کام کیا بھی نہیں اور ہوا بھی نہیں۔ لہٰذا یہ نفی وقوع کے لحاظ سے تو درست ہے امکان کے لحاظ سے درست نہیں جب کہ سوال امکان کا تھا یعنی صلاحیت موجود ہے۔

میری ناقص رائے یہ ہے کہ آپ کچھ وقت تک صحیح معنی میں فکر کرکے کام کی کوشش کرنا شروع فرمادیں، آپ کچھ وقت کے لیے اس خیال کو قلب و ذہن میں دفن کردیں، آنکھ بند کرکے کام کی کوشش جاری رکھیں پھر مجھ سے کہیے، تب شاید آپ خود آپ کے نہیں رہیں گے بل کہ میرے ہوجائیں گے۔ ۱؎

آپ کو یقین دلانے کی ایک سادھی سی مثال پیش کردیتا ہوں۔ ایک شخص نے کبھی تجارت نہیں کی لیکن اس نے آج سے تجارت شروع کی تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ مجھ میں تجارت کی اہلیت و صلاحیت نہیں لیکن تھوڑے ہی مہینوں میں وہ بھول جاتا ہے کہ مجھ میں تجارت کی ماضی میں صلاحیت نہ تھی۔ حالاں کہ شروع میں وہ تجارت سے گھبراتا تھا اتنا ہی جتنا آپ نے زندگی میں پہلی مرتبہ نماز پڑھانے امامت کے مصلے پر قدم رکھے تھے اور آپ گھبرائے تھے، کیا آج آپ گھبراتے ہیں؟ یا اب تو خواہ مخواہ مصلیوں کو ڈانٹتے بھی ہیں؟ خطاب میں مصلیوں کو ڈانٹنا خود اپنی ناسمجھی ہے آپ کو آداب خطاب پڑھنے چاہئے۔ ان شاء اللہ ایک حصہ میں اس کا بیان بھی شامل ہے۔

میں آپ کو کیا بتاؤں ! صلاحیت کے مسئلے کا ''حال اور حل'' یہ ہے کہ جب کوئی صاحب اہتمام یا کوئی شیخ الحدیث یا کوئی خطیب و معلم صاحبان پہلی بار اپنی اپنی مسند پر رونق افروز ہوتے ہیں تو وہ بھی بے بضاعتی و کم مائیگی کے احساس کے شکار ہوتے ہیں۔

۱؎ بندہ نے اسی طرح ذہن سازی کرکے اپنے دو صاحب زادوں کو عالم بھی بنایا اور ڈاکٹر بھی وللہ الحمد۔ آپ بھی کرکے دیکھیں۔

بل کہ روایت میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کا حکم فرمایا'' وکان رجلاً رقیقاً'' تو ''بوجہ رقت قلب '' انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا اے عمر تم ہی نماز پڑھاؤ، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا آپ ہی اس کے زیادہ حق دار ہیں (مشکوۃ ۱۰۲)۔ دیکھیے حضرت ابوبکرؓ کو بھی یہ احساس تھا لیکن جب حسب حکم تعمیل فرماتے رہے تو بڑھتے ہی گیے ایسے کہ پھر ان کو کوئی نہ پاسکا۔

دراصل کسی بھی کام کی ابتدا میں صلاحیت کی کمی کا احساس ہر ایک کو ہوتا ہی ہے اور ہونا بھی چاہیے لیکن مسلسل مزاولت سے وہ احساس بھی ختم ہو جاتا ہے اور گھبراہٹ بھی دور ہو جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بل کہ وہ اس کام سے واقف بھی ہو جاتا اور کہیے کہ واقف ہی نہیں ماہر بھی۔ خود حدیث شریف سے بھی معلوم ہو رہا ہے کہ ہر شخص میں کم وبیش صلاحیت ہوتی ہے ''اَلنَّاسُ مَعَادِنُ كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ ''(مشکوۃ ۳۲)۔ البتہ اسے اجاگر کرنا پڑتا ہے۔ صلاحیت کے ناتے عمدہ ایک نکتہ بھی ملاحظہ ہو اماموں کے قریب جو منبر رکھا ہوتا ہے جس کی عامۃ تین سیڑھیاں ہوتی ہیں کیا جانتے ہیں کہ وہ کیا اشارہ دیتا ہے؟ وہ اضافہ صلاحیت کا اشارہ دیتا ہے کہ جو کوئی جتنی لگن دُھن اور فکر لے کر آئے گا اتنا ہی اوپر اٹھے گا بس آپ اٹھ کر بتایے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اصلاح کے لیے مملکت اسلامیہ کے وجود کے خواب دیکھنے سے ۔۔۔ اور مصروفیات کے وہم میں مصروف ہونے سے ۔۔۔ اور قصر صلاحیت کی صلاحیت دکھانے سے ۔۔۔ اور شیطانی حربے اور نفسانی شکوک وشبہات کے پالنے سے خوب دور رہیے، تب آپ زندگی میں کچھ کر سکتے ہیں ۔ آپ جب اس قسم کے شیطانی ونفسانی اوہام پالنے سے دور رہیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو امت پالنا سکھائیں گے۔ اے اللہ تیرے فضل سے قائد امت ''ائمہ مساجد ''کو منبر تک لانے کی کوشش کی ہے جنہیں صاحب منبر ہونے کے

باوجود اس پر چڑھنا معلوم نہ تھا اب تو انہیں اس پر چڑھا دے۔

کھویا مقام پانا !!!

رہا آپ کا یہ مسئلہ کہ ہمیں قوم میں ایسا مقام حاصل نہیں کہ ہم کہیں اور لوگ بے چون و چرا مان لیں، تو یاد رکھیے کہ آپ کو ترتیب یاد نہیں یہ تو ایسا ہوا کہ کوئی کہے کہ میرا بیٹا ہی نہیں تو اس نے پوچھا شادی بھی کی ہے تو اس نے کہا نہیں تو ترتیب یہ ہے کہ پہلے شادی کریں پھر بیٹے کی شکایت۔

مقام آدمی کو کام سے حاصل ہوتا ہے، کام کا درجہ مقدم ہے مقام کا خود مقام مؤخر ہے ،لہٰذا پہلے فکر و کوشش سے کام کو وجود دیں اللہ تعالیٰ مقام نہیں کئی مقامات دیں گے۔اس وقت جتنے حضرات بلند مقام پر نظر آتے ہیں وہ کام سے پہلے اس مقام پر نہیں تھے۔ایک ہمت کی بات بتادوں جیب کی ڈائری میں لکھ کر روزانہ دیکھ کر حوصلے بنائیں آپ خود فیصلہ کریں کہ ایک شخص نے قوم و معاشرے میں اپنا ایک مقام بنا رکھا ہے جس کی وجہ سے ہر سو اس کا ''سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ سے'' خیر مقدم ہوتا ہے، دوسرا شخص معاشرے میں اپنا مقام کھو چکا ہے جس کی وجہ سے ہر سو '' سُحقاً سُحقاً سے'' دور کیا جاتا ہے،اب فیصلہ اس بات کا کریں کہ کمال کس کا ہے؟ اول شخص جو اس مقام کو برقرار رکھے اس کا یا دوسرا شخص جو کھوئے مقام کو حاصل کرلے اس کا!! فیصلہ یہ ہے کہ کمال دونوں کا ہے لیکن نسبتاً دوسرے کا کمال پہلے والے سے زیادہ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ تھا کہ قوم نے وطن چھڑایا، بلال رضی اللہ عنہ حبشی کو حبشہ، صہیب رضی اللہ عنہ رومی کو روم، سلمان رضی اللہ عنہ فارسی کو فارس چھوڑنا پڑا، لیکن کھویا مقام اس قدر پایا کہ اگر یہ نہ پایا ہوتا تو کچھ نہ پاتے۔حوصلوں، ذمہ داریوں فکروں اور کاموں سے وہ حاصل ہوتا ہے جو دینار و درہم سے حاصل نہیں ہوتا۔بس ایک مرتبہ اٹھ کر دیکھیں یہ تو پہلے ہی ہم نے کہہ دیا تھا کہ ترتیب صحیح ہونی چاہیے نیز یہ بھی یاد رکھیے کہ کسی کام کو اٹھ کر دیکھا جاتا ہے دیکھ کر اٹھا نہیں جاتا۔لہٰذا دیکھ کر اٹھنا الٹی

ترتیب ہے اٹھ کر دیکھنا ہے۔

امامت کی دو قسمیں ہیں، کیوں کہ اسلام نے ہمیں دو قسموں کا تصور دیا ہے۔ایک امامت کبریٰ۔دوم امامت صغریٰ۔

امامت کبریٰ: ظاہری نظام کی درستگی اور پھر اس کی ترقی کے لیے جو شخص طے ہو کر ''حاکم وقت'' ان کو انجام دے، یہ امامت کبریٰ ہے اور وہ شخص امام کبیر ہے۔

امامت صغریٰ: باطنی نظام ''پنج وقتہ نماز، جمعہ اور عیدین'' کی درستگی پھر اس کی ترقی کے لیے جو شخص طے ہو کر ''امام مسجد'' ان کو انجام دے، یہ امامت صغریٰ ہے اور وہ شخص امام صغیر ہے۔لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ (۱) اول ظاہری ''دنیوی'' سلطنت ہے اور ثانی باطنی ''دینی'' سلطنت ہے۔(۲) دونوں میں دونوں جہتیں ہیں لیکن اول میں جہت دنیویہ غالب ہے اور ثانی میں جہت دینیہ غالب ہے۔اب سوچئے کہ ائمہ مساجد کتنے بڑے منصب کے مالک ہیں اور کتنے بڑے درجے پر فائز ہیں!

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عبید اللہ بن عدی رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے جب کہ حضرت عثمان ؓ اپنے گھر میں محصور تھے تو حضرت عبید اللہ نے فرمایا کہ اس وقت امام عام (خلفیہ وحاکم) تو آپ ہی ہیں لیکن جس مصیبت سے آپ دوچار ہیں وہ آپ خود بھی جانتے ہیں (گھر میں محصور ہیں) اور (مسئلہ یہ ہے کہ) ہمیں باغیوں کا امام نماز پڑھا رہا ہے جس کے پیچھے نماز پڑھنے میں ہم حرج (نامناسب وخطا) سمجھتے ہیں (تو اس بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟)

تو حضرت عثمان ؓ نے فرمایا کہ لوگ (مسلمان) جو بھی اعمال کرتے ہیں ان سب میں

اچھا عمل نماز ہے جب لوگ جو بھی اچھے عمل اختیار کریں تو تم بھی ان اعمال میں لوگوں کے شریک رہو، اور جب وہ برے اعمال اختیار کریں تو تم ان کے برے کاموں سے دور رہو (مشکوۃ ص۶۴)۔

مذکورہ حدیث سے دونوں طرح کی امامت کا بیان ثابت ہوتا ہے۔ کہ اس وقت امام عام تو آپ ہی ہیں لیکن ہمیں نماز باغیوں کا امام پڑھاتا ہے (اِنَّكَ اِمَامُ عَامَّةٍ وَيُصَلِّي لَنَا اِمَامُ فِتْنَةٍ)۔ نیز یہ حدیث اخلاق حسنہ وکریمہ کا بھی بلند سبق دیتی ہے اور اس طرف راہ نمائی کرتی ہے کہ آدمی اپنے جانی دشمنوں کے ساتھ کیسا سلوک کرے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے باغیوں کے پیچھے نماز تک سے نہیں روکا ہاں شرعاً جو برے کام ہیں ان میں شرکت سے منع فرمایا۔

ہم امامت کی مذکورہ دو قسموں سے یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ جب امامت کبریٰ (خلافت) کا کام امور المسلمین کا ایسا نظم وانتظام ہے جو عند الشرع مقصود ہے، تو امامت صغریٰ (امامت) کا مقصود وہ کیوں نہ ہوگا پھر صرف نمازوں کے ساتھ تخصیص محل غور ہے۔[1]

---

[1] مذکورہ دو قسم کی تفصیل "شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی کشف الباری میں بیان کی ہے"۔ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے حکم دیا لیکن افاقہ محسوس ہوا تو آپ مسجد تشریف لے گیے اور ابوبکرؓ کی بائیں جانب بیٹھ کر نماز پڑھائی۔

حضرت نے لکھا ہے کہ اس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم امامت کبریٰ (خلافت) کی طرف امت کو اشارہ دینا چاہتے ہیں کہ میرے بعد خلافت کے مستحق ابوبکرؓ ہیں۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت، امامت بارزہ ہے اور صدیق کی امامت، امامت کامن ومستتر ہے۔ اسی لیے نہ تو ابوبکر مقتدیوں کی صف میں شامل ہوئے نہ ان کی امامت بالکلیہ معطل ہوئی، بایں معنی کہ حضور بیٹھ کر نماز پڑھا رہے تھے اور صدیق اکبر قائم ہو کر جو اشارہ ہے قیام خلافت کی طرف۔

یہی وجہ ہے کہ الفاظ حدیث میں ابوبکر کو بھی لوگوں کا امام کہا گیا ہے جس طرح ابوبکر کا امام آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے (کشف الباری کتاب الصلوۃ ص۳۳۳)۔ خلاصہ یہ کہ امامت کبریٰ کی طرح امامت صغریٰ پر بھی مختلف ذمہ داریاں عائد ہیں نہ کہ صرف نماز پڑھانا۔

امامتِ مسجد کی سچی نظیر

مسجد کی جماعتوں کی امامت کیا ہے اس کو اس کی سچی اور عمدہ نظیر سے سمجھیے۔ اسلامی اغراض ومقاصد کے لحاظ سے گویا یہ مسجد کی امامت ایک (باطنی) سلطنت ہے۔ جس کے شہنشاہ امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔۔۔ اور مسجد نبویؐ پارلیمنٹ۔۔۔۔۔ اور منبر شریف تخت شاہی۔۔۔ اور قرآن عظیم اور احادیث نبویہ (سنت) آئین سلطنت۔۔۔۔۔ اور علمائے عظام پارلیمنٹ کے ممبران۔۔۔۔ اور دنیا کی ساری مساجد صوبائی پارلیمنٹ۔۔۔۔ اور ان کے ائمہ اس شہنشاہ کے وزراء وخلفاء!!!

فرق دونوں سلطنتوں (ظاہری وباطنی) میں صرف اتنا ہے کہ مشبہ بہ (دنیوی سلطنت) فانی ہے اور مشبہ (باطنی وروحانی سلطنت) غیر فانی۔ سبحان اللہ کس قدر عمدہ بے بدل تعبیر ہے!!! مذکورہ تفصیل سے ائمہ مساجد کا جہاں بلند مقام معلوم ہوتا ہے کہ قوم کو چاہیے کہ نماز میں امام کی اتباع کی طرح خارج نماز میں بھی اس کو اپنا امام وپیشوا بنائیں جب کہ وہ شرعاً کوئی راہ نمائی کرے۔ وہاں ان کے کام اور ذمہ داریوں کا اشارہ بھی ملتا ہے کہ انہیں قرآن وسنت کو لوگوں میں خوب زندہ کر کے اپنے ماتحت معاشرہ کو کیسا پیارہ بنانا چاہیے!

[redacted]

غور فرمائیں خلافت کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق بھی ہماری مذکورہ نظیر پر کتنی اچھی روشنی ڈال رہی ہے۔ جس کو حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تحریر کیا ہے۔ حضرتؒ نے ''فیوض الحرمین'' میں خلافت کی کچھ اس طرح دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک دینی نصرت کے حکومتی شعبوں (مثلاً جہاد وقتال اور اقامت عدل وغیرہ) میں کسی حکمراں کا رسول

اللہ ﷺ کا نائب بن کر کام کرنا۔ دوسری دعوت وتبلیغ، تعلیم وتربیت اور اصلاح وارشاد کے شعبہ میں نائب بن کر کام کرنا۔ ان دونوں شعبوں اور طریقوں سے خدا طلبی واخلاص کے ساتھ جدوجہد کرنے والے بھی رسول اللہ ﷺ کے خلفاء ہیں۔

فرق بس یہ ہے کہ پہلی قسم کے خلفاء ظاہری اور بیرونی پہلو کے خلفاء ہیں اور دوسری قسم کے خلفاء باطنی اور اندرونی پہلو کے خلفاء ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے پہلی قسم کا نام خلافت ظاہرہ اور دوسری کا نام خلافت باطنہ رکھا ہے (دین وشریعت ۲۰۸)۔ حضرت کی تحقیق سے ہم ائمہ حضرات کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خلیفہ کی طرح ان کے ذمہ اقامت جماعت وجمعہ اور وعظ وخطاب کے علاوہ بھی کچھ کام اور کچھ ذمہ داریاں ہیں، وہ صرف نمازوں کے ہی امام نہیں۔ حضرت کے الفاظ پر غور فرمائیں حضرت نے دعوت وتبلیغ، تعلیم وتربیت اور اصلاح وارشاد فرمایا ہے، صرف نماز پڑھانا نہیں فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ امامت کبریٰ میں اگر امور مسلمین کا نظم خلاف شرع ہو تو اسے خلافت نہیں امارت کہتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے وفات نبوی ﷺ پر انتخاب خلیفہ کے بارے میں جو تحریر فرمایا ہے وہ بھی ہماری مذکورہ بات کی طرف مشیر ہے۔ فرمایا کہ ”آں حضرت ﷺ کے وصال کے بعد امت کے سامنے انتخاب خلیفہ کا جو سوال آیا تو اس کی نوعیت یہ تھی کہ جس طرح آں حضرت ﷺ خلق اللہ کی ہدایت کے لیے اور دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کا دین پھیلانے کے لیے اور دنیوی نقشہ کو مرضیٔ خداوندی کے مطابق بنانے کے لیے جو جدوجہد کررہے تھے اور ساتھ ہی دعوت وتبلیغ، تعلیم وتذکیہ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، جہاد وقتال اور اقامت عدل کی قسم کے کام امت کو ساتھ لے کر انجام دے رہے تھے اب کون ہم میں اس کا زیادہ اہل ہے کہ اس کو آں حضرت کا خلیفہ ونائب مقرر کیا جائے، اس کی نوعیت۔ جیسا کہ

ناواقفی سے بہت سے لوگ سمجھتے ہیں۔ ایسی نہیں تھی جیسی کسی حکمراں بادشاہ یا صدر جمہوریہ کے انتخاب کی'' (دین وشریعت ۲۰۶)۔

بل کہ حضرت نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ (خلافت کو چھوڑ کر) اسلام میں ''خود'' حکومت واقتدار صرف اس مقصد کے لیے مطلوب ہے کہ دنیا میں خدا پرستی فروغ پائے، نیکیوں کا رواج ہو اور بداخلاقیوں اور بدکرداریوں کی روک تھام ہو۔ جیسے کہ آیت شریفہ ''اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ'' (حج ۴) سے اشارہ مل رہا ہے۔ پھر اسلامی حکومت کی ذمہ داریاں بیان کی ہیں۔ مثلاً نظام تعلیم، ارشاد واحتساب، جہاد، ہر شخص کی ضرورت کی تکمیل اور ایسا انصاف جو بے لاگ ہو (دین وشریعت ۲۱۵)۔

مضامین بالا سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خلافت وحکومت کا کام دین کو فروغ دینا ہے نہ کہ صرف دنیوی ضروریات کا انتظام۔ تو امامت جیسے خالص دینی شعبہ کا کام (بقدر وسعت) بطریق اولیٰ وہی ہوگا جو صرف آج کے مروجہ امامت کے طریق سے ممکن نہیں اس سے زائد معنی وکام سے ممکن ہے۔

احادیث مبارکہ میں پچاسوں جگہ منبر کا ذکر ہے بندہ نے اس کو جمع بھی کیا تھا، تاہم بخوف طوالت ان کا ذکر مناسب نہیں سمجھا۔ بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جسے صاحب مشکوۃ رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے، ''مَا بَيْنَ بَيْتِيْ وَمِنْبَرِيْ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ وَمِنْبَرِيْ عَلٰى حَوْضِيْ'' (مشکوۃ ۶۸)۔ میرے حجرے اور میرے منبر کے درمیان کا حصہ جنت کے باغات (ٹکڑوں) میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر حوض (کوثر) پر

ہوگا۔ لے (یا ہے)۔

شارح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا منبر شریف کے بارے میں یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ روز قیامت میں بعینہ آخرت میں لوٹا دیا جائے گا۔ اس لیے کہ حدیث شریف کے بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ جب تک کوئی صارف و مانع موجود نہ ہو اس کے الفاظ کو اس کے ظاہری معنی پر ہی محمول کیا جاتا ہے اور یہاں بھی کوئی مانع موجود نہیں۔ ''وَقِيْلَ يُعِيْدُ اللهُ مِنْبَرَه عَلٰى حَالِه فَيُنْصِبُه عَلٰى حَوْضِه... لِاَنَّ الْاَصْلَ بَقَاءُ اللَّفْظِ عَلٰى ظَاهِرِهِ الْمُمْكِنِ وَاللهُ اَعْلَمُ '' (مرقات ۲/۱۹۱) ۔ معلوم ہوا کہ دنیا ساری فانی ہے مگر منبر شریف۔

حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حدیث مذکورہ میں منبر شریف کے ذکر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ جس طرح پیاسے لوگ اپنی پیاس بجھانے کے لیے حوض و نہر کا سہارا لیتے ہیں اسی طرح جہالت کے مارے مردہ دل لوگوں کی پیاس بجھانے کا ٹھکانہ میرا منبر ہے۔ ''نَبَّهَ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَلٰى اَنَّ الْمِنْبَرَ مَوْرِدُ الْقُلُوْبِ الصَّادِيَةِ فِيْ بَيْدَاءِ الْجَهَالَةِ كَمَا اَنَّ الْحَوْضَ مَوْرِدُ الْاَكْبَادِ الظَّامِئَةِ''۔

لے ریاض الجنۃ کے بارے میں تو تقریباً جمہور کا اتفاق ہے کہ وہ اپنے ظاہر پر محمول ہے کہ وہ فی الحال ہی جنت کا ایک ٹکڑا ہے وہ جنت سے اتارا ہوا ہے پھر قیامت کے روز جنت میں منتقل کر دیا جائے گا۔ مذکورہ جملہ کا یہ ایک مفہوم ہے ورنہ اس کے اور بھی معانی ہیں۔ ''وَقَالَ مَالِكٌ اَلْحَدِيْثُ بَاقٍ عَلٰى ظَاهِرِهٖ وَالرَّوْضَةُ قِطْعَةٌ نُقِلَتْ مِنَ الْجَنَّةِ وَسَتَعُوْدُ اِلَيْهَا وَلَيْسَتْ كَسَائِرِ الْاَرْضِ تُفْنٰى وَتُذْهَبُ قَالَ ابْنُ حَجَرٍ وَهٰذَا عَلَيْهِ الْاَكْثَرُ'' (مرقات ۱/۱۹۱)۔ یہاں زیر بحث مسئلہ منبر شریف کا ہے۔

خلاصہ کلام احادیث مبارکہ میں بار بار منبر کا تذکرہ۔۔۔اور بطور خاص منبر شریف کو آخرت میں منتقل کیے جانے کا مسئلہ۔۔۔ اور منبر کا ملا علی قاریؒ کے حوالے سے نقل کردہ فائدہ۔۔۔ یہ ساری چیزیں ہماری اس تشبیہ کی تائید کرتی ہیں کہ منبر شریف غیر فانی ہے۔۔۔اور وہ ایسا تخت شاہی ہے جہاں سے آئین سلطنت کا اعلان ہوتا ہے۔۔۔جس تشبیہ سے ائمہ حضرات کی ذمہ داریاں مترشح ہوئی ہیں۔لہٰذا وہ ائمہ مساجد جو اس منبر کے مالک ہیں انہیں اپنے اس عالی مقام اور عائد ذمہ داریوں کے بارے میں پوری طرح واقف ہوکر ان کے انجام دینے میں متفکر ہونا چاہیے اور انہیں اس مسجدی مشن کو عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس کا ذکر اوپر گزرا ہے، اور لوگوں کو منکرات ومعاصی سے بچا کر طاعات وعبادات کی طرف لانا چاہیے اور انہیں یہ نہ سوچنا چاہیے کہ وہ صرف نمازوں کے ہی امام ہیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''جامع لاحکام القرآن'' میں آیت شریفہ '' وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَالِيَ لَآ أَرَى الْهُدْهُدَ '' ۔حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب ہدہد پرندے کو غائب پایا تو فرمایا کیا بات ہے میں اس کو موجود نہیں پا رہا ہوں۔ کے تحت لکھا ہے کہ وہ ایک چھوٹا پرندہ ہوتا ہے، جس کا کام پانی کی تحقیق کرنا تھا کہ کس جگہ زمین پر یا زمین کی تہ میں پانی ہے، اگر ہے تو کتنی گہرائی میں ہے۔اسی لیے کہا گیا ہے۔ ''كَانَ الْهُدْهُدُ مُهَنْدِسًا'' کہ وہ انجینیر تھا۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی رعایہ کے احوال سے اس قدر باخبر ہوتے کہ اتنے چھوٹے سے پرندے کے غائب ہونے کی بھی خبر ہوگئی، اس سے اندازہ لگایئے کہ بڑوں کے احوال سے کس قدر باخبر ہوتے ہوں گے۔ پھر اس سے

استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس باخبر ہونے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ ہر عہدے دار شخص کو اپنے ماتحتوں کے احوال کی خبر رکھنی چاہیے، کہ ان میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا ائمہ عہدے دار نہیں؟؟

اور" مَالِیَ لَاۤ اَرَی الْهُدْهُدَ" میں امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ ابن العربی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ تفقد تو آداب میں تھا۔ ہمیں اس تفقد کی آج کتنی ضرورت ہے جب کہ ہمارے یہاں تو فرائض میں کوتاہیاں ہیں۔" هٰذَا فِی الْاٰدَابِ فَکَیْفَ بِنَا الْیَوْمَ وَنَحْنُ نُقَصِّرُ فِی الْفَرَائِضِ" (قرطبی ۱۷۹/۱۳)۔کیا ہمارے زمانہ میں کوتاہیاں نہیں؟

آیت شریفہ کے بعد علامہ قرطبیؒ نے مذکورہ مضمون پر حدیث شریف بھی نقل فرمائی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں ان کا حال بھی یہی تھا۔ چناں چہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے تھے اگر فرات کے کنارے پر کوئی بھیڑیا، بھیڑ کے بچے پر حملے کر لے، اس کا شکار کر لے تو اس بارے میں (روزِ قیامت کو) عمر سے سوال ہوگا۔" لَوْ اَنَّ سَخْلَةً عَلٰی شَاطِئِ الْفُرَاتِ اَخَذَهَا الذِّئْبُ لِیُسْئَلَ عَنْهَا عُمَرُ"۔ پھر بطور خلاصہ کے لکھتے ہیں " فَقَدْ دَلَّ الْقُرْآنُ وَالسُّنَّةُ وَبَیَّنَّا مَا یَجِبُ عَلَی الْاِمَامِ مِنْ تَفَقُّدِ اَحْوَالِ رَعِیَّتِهٖ وَمُبَاشَرَةِ ذٰلِكَ بِنَفْسِهٖ" (قرطبی ۱۷۸/۱۳)۔

وَهَلْ اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْكُ	وَاَحْبَارُ سُوْءٍ وَرُهْبَانُهَا

ائمہ حضرات بھی ایک بڑے منصب کے مالک ہیں وہ بھی قرآن وسنت سے ثابت شدہ ذمہ داری میں شامل ہیں جیسے علامہ قرطبیؒ نے استنباطی روشنی میں فرمایا ہے۔ اگرچہ نصوص میں امام سے صراحت مُراد حاکم وقت ہے۔ لہٰذا وہ ذمہ داری کو سمجھ کر عوام کو دینی ماحول عطا کریں،

کیوں کہ بادشاہ وسربراہ اور علماء وائمہ اپنے ماتحتوں کو جیسا ماحول دیتے ہیں عوام اسی ماحول کو قبول کرتے ہیں حتی کہ ان ہی کے کردار پر مشتمل لوگوں میں تذکرے ہوتے ہیں۔لکھا ہے کہ

● حجاج بن یوسف چوں کہ ظالم وقاتل بادشاہ تھا اس لیے اس کے زمانے میں جب لوگ صبح کو بیدار ہوتے اور ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی تو باہم پوچھتے گذشتہ رات کون قتل ہوا، کس کو پھانسی دی گئی؟

● ولید بن عبدالملک کثیر المال صاحب جائداد تھا اور عمارتیں بنانے کا شوقین تھا۔ چناں چہ اس کے زمانے میں لوگ ایک دوسرے سے مکانات کی تعمیرات، نہروں کی کھدائی اور درختوں کی افزائش پوچھا کرتے۔

● جب سلیمان بن عبدالملک نے حکومت سنبھالی تو وہ کھانے پینے اور گانے بجانے کا شوقین تھا۔ چناں چہ لوگ اچھے کھانوں ، گانے والیوں اور لونڈیوں کے متعلق ایک دوسرے سے پوچھتے۔

● اور جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ منصب خلافت کی زینت بنے تو لوگوں کی آپس میں اس قسم کی گفتگو ہوتی۔قرآن کتنا یاد کیا؟۔۔۔ ہر رات کتنا ورد کرتے ہو؟۔۔۔ کتنے نوافل پڑھتے ہو؟۔۔۔فلاں شخص مہینے میں کتنے دن روزے سے رہتا ہے؟ کسی نے سچ کہا ہے۔

’’ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ ‘‘ کہ لوگ اپنے حکمرانوں کے طریقے پر چلا کرتے ہیں (سنہرے اوراق ۳۰۹ از تحفۃ الائمۃ ۲۷۲)۔

اس لیے کہا گیا۔شعر۔

مِنْ مَعْشَرٍ سَنَّتْ لَھُمْ آبَاءُ ھُمْ	وَلِکُلِّ قَوْمٍ سُنَّۃٌ وَاِمَامُھَا

ہم وہ لوگ ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے ہمارے لیے اچھے طریقے بنا کر دئے ہیں۔

اور ہر قوم کے لیے کچھ اچھے طریقے اور اس کے امام (بزرگ) ہوتے ہیں۔ کیا آپ اپنی قوم کے امام نہیں؟

امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ آیت شریفہ " وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ " (سورۃ النمل ۱۷) کے تحت فرماتے ہیں کہ اس آیت سے دو مسئلے ثابت ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ کہ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ امام وحکام کو چاہیے کہ وہ ایسے محافظ ونگراں مقرر کریں جو لوگوں کو ظلم وگناہ سے روکیں۔

پھر لکھا ہے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے وہ فرماتے تھے " مَايَزَعُ الْإِمَامُ أَكْثَرُ مِمَّا يَزَعُ الْقُرْآنُ کہ قرآن "لوگوں کو" جتنا "ظلم وگناہ" سے روکتا ہے یا روک سکتا ہے اس سے زیادہ امام روکتا یا روک سکتا ہے۔ ابن قاسمؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام مالکؒ سے پوچھا "یَزَعُ" کیا ہے؟ تو جواب دیا روکنا۔ (تفسیر قرطبی ۱۳/۱۶۸)۔ کیا امامت صغریٰ کے آپ مالک نہیں، کیا گناہوں سے روکنے کی ذمہ داری آپ پر نہیں؟؟؟

امام کے اسی کردار کی وجہ سے کہ وہ گناہوں سے بچاؤ کا ذریعہ ہے احادیث مبارکہ میں امام (سلطان) کی مدح وتعریف کی گئی ہے۔ ارشاد ہے: حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے ۔ " مَنْ أَهَانَ سُلْطَانَ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ أَهَانَهُ اللّٰهُ" (ترمذی) " وَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ يَكُوْنُ عَلَيْكُمْ أُمَرَاءُ يُفْسِدُوْنَ وَمَا يُصْلِحُ اللّٰهُ بِهِمْ أَكْثَرُ"۔ ترجمہ: تم پر (حاکم ہوں گے ایسے) امراء (جو خود تو) برے ہوں

گے، لیکن اللہ تعالیٰ ان سے جو اصلاح کا کام لیں گے وہ بہت زیادہ ہوگا۔

امام العارف ابو محمد سہل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا کہ لوگوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ فرمایا بادشاہ ان سے لوگوں نے کہا ہم تو ان کو شر الناس سمجھتے ہیں تو فرمایا اللہ تعالیٰ جب مسلمانوں کے مالوں کی اور ان کے کنواروں کی سلامتی کو (جو ان بادشاہوں کی وجہ سے حاصل ہوئی ہو) دیکھے گا تو ان کے تمام گناہوں کو معاف کر دے گا ''ینظرُ اللہُ فِی سَلامۃِ اَموالِ المُسْلِمِینَ وَاَبکَارِھِم فَیَغفِرُ لہ جَمِیعَ ذُنوبِہٖ'' اس میں ابکار بکر کی جمع ہے جس میں کئی معانی کا احتمال ہے۔

اور فرمایا ان (بادشاہوں) کے دروازوں پر پڑی ہوئی سیاہ لکڑی مسجد میں وعظ کرنے والے ۷۰ واعظین کے وعظ سے زیادہ کارگر ہے ''الخشباتُ السُّودُ المعلقۃُ علی اَبوابِھِمْ اَنفعُ لِلمسلمِینَ مِن سَبعِینَ قاصًا یَقُصُّونَ فِی المسجِدِ''۔ اس میں سیاہ لکڑی سے یا تو تنبیہ کے لیے رکھی ہوئی لکڑی یا کوڑا مراد ہے یا ان کی سختی سے کنایہ ہے۔ اور حضرت نے یہ بھی فرمایا ''الخَلِیفۃُ اِذا کَانَ غیرَ صَالِحٍ فَھُوَ مِنَ الاَبدالِ وَاِذَا کَانَ صَالِحًا فَھُوَ القُطبُ الَّذِی یَدُورُ عَلیہِ الدُّنیا'' !!! اللہ اکبر کیا عجیب بات ہے۔ (نبراس شرح شرح العقائد ۳۲۳)۔

امام کے بارے میں یہ خیال بالکل بجا ہے۔ '' اَنَّ الاِمَامَ لَہٗ سُلطَانًا عَلیٰ الْقُلُوبِ کَمَا اَنَّ الحُکّامَ لَھُمْ سُلطَانًا عَلیٰ الاَجْسَامِ''۔ پھر تو ائمہ حضرات کو اپنے مقام و ذمہ داری کا خوب لحاظ رکھ کر اپنے مقتدیوں کی اچھی طرح اصلاح کرنی چاہیے۔ اصلاح آپ حضرات کا ذمہ بھی ہے اور آپ کا حق بھی۔ لہٰذا اولاً اللہ تعالیٰ سے گذشتہ کوتاہیوں پر خصوصی توبہ فرمائیں اور آئندہ ان ذمہ داریوں کو نبھانے کی پوری کوشش فرمائیں، اور بطور خاص مسلمانوں کی صفوں میں بھرپور

اتحاد واتفاق پیدا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ہر قدم پر آپ کی مدد فرمائیں اور آپ کے ہاتھوں قوم کو اصلاحی چوٹیوں پر پہنچائیں۔ آمین۔

قرآن کریم اور گورنری

احادیث مبارکہ کی روشنی میں یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ مملکت اسلامیہ میں ''شرعی طور'' پر قرآن کریم کے حاملین، اس کے علوم کے ماہرین، مستحق گورنری ہوتے ہیں۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے علامہ بغوی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے معالم التنزیل میں تحریر کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت نافع بن حارث رضی اللہ عنہ کو مکہ کا گورنر مقرر کیا تھا، اتفاق سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے مقام عُسفان میں ملاقات ہوگئی تو ان سے پوچھا کہ تم نے اس وقت مکہ میں (یہاں آنے سے پہلے) اپنا نائب گورنر کس کو مقرر کیا ہے؟

حضرت نافع رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ ابن ابزیٰ (عبدالرحمن بن ابزی) کو حضرت عمرؓ نے تعجب سے فرمایا کہ تم نے ایک غلام کو گورنر بنایا؟ حضرت نافع رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے امیر المومنین یہ شخص قرآن کا سب سے زیادہ پڑھا ہوا عالم ہے اور فرائض قرآن سب سے زیادہ جاننے والا ہے اور قرآن کے مطابق فیصلہ کرنے میں سب سے زیادہ ماہر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا (یہ شخص پھر تو گورنری کا مستحق ہے) سن لو تمہارے نبی ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''إِنَّ اللهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ'' (مرقات ۳۳۸/۴)۔

غور وتدبر: قرآن کریم کا علم اگر آدمی کو گورنری کے منصب پر فائز کرسکتا اور اس کا اہل بنا سکتا ہے کہ جس سے دینی ودنیوی امور کا منتظم ہو تو امامت کا منصب آدمی کو اس درجہ پر کیوں فائز نہیں کرسکتا اور اس کا اہل کیوں نہیں بنا سکتا کہ وہ اس سے دنیوی انتظامات نہ

سبھی دینی امور کا انتظام کر سکے۔

خصوصاً جب کہ اس کی پیروی کا حال یہ ہے کہ ایک بچہ بالغ ہونے سے لے کر موت تک پنج وقتہ نمازوں اور جماعت کو اس کے پیچھے ادا کرتا ہے اور کمال یہ ہے کہ کسی دن ناغہ ہونے کا نام نہیں۔

چناں چہ اس طرح کی خبر دوسری حدیث شریف میں بھی موجود ہے ”لَوْ اَنَّ اَھْلَ الْعِلْمِ صَانُوا الْعِلْمَ وَوَضَعُوْهُ عِنْدَ اَھْلِهٖ لَسَادُوْا بِهٖ اَھْلَ زَمَانِهِمْ“ (مشکوۃ ۳۷) کہ اہل علم (علماء وائمہ) اگر علم کی حفاظت وصیانت کریں (اس طرح کہ اپنے آپ کو حب جاہ ومال اور اس کی طمع سے بچائیں) اور اس علم کو اس کے اہل پر خرچ کریں اور ان کو سکھائیں جو اس کے اہل (طالب) ہوں تو وہ اپنے زمانہ کے آقا وسردار بنے رہیں (اگر چہ یہاں دنیوی حکومت کا حاصل ہونا مراد نہیں) ایسے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ماسواء کو ان کے زیر قدم اور زیر قلم اور ان کے عقل واحکام کے تابع بنادے۔ ”لِاَنَّ مِنْ شَاْنِ اَھْلِ الْعِلْمِ اَنْ یَکُوْنَ الْمُلُوْكُ فَمَنْ دُوْنَهُمْ تَحْتَ اَقْدَامِهِمْ وَاَقْلَامِهِمْ وَطَوْعَ اٰرَائِهِمْ وَاَحْکَامِهِمْ“ (مرقات ۱/۳۱۰)

اس بارے میں جب مسائل اعتقادیہ کی طرف جھانکتے ہیں تب بھی اس مسئلہ کی کچھ نہ کچھ اصل وجڑ ہاتھ لگتی ہے۔ کہ نصب امام واجب ہے، شرط یہ ہے کہ تنفیذ احکام پر قدرت حاصل ہو۔ لیکن یہ کامل امارت کی شرط ہے۔ اگر کامل امارت نہ بھی پائی جائے تو اس سے کلی وجوب ساقط نہیں ہوتا بل کہ اپنی مقدرت وبساط کے بقدر اس کی ادائیگی لازم ہوگی (علامہ سید سلیمان ندویؒ ہماری ملی ذمہ داریاں)۔ اس سے بھی قوم میں سب سے زیادہ مسؤل امام کا مسئلہ مترشح ہوتا ہے، کیوں کہ یہ امامت بھی امامت کبریٰ کی شاخ ہے۔

ائمہ حضرات کی ذمہ داریوں پر مشتمل ان بحثوں کی مراد یہ نہیں کہ وہ ایک حاکم وقت

کی طرح مسلمانوں کے جملہ امور کے مالک ہیں اور وہ ان کے ذمہ دار ہیں، نہیں بل کہ اپنی بساط کے بقدر نمازوں کے ساتھ ان پر ذمہ داری یہ ہے کہ بقاء دین اور ترویج دین کے مختلف مراحل وادوار کو عمل میں لائیں کوئی موقع ہاتھ سے ایسا نہ چھوڑیں جس سے دینی افادہ ممکن ہو اور افادہ سے رہ جائے۔

سیرت طیبہ پر ایک نظر اور احساس ذمہ داری

سرکار مدینہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی کیسی، کتنی، کن کن جگہوں، کن کن اوقات میں اور کن کن چیزوں میں خبر گیری کی ہے اس کی کچھ جھلک پیش کی جاتی ہے، تاکہ ہمیں اس مبارک اسوہ سے آپ کی اتباع کرنا آسان ہو۔

تو آیئے اور غور کیجئے کہ آپ نے کبھی تو کمال وضو کا حکم دیا۔ "اَسْبِغُوا الْوَضُوْءَ---ایڑھیاں خشک رہ گئیں تو وعید سنائی "وَیْلٌ لِلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ"---وضوء کی فضیلت سمجھائی "اَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی مَا یَمْحُوا اللّٰہُ بِہِ الْخَطَایَا"--- طہارت میں انقطاع وسوسہ کا طریقہ سکھایا" اِذَابَالَ تَوَضَّأَ وَنَضَحَ فَرْجَہٗ"---نماز کی فضیلت کو درخت کے پتے جھڑنے سے سمجھایا "اَبُوْ ذَرٍّ رضی اللہ عنہ اَلْوَرَقُ یَتَھَافَتُ"---نماز کی صفوں کی درستگی سکھائی "سَوُّوْا صُفُوْفَکُمْ"۔

خلاد بن رافع ؓ کو تعدیل ارکان سکھائے اور دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم دیا "اِرْجِعْ فَصَلِّ فَاِنَّکَ لَمْ تُصَلِّ"---نماز کو اچھی طرح نہ پڑھا تو نماز کی چوری سے تعبیر کر کے نماز پر خوب دھیان دلایا "اِنَّ اَسْوَءَ النَّاسِ سَرِقَةً مَنْ یَّسْرِقُ مِنْ صَلٰوتِہٖ"---امام کے پیچھے مقتدی کو قراءت کرتے سنا تو انہیں یہ کہہ کر روکا "مَالِیَ اُنَازَعُ الْقُرْاٰنَ"---کبھی تو سواری پر (نفل) نماز پڑھنے کو سکھایا "یُصَلِّیْ فِی السَّفَرِ عَلٰی رَاحِلَتِہٖ"---کبھی باغات میں نماز پڑھ کر

اس کی پسندیدگی ظاہر فرمائی "یَسْتَحِبُّ الصَّلٰوۃَ فِیْ حِیْطَانٍ اَیِ الْبَسَاتِیْنِ"۔۔۔
ابوبکرۃ صحابیؓ کو صف میں ملنے سے پہلے رکوع کرتے ہوئے شامل ہونے سے روکا اور فرمایا اللہ تمہاری نیکی کی حرص میں اضافہ فرمائیں لیکن آئندہ ایسا نہ کرنا۔۔۔ جب حضرت معاذؓ نے سورۃ بقرہ پڑھ کر نماز طویل کر کے پڑھائی تو سورۃ الشمس اور والضحیٰ پڑھنے اور نماز کو خفیف پڑھانے کی تاکید فرمائی۔۔۔ اسی طرح قرآنی آیات، دعائیں، تشہد اور قنوت وغیرہ سب کچھ سکھایا۔۔۔ یہ اور ان کے علاوہ بہت سی اصلاحات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائیں، یہ اصلاحات تو صرف نماز سے متعلق ہیں جو ہم نے بطور نمونہ پیش کی ہیں۔۔۔

اور نماز کے علاوہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصلاحات اور راہ نمائی فرمائی وہ تو بے شمار ہیں البتہ بطور نمونہ چند کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً: کہیں تو آپ نے دین میں نئی بات پیدا کرنے سے منع فرمایا اور اس کی مذمت فرمائی "مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا"۔۔۔ ظلم کرنے سے سختی سے روکا "اِتَّقُوْا الظُّلْمَ فَاِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ"۔۔۔ دلوں میں گذرنے والے خطرات سے باخبر کیا کہ کبھی شیطانی ہوتے ہیں اور کبھی فرشتہ کی جانب سے "لَمَّةُ الْمَلَكِ وَلَمَّةُ الشَّيْطَانِ"۔۔۔ کسی نے قیامت کے متعلق سوال کیا کہ کب آئے گی تو آپ نے اس کی تیاری کا سوال فرما کر، سوال سے عمل کی طرف پھیر دیا "مَتَى السَّاعَةُ قَالَ وَيْلَكَ وَمَا اَعْدَدْتَ لَهَا"۔ اپنے حالات میں تقدیر پر اعتماد کر کے حالات سے نہ گھبرانا سکھایا۔ "جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا اَنْتَ لَاقٍ"۔

دین کی جڑ اور اس کی بنیاد بتائی "اَلَا اَدُلُّكَ بِرَاْسِ الْاَمْرِ وَعَمُوْدِهٖ"۔۔۔ کبھی کارآمد باتیں بتائیں "اَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى اَبْوَابِ الْخَيْرِ"۔۔۔ عذاب قبر سے واقف کیا اور اس سے ڈرایا

"مَرَّ النَّبِیُّ ﷺ بِقَبْرَیْنِ فَقَالَ اِنَّهُمَا لَیُعَذَّبَانِ"۔۔۔کہیں حضور ﷺ کے دائیں بائیں ہاتھ کے علیحدہ کام سے ان کے صحیح استعمال کی طرف راہ نمائی فرمائی گئی "کَانَتْ یَدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ الْیُمْنٰی لِطُهُوْرِهٖ وَطَعَامِهٖ"۔

کبھی انسانی بھیڑئے سے باخبر کر کے اپنی امت کو ہلاکت سے بچایا "اَلشَّیْطَانُ ذِئْبُ الْاِنْسَانِ"۔۔۔کبھی انفاق مال کی طرف توجہ دلائی "اَنْفِقْ یَا بِلَالُ وَلَا تَخْشَ"۔۔۔حتی کہ معمولی چیز کے صدقہ کو بھی یوں فرما کر سراہا کہ چاہے بکری کا کھر ہی ہو "یَا نِسَاءَ الْمُسْلِمَاتِ لَا تَحْقِرَنَّ جَارَةً"۔۔۔بائیں جانب اور اپنے پیروں کے نیچے تھوکنا سکھایا "وَلْیَبْصُقْ عَنْ یَسَارِهٖ اَوْ تَحْتَ قَدَمِهٖ"۔۔۔موزے پر مسح کرنا سکھایا۔فتح مکہ کے وقت موزے پر مسح کرنے پر پوچھا گیا تو فرمایا میں نے قصدا کیا ہے جس کی غرض سکھانا تھا "عَمْدًا صَنَعْتُهٗ"۔

بس اس طرح کہیں جہاد۔۔۔اخوت و بھائی چارگی۔۔۔ذکر اللہ کی کثرت۔۔۔تعلیم و تعلم۔۔۔تقویٰ و توکل۔۔۔ریاضت و مجاہدہ۔۔۔صلہ رحمی۔۔۔شفقت و رحمت وغیرہ پر آمادہ فرمایا۔۔۔کہیں عورتوں۔۔۔والدین۔۔۔راستوں۔۔۔حاکم۔۔۔جانوروں وغیرہ کے حقوق سمجھائیں۔۔۔اور مالداروں کو انفاق مال۔۔۔غرباء کو قضاء قدر پر اعتماد۔۔۔پردہ نشین عورتوں کو عصمتوں کی حفاظت۔۔۔عورتوں کو کثرت صدقہ۔۔۔کسانوں، تاجروں وغیرہ کو حلال رزق حاصل کرنا۔۔۔مزدوروں کو امانت داری سے کام کرنا اور ان کی اجرت پسینہ خشک ہونے سے پہلے دینا وغیرہ سب ہی کچھ سکھایا۔

ان طبقات کے افراد کو نہ صرف احکام و مسائل سکھائے۔بل کہ ان کے آسان طریقے۔ان کے فضائل۔ان کی تدابیر۔ان کے مصالح و حکم۔ان کے علوم و معارف۔ان کی فکر

دسوچ اوران اعمال کی صحت وخرابی اوران کی کمی وکوتاہی وغیرہ سب ہی کوکھول کھول کر بتایا۔

حتی کہ آپ ان چیزوں کے سکھانے کا مطلب یہ نہیں سمجھتے تھے کہ صرف ایک مرتبہ انہیں بتادیا تو کافی ہوگیا، بل کہ آپ اس کی اس وقت تک نگرانی بھی فرماتے تھے جب تک ٹھیک سے عمل پر نہ آتا۔ اوران چیزوں کو واقع فی النفس کے لیے آپ مختلف اسالیب بھی اختیار فرماتے کبھی انگلیاں ۔۔۔ ہاتھ۔۔۔ کندھا پکڑ کر۔۔۔ کبھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر۔۔۔ یا تو اظہار محبت میں۔۔۔ یا سوال کے ذریعہ مثلا میری امت کا مفلس کون ہے؟ ''اَتَدْرُوْنَ مَنِ الْمُفْلِسُ؟''۔ یا حسی مثال کے ذریعہ مثلا درخت کی ٹہنی کو حرکت دے کر۔

ان چیزوں کو سکھانے کے لیے کبھی تو نماز پنج گانہ کے اوقات پسند فرمائے۔۔۔ اور کبھی تو جمعہ اور عیدین کے۔۔۔ اور کبھی حسب موقع ان اوقات مذکورہ کا انتظار بھی گوارا نہیں فرمایا بل کہ بے وقت ''اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ'' سے منادی کرا کر سب کی حاضری میں ہدایت فرمائی۔

جیسے ایک شخص کھلے میدان میں برہنہ غسل کر رہا تھا تو منادی کے بعد منبر پر تشریف فرما کر ہدایت کی '' اَللّٰہُ حَیِیٌّ سِتِّیْرٌ یُحِبُّ الْحَیَاءَ وَالتَّسَتُّرَ ''۔ اور قوم مضر کا واقعہ جب وہ آپ ﷺ کی خدمت آئے توان کے فقر وفاقہ کو دیکھ کر منبر پر تشریف لے جا کر صدقہ کی ترغیب دی۔ اوران کی تعلیم میں مصروفیت سے آپ کی سنت الظہر بھی پڑھنے سے رہ گئی۔ کبھی تو پیش آمدہ باتوں پر راہ نمائی کے لیے مسجد جانے کی مہلت بھی گوارا نہیں فرمائی بل کہ موقعہ واردات پر ہی بالمشافہ۔۔۔ یا تو راستوں۔۔۔ پہاڑوں۔۔۔ سواریوں پر یا بازاروں۔۔۔ جنگلوں۔۔۔ باغات۔۔۔ کھیتیوں اور گھروں میں راہ نمائی فرمائی پھر یا تو رات میں یا دن میں علی الصبح بھی۔ وقت آخر بھی۔ سوتے اٹھتے بھی صراحتاً واشارۃً بھی باوضوء اور بے وضو بھی۔

بحث مذکور کا خلاصہ

ان تفصیلی گوشوں سے معلوم ہوگیا کہ آں حضرت ﷺ نے منصب امامت پر رہ کر مقتدیوں کی نہ صرف نمازوں کی صحت وفساد کی نگرانی کو اپنی ذمہ داری سمجھا ہے بل کہ نماز کے علاوہ ہر حال میں ہر جگہ ہر چیز میں اصلاح وراہ نمائی کو اپنی ذمہ داری سمجھا ہے۔ ان کو پڑھ کر کون یہ سمجھے گا کہ آپ ﷺ کے نائبین کا کام صرف نماز پڑھنا اور پڑھالینا اور جمعہ قائم کردینا ہے۔

جب ائمہ حضرات نے اپنے فرائض منصبی کو فراموش کردیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ غیر عالم بل کہ بے نمازی بے ریش اراکین مساجد بھی ان پر سوار ہو گئے۔ اگر وہ اپنے فرائض کو انجام دیتے تو نمازوں کی طرح خارج نماز میں بھی لوگ ائمہ حضرات کے تابع ہوتے اور ان کی راہ نمائی کو باعث شرف خیال کرتے اور ان کو حقیقی پیشوا سمجھتے۔

لہٰذا ائمہ حضرات آپ ﷺ کے نائب بن کر نئے جذبات لے کر اٹھیں اور انتھک محنت کے ذریعہ مثالی اصلاح وفکر فرما کر معاشرہ کو مثالی بنانے کی بھرپور کوشش کریں۔ اصلاح کرنا آپ کی ذمہ داری بھی ہے اور آپ کا حق بھی۔ اللہ تعالیٰ مٹتے دین کو زندہ کرنے میں حضور ﷺ کی اتباع کی ہمیں توفیق نصیب فرمائیں۔ آمین۔

مختصر طریقہ کار برائے ائمہ!!!

ہم نے ائمہ حضرات کو صرف ذمہ داری کا احساس ہی نہیں دلایا بل کہ خالص بفضل تعالیٰ ان کی کام کے لحاظ سے پوری راہ نمائی بھی کی ہے، اور اصلاح امت اور اصلاح معاشرہ کے مختلف طریقہ کار بتانے میں سیر حاصل مباحث بھی پیش کیے ہیں جو ان شاء اللہ حصۂ دوم میں آئے چاہتے ہیں۔ اسی حصہ دوم سے ائمہ کی صرف ہمت افزائی کے لیے طریقۂ اصلاح کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

اصل طریقۂ کار سے متعلق ایک ضروری انتباہ یہ ہے کہ ابھی آپ اس اصلاحی کام اور اس کے امور کا تذکرہ جمعہ کے خطاب میں نہ کریں، کیوں کہ اب ایمانی ضعف اس درجہ پایا جارہا ہے کہ بیانات کو سننا بھی من جملہ رسومات میں سے ایک رسم بن چکا ہے، بل کہ اگر کہا جائے کہ گاہِ گاہِ بیان کرنا بھی ایک رسم بن چکا ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائیں غیبت مقصود نہیں لیکن اصلاحی توجہ کے ناتے کہنے پر مجبور ہوں کہ ایسے خطیبوں کو بھی سنا ہے کہ خطابت اپنی صریح دلالت میں صرف رسم کی ترجمان نہیں، ترجمان خواہشات نظر آتی تھی، حب جاہ وحب مال کی بو آتی تھی۔ العیاذ باللہ۔

مشروع ومسنون طریقہ اصلاح برائے ائمہ

(۱) نماز کے سلام پھیرنے کے بعد قبل الدعا آپ مصلیٰ پر کھڑے ہوکر منکر سے نہی کریں۔ روزانہ نہ کریں ایک دو ایک دو روز میں ایسا کریں۔ جب آپ کسی کو کوئی خلاف شرع کام کرتے دیکھیں یا سنیں تو نام لیے بغیر عام اور حسین اسلوب میں ممانعت کریں۔

(الف) ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز کافی تاخیر سے پڑھائی اور ہلکی بھی پڑھائی، جب سلام پھیرا تو بلند آواز سے فرمایا ''جس طرح تم لوگ بیٹھے ہو اسی طرح اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہنا'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بات ارشاد فرمائی جو مقصود تھی (مشکوۃ ۱۷)۔

(۲) ضرورت کے وقت اقامت کے بعد بھی قبل التحریمہ کہہ سکتے ہیں۔ روایت میں ہے صف میں ایک شخص تھوڑا آگے بڑھا ہوا تھا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو درست کھڑے رہنے کو فرمایا (عن نعمان مشکوۃ ۹۷) بل کہ بعض روایت میں تو صف میں جا کر درست کرنے کا بھی ذکر ہے۔

(۳) جب نہایت ہی اہم بات ہو تو منبر پر چڑھ کر بھی آپ کہہ سکتے ہیں منبر ہی کی وجہ سے

ممانعت کی اہمیت واضح ہوگی منبر کا استعمال صرف جمعہ کے خطبہ ہی کے لیے نہیں۔ایک شخص کھلے میدان میں برہنہ غسل کررہا تھا آپ ﷺ نے سب کو جمع کیا اور عام اسلوب میں اس کی سختی سے ممانعت فرمائی (عن یعلی مشکوۃ ۴۹)۔

منبر سے اصلاح کی دوسری روایات ملاحظہ ہو: عن ابی هريرة. على أعوادِ منبره (مشکوۃ ۱۲۱)۔عن عمارة على المنبر قال اجلسوا (مشکوۃ ۱۲۴)۔آں حضرت ﷺ اس وقت فرماتے جب کہ منبر پر ہوتے "مَابَالُ اَقوامٍ" قرآن میں عام اسلوب یوں ہے "فما بال القرُونِ الاولیٰ...

(۴) حیرت کی بات یہ ہے کہ معلم امت ﷺ نے تعلیم کی غرض سے نماز (صرف قیام ورکوع) بھی منبر پر پڑھائی ہے (عن سہل مشکوۃ ۹۹)۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ ابھی ہم اس آخری درجہ پر پہنچ جائیں جب کہ شروع کے درجات ہی کوئی نہیں جانتا۔ابھی ہم پہلے دو درجوں کو اختیار کریں حالات کا تفقد بھی مصلح کے لیے از حد ضروری ہے۔[1]

خطابت سے متعلق ضروری انتباہ

(۱) اگر بیان سے عوام کی ذہن سازی نہ کرسکیں تو اس میں کونسی فکر کی بات ہے، اسلامی مصادر میں کسی جگہ اس کی فرضیت ثابت نہیں۔دو چیزوں میں فرق سمجھیں خطابت مروجہ علیحدہ ہے اور

---

[1] اس وقت کتاب ہذا کی تالیف کا سبب بھی بندے کی اس طرح کی امامت سے دل کا داعیہ ہے۔ ۱۹۸۶ء میں فراغت کے بعد چند سال امامت کے دوران روزانہ ۱۵ منٹ دینی دلچسپی پر علمی، حکمتی، نکاتی گفتگو کرتا۔پھر دھیرے دھیرے شریعت "معرفات ومنکرات" پر لاتا، ہر چیز پر اہتمام سے قرآن وحدیث، سیرت اور اسلاف کے حالات پیش کرتا، لوگوں میں اس قدر رغبت پیدا ہوئی کہ بازاروں سے آنے والا طبقہ مزید ۱۵ منٹ رک جاتا، بل کہ دوسری مساجد کے نمازی بھی وہاں آتے جس کا مثبت اثر خواتین پر بھی ہوتا۔وللہ الحمد۔

ذہن سازی علیحدہ۔ خطابت ضروری نہیں ذہن سازی کافی ہے، تبلیغی عوام حضرات۔ ماشاء اللہ۔ وجزاہم اللہ۔ ایسی ذہن سازی کر لیتے ہیں کہ پھر چلہ و چار ماہ کی لوگ تیاری بھی بتاتے ہیں یہ ہے ذہن سازی کیوں کہ وہ واقع میں فکر دین فکر امت میں غرق ہوتے ہیں۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کاغذ پر خود لکھ کر یا کسی رسالہ سے فکری مضمون مطالعہ کے بعد سنا دیں

(۳) اپنے یہاں کے مؤقر عالم سے کام لیں۔

(۴) دوسری مسجد کے امام صاحب کو نوبت بنوبت بلا کر کام نکال لیں۔ اس قدر طریقے ہوتے ہوئے گھبرانے کی کیا ضرورت۔

(۵) فرض کر لو کہ واقع میں کسی بھی طریقہ کی گنجائش (باوجود خلوص وقلوب کی گنجائش کے) نہیں تو دعا تو کر سکتے ہیں، دل کو بے قرار تو بنا سکتے ہیں بس دعا کرو اور اتنی کرو کہ اللہ تعالیٰ نظام مساجد اور منصب امامت کے اہداف کو زندہ فرما دیں۔

خاتمۂ کتاب میں آخری دو باتیں

کام شروع کرنے سے پہلے ذاتی انقلاب ائمہ اگر واقعۃً کام کا ارادہ رکھتے ہیں تو مؤثر اور مجرب طریقہ یہ ہے کہ پہلے اپنی ذات میں ماضی کے مقابلے میں کچھ نہ کچھ ضرور انقلاب لائیں۔ مثلاً اپنا یقین اللہ تعالیٰ کی ذات پر باندھ لیں، اس پر توکل ضرور پیدا کر لیں۔۔۔ مخلوقات سے امید وخوف ختم کر دیں اور ان کے تاثرات کو مٹا دیں۔۔۔ اپنی نمازوں اور دعاؤں میں بالقصد وبا تکلف جان پیدا کریں۔۔۔ سنتوں کو بالعظمت والعبادت اختیار کریں۔۔۔ اور اخیر میں فکر دین فکر امت تھوڑی بہت ضرور پیدا کریں۔۔۔ دل میں اس کی کچھ نہ کچھ سیٹنگ ضرور کریں پھر کام شروع کریں۔

دوسری بات مقصد کے مقصد سے آگاہی: ہر چیز کا ایک مقصد ہوتا ہے لیکن گہرائی میں جا کر دیکھیں تو اس مقصد کا بھی مقصد ہوتا ہے مثلاً کائنات کی تخلیق کا مقصد خدمت انسان ہے لیکن خود تخلیق انسان کا مقصد عبادت خداوندی اور اس کی صحیح معرفت ہے، بس اسی طرح اس تالیف کا مقصد نظام مساجد اور منصب امامت کو خیر القرون کے نہج پر لانا ہے اور یہ آخری مقصد نہیں اس کا بھی مقصد اصلاح امت اور اصلاح معاشرہ کرتے ہوئے ان کی بے مثال تعمیر ہے۔

اگر آپ نے خاتمۂ کتاب کی ان باتوں کو ''عملاً'' اختیار کر لیا تو آپ مقتدیوں اور منتظمین مساجد کے زیر اثر اور ان کے غلط دباؤ سے آزاد بھی ہو جائیں گے اور ''مافوق التصور'' بلند مقام کے مالک بھی ہوں گے بایں معنیٰ کہ لوگ آپ کو خارج مسجد بھی اپنا امام وقائد تسلیم کرتے ہوئے اپنی پلکوں پر بٹھائیں گے۔ وماذلك على الله بعزيز۔

اب دعا فرمائیں۔ میری دعا پر آپ آمین فرمائیں۔

رَبَّنَا اٰتِنَا (جَمِيْعًا) فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ آمین۔

يَارَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

تمت بحمد اللہ تعالیٰ

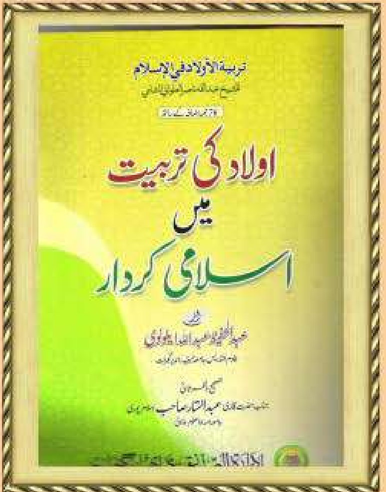
مراجع ومصادر

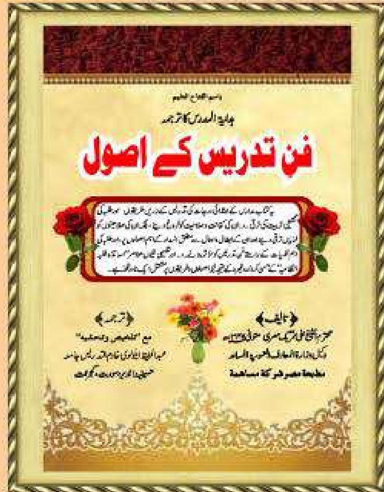
اسماء الکتب	اسماء المصنفین	مطبع ومکتبہ
قرآن شریف		
ابن ماجہ شریف	ابو عبد اللہ محمد بن یزید قزوینی	اشرفی بک ڈپو دیوبند
ابن حبان	حافظ محمد بن حبان ابو حاتم	دار الکتاب العلمیۃ بیروت
ابو داؤد شریف	ابو داؤد حافظ سلیمان الاشعث سجستانی	بلال بک ڈپو، رشیدیہ دھلی
احیاء علوم الدین	حجۃ الاسلام امام غزالی	رشیدیہ کوئٹہ
احسن الفتاویٰ	مفتی رشید احمد لدھیانوی	ایچ ایم سعید کمپنی کراچی
اسلام اور جدید معاشی مسائل	شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی..	
اسلام کا نظام مساجد	مولانا ظفیر الدین پورقنوڈیھاوی	دائر دار الاشاعت کراچی
اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ	ابو الحسن عز الدین علی بن محمد جزری	طھران
اصلاحی خطبات	شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی	میمن اسلامک پبلیشرز کراچی
اعلام الموقعین	ابو عبد اللہ محمد بن ابوبکر ابن قیم جوزیہ...	مصر
امام اعظم کے حیرت انگیز واقعات	مولانا عبد القیوم حقانی	مکتبہ یادگار شیخ سہارنپور
آسیب کا علاج	مفتی رشید احمد لدھیانوی	دار الافتاء والارشاد کراچی
بخاری شریف	ابو عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری	یاسر ندیم دیوبند، نور محمد دھلی
البدایۃ والنھایۃ..	حافظ ابن کثیر دمشقی	مکتب التحقیق/لاھور
تاریخ کبیر	ابو عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری	حیدر آباد
تبلیغ بالیقین کار نبوت ہے	مولانا حافظ محمد احمد	فیصل دھلی
تحفۃ الائمۃ	مولانا محمد حنیف عبد المجید	یوسفیہ دیوبند
ترمذی شریف	ابو عیسیٰ محمد عیسیٰ	کتب خانہ رشیدیہ دھلی
تراشے	شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی	جاوید دیوبند
ترجمہ مفتاح العارفین	حضرت سلطان باھو	لاھور پاکستان
ترجمہ مفتاح اللطائف	خواجہ محمد اسلم بن خواجہ جلال الدین	لاھور پاکستان
ترجمہ انتباہ المریدین	حضرت شیخ محمد چشتی	لاھور پاکستان
ترجمہ اسرار الطریقت	شاہ محمد غوث بن سید قادری	لاھور پاکستان
ترجمہ اورنگ شاھی	حضرت سلطان باھو	لاھور پاکستان
تزکیہ واحسان	شیخ ابو الحسن علی الندوی...	مجلس تحقیقات لکھنؤ
التعلیق الصبیح	مولانا ادریس کاندھلہ	فخریہ دیوبند
تفسیر الجامع لاحکام القرآن	ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی	بیروت لبنان
تفسیر مفاتیح الغیب	امام فخر الدین رازی....	محمد عبد الرحمن جامع ازھر قاھرہ
تفسیر لابن الکثیر	حافظ ابن کثیر	دار المعرفۃ بیروت لبنان
تفسیر روح المعانی	شھاب الدین سید محمد آلوسی بغدادی	بیروت لبنان
تفسیر معارف القرآن	مفتی شفیع پاکستانی	رشیدیہ سہارنپور

تفسیر معارف القرآن	مولانا ادریس کاندھله	فرید بک ڈپو دیوبند
جامع بیان العلم	ابن عبد البر اندلسی	دار الکتب العلمیة/مصر
جمع الفوائد	محمد بن محمد بن سلیمان	مصر
جواہر الفرائد (شرح عقائد)	مفتی محمد یوسف تاؤلوی	تھانوی دیوبند
جواہر مجددیہ	سوانح شیخ احمد سرھندی	لاہور پاکستان
حلیة الاولیاء	ابو نعیم	دار الفکر
حیاۃ الصحابة عربی	مولانا محمد یوسف کاندھله	دار القلم دمشق حلبون
خطبات حکیم الامت	مولانا اشرف علی تھانوی	اشرفی بک ڈپو دیوبند
خیر القرون کی درسگاہیں	قاضی اطہر مبارک پوری	فرید بک ڈپو دیوبند
دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات	قاری ابو الحسن اعظمی	مکتبہ صوت القرآن دیوبند
دین وشریعت	مولانا محمد منظور نعمانی	الفرقان بک ڈپو لکھنؤ
روضة الصالحین	مولانا محفوظ الحسن سنبھلی	مکتبہ عالیہ دھلی
	خلاصہ وترجمہ	
تنبیہ الغافلین	فقیہ ابو اللیث سمرقندی	
رسالہ ختم نبوت	صاحب مقالہ مولانا محمد یوسف بنوری	عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت
سراج السالکین ترجمہ	ریاض الصالحین۔ امام غزالی	لاہور پاکستان
سنن بیہقی	ابوبکر احمد بن حسین بیہقی	دار المعرفة/المعارف
سنہرے اوراق	عبد الملک مجاہد	دار الاسلام پاکستان
سیرت ابن ہشام	عبد الملک بن ہشام بصری	مصر
شامی	علامہ ابن عابدین شامی	ایچ ایم۔سعید کمپنی کراچی
شرح العقائد	علامہ سعد الدین تفتازانی	رشیدیہ دھلی
شرف اصحاب الحدیث	خطیب بغدادی	ترکی
الطبرانی (المعجم الکبیر)	علامہ طبرانی	کراچی
طبقات ابن سعد	محمد بن سعد واقدی بغدادی	بیروت/ کراچی
علماء دیوبند (عربی)	قاری طیب۔ تعریب مولانا نور عالم	دار العلوم دیوبند
العلم والعلماء	مرتب مولانا محمد زین افادات از تھانوی ؒ	ادارۃ افادات اشرفیہ بأندة
عقود الجمان فی مناقب النعمان	شمس الدین محمد بن یوسف دمشقی	حیدرآباد
غم نہ کریں ترجمہ لاتحزن	مترجم غطریف شہباز	دار العالمیة الریاض
فتاویٰ عالمگیری	اورنگ زیب عالمگیر	رشیدیہ کوئٹہ بلوچستان
فتاویٰ دار العلوم	مفتی عزیز الرحمن لدھیانوی	دار الاشاعت کراچی
فتاویٰ رحیمیہ	مفتی عبد الرحیم لاجپوری	دار الاشاعت کراچی
فتح القدیر	کمال الدین محمد بن عبد الواحد	ذکریا دیوبند
فضائل اعمال ۱-۲	شیخ زکریا کاندھله	دینیات ممبئی
الفقیہ والمتفقہ	خطیب بغدادی	بیروت
فیوض الحرمین	شاہ ولی اللہ محدث دھلوی	
فیض ابرار	بیانات شیخ ابرار احمد دھلیوی	باہتمام مولانا محمد اقبال زامبیا
فیض القدیر	علامہ مناوی	دار الباز
قدوری	احمد بن محمد بن جعفر	یاسر ندیم اینڈ کمپنی دیوبند
قومہ وجلسہ میں اطمینان کا وجوب	مولانا فضل الرحمن اعظمی	مکتبہ النور کراچی

کاروان زندگی	شیخ ابو الحسن علی الحسنی الندوی	مکتبہ اسلام لکھنؤ
الکاشف عن حقائق السنن	حسین بن محمد بن عبد اللہ طیبی	ادارۃ القرآن کراچی
کتاب الصلوٰۃ	امام احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی	
کتاب الزھد	امام احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی	
کتاب الخطط والاثار	علامۃ المقریزی	مصر
کرامات امدادیہ	شاہ امداد اللہ مہاجر مکی	کتب خانہ هادی دیوبند
کشکول معرفت	مولانا محمد حکیم اختر	کتب خانہ مظہری کراچی
الکفایۃ فی علم الروایۃ	خطیب البغدادی	حیدرآباد
کنز العمال	علاء الدین علی متقی	دار الکتاب العلمیۃ بیروت
ماہنامہ البلاغ	صاحب مقالہ قاضی اطہر مبارکپوری	صابو صدیق مسافر خانہ بمبئی
مجمع الزوائد	حافظ ابوبکر نور الدین	دار الفکر
المحدث الفاصل بین...	قاضی حسن بن عبد الرحمٰن رامهرمزی	بیروت
مرقاۃ المفاتیح (شرح مشکوٰۃ)	ملا علی قاری (طبع ۱۳۹۲)	امدادیہ ملتان نور محمد کارخانہ کراچی
مسجد کی آبادی کی محنت	مولانا محمد سعد کاندھلہ	نصیر بک ڈپو دھلی
مسلم شریف	ابو الحسن مسلم بن الحجاج القشیری	بلال دیوبند/رشیدیہ دھلی
مسند امام احمد	احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی	دار الفکر
مستدرک حاکم	محمد بن عبد اللہ حاکم نیسابوری	دار المعرفۃ/حیدرآباد
المساجد (عربی)	حسین مؤنس	المجلس الوطنی کویت
مسائل امامت	مولانا رفعت قاسمی	رضی دیوبند
مسائل امامت	مولانا غلام رسول منظور پھراوی	ثاقب بک ڈپو دیوبند
مشکوٰۃ شریف	ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ خطیب تبریزی	بلال دیوبند
مصنف ابن ابی شیبۃ	ابوبکر عبد اللہ بن محمد	دار الفکر بیروت/حیدرآباد
مظاہر حق جدید 3	محمد قطب الدین خان دھلوی	ادارہ اسلامیات دیوبند
معارف السنن	مولانا محمد یوسف بنوری	کراچی
معیار السلوک	مولانا هدایت علی نقشبندی جے پوری	الهدایت اسلامیک ریسرچ
مکتوبات امام ربانی	حضرت مجدد الف ثانی	سید احمد شہید لاہور
ملفوظات مولانا محمد الیاس	مولانا محمد منظور نعمانی	عزیزیہ دیوبند
مناقب الامام الاعظم	علامہ کردی	دائرۃ المعارف دکن ۱۳۲۲ھ
مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت	شیخ ابو الحسن علی الندوی	اریب پبلیکیشنز نئی دھلی
مواعظ عبیدیہ	مولانا محمد الیاس قاری بدیۃ الهی	کل ہند تنظیم المسلمین دھلی
النبراس شرح شرح العقائد	محمد عبد العزیز فرهاری	امدادیہ ملتان
نزهۃ النظر شرح نخبۃ	احمد بن علی عسقلانی	نور محمد آرام باغ کراچی
وحدت امت	مفتی محمد شفیع عثمانی	دار الاشاعت کراچی
هماری پریشانیاں اور ان کا حل	شیخ محمد منشاوی	بیت العلوم انار کلی لاہور
هماری ملی ذمہ داریاں	حضرت مولانا سید سلیمان ندوی	
هدایہ	برهان الدین علی بن ابی بکر مرغینانی	فیصل دیوبند/اشرفی بک ڈپو دیوبند
یاد ایام	مولانا حکیم سید عبد الحی	لکھنؤ

مؤلف کی دیگر کتابیں





طلب کے ٹھکانے :

مکتبہ احمدیّہ راندیر، سورت	99746 04855
مکتبہ احمدیّہ ایلول، سابر کانٹھا	99742 72192
کتب خانہ رشیدیہ چھاپی ہایوے بناس کانٹھا	99041 11938
مفتی رمضانی صاحب، گودھرا، پنچ محل، گجرات	85112 86164
جمعیت علماء دریاپور، احمد آباد	079-22169200
مولانا حمزہ صاحب، دیوا، دار العلوم، انکلیشور	94284 42151
مولانا شعیب صاحب ایلولوی بھاؤنگر	73833 13951
مدرسہ الیاسیہ منگرول پیرواشم (مہاراشٹر)	89755 14144
مولانا محبوب صاحب، ایلولوی، میگنگر (ایم، پی)	88190 56252
مولانا خالد سیف اللہ پالیہ مسجد (بنگلور ۲۱)	96119 38995

ائمۂ مساجد کے لیے : علمی فکری تربیتی اصلاحی بیش بہا تحفہ

نَھجُ الاَئِمَّة

فِی

اِصلَاحِ الاُمَّة

حصہ دوم



از : عبدالحفیظ ایلولوی (گجرات)

ناشر : مکتبہ احمدیّہ
جامعہ حسینیہ راندیر
مورابھاگل، راندیر، سورت، گجرات، انڈیا۔

باسم الفتاح العلیم ۔ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا

ائمۂ مساجد کے لیے : علمی | فکری | تربیتی | اصلاحی | بیش بہا تحفہ

نَہجُ الاَئِمَّۃ
فِی
اِصلَاحِ الاُمَّۃ

حصہ دوم

از : عبدالحفیظ ایلولوی (گجرات)

99746 04855

✵ تفصیلات ✵

نام کتاب　:　نَهجُ الْاَئِمَّةِ فِیْ اِصلَاحِ الْاُمَّةِ

جامع ومرتب:　مولانا قاری عبدالحفیظ صاحب ایلولوی

(خادم الحدیث والفقہ جامعہ حسینیہ راندیر، سورت)

تصحیح　:　(۱) جناب حضرت مولانا خالد صاحب

(استاذ الحدیث جامعہ حسینیہ راندیر، سورت)

(۲) برادر جناب امداد اللہ صاحب احمد آبادی

کمپوزنگ　:　مولانا ضیاء الرحیم رحیمی (ہدایت آرٹ، سگرام پورہ، سورت)

صفحات　:　۱۲۰

اول ایڈیشن　:　محرم ۱۴۳۹ھ بمطابق اکتوبر ۲۰۱۷ء

ناشر: مکتبہ احمدیہ،

جامعہ حسینیہ راندیر
مورا بھاگل، راندیر، سورت، گجرات، انڈیا۔

ایلول نزدِ نور مسجد، ہمت نگر، سابر کانٹھا، گجرات

99746 04855

مساجد اسلام کے روز اول سے مسلمانوں میں دینی سرگرمیوں اور غیر اقوام میں اسلامی اشاعت اور عام رشد و ہدایت کا مرکز رہی ہیں۔ مساجد اور اس کے منبر و محراب وہ مراکز ہدایت و مصادر ہیں جہاں سے ماضی میں ''کُوْنُوْا مِثْلَنَا'' کی صدائیں بلند ہوئیں۔ جب اسلام اپنی حقیقت کے ساتھ زندہ تھا تو مسجد صرف مسجد نہ تھی، وہ عبادت گاہ، تعلیمی مدرسہ، اصلاحی و تبلیغی مرکز، اہل اسلام کا دار الندوۃ اور دولت اسلامیہ کا دار القضا بھی تھی۔ اسلامی سارے نظام مسجد و امامت سے منسلک تھے۔ جیسا کہ ذیل کے جدول سے واضح ہو رہا ہے۔

نمبر شمار	احوالِ مختلفہ	منصبِ امامت	نظامِ مساجد
۱	مقتدا بن کر	قوم میں اطاعت خدا اور سول لانا	نظم طاعت واتباع
۲	امام بن کر	قوم کو مجتمع رکھنا	نظم وحدت واتحاد
۳	معلّم بن کر	قوم کو علم سے آراستہ کرنا	نظم تعلیم وتربیت
۴	مبلّغ بن کر	ایمانی جڑوں کو پانی دینا	نظم دعوت وتبلیغ
۵	حکیم وحاکم بن کر	نظریاتی کھائی کو پاٹنا	نظم مملکت وسیاست
۶	عابد بن کر	غفلت وسستی کو چاک کرنا	نظم عبدیت وبندگی
۷	مصلحِ بن کر	معاشرے کو صالح بنانا	نظم صلاح واصلاح
۸	داعی بن کر	اعلاء کلمۃ اللہ (بلند کرنا)	نظم اشاعتِ اسلام
۹	قاضی بن کر	تنازعات وجھگڑوں کو مٹانا	نظم مساوات واخوت
۱۰	ہادِی بن کر	دینی ودنیوی راہ نمائی کرنا	نظم ہدایت وشعور

مسجد و امامت کا مفہوم خیر القرون میں آج کے مفہوم سے زیادہ وسیع تھا۔ کتاب ہذا کا خاص مقصد نظامِ مساجد اور امامت کو خیر القرون کے نہج پر لا کر ائمہ مساجد کو فعّال بنا کر ان ہی کو اصلاح امت و اصلاح معاشرہ میں افراد ساز بنانا ہے۔

پیش لفظ

فقیہ عصر جناب حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم

مسجدیں اللہ کا گھر ہیں، اس لیے اللہ کے بھیجے ہوئے دین شریعت سے متعلق تمام کاموں کا مرکز بھی یہی مسجدیں ہیں، نماز باجماعت اور اعتکاف تو ایسا عمل ہے جس کو مسجد ہی میں انجام دینا واجب ہے، لیکن مسجد کا کردار ان دو اعمال تک محدود نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں مسجدیں درسگاہ بھی تھیں، یہیں تذکیہ واحسان کی بزم بھی آراستہ کی جاتی تھیں، اسی میں مسلمانوں کے باہمی مقدمات فیصل کئے جاتے تھے، یہیں سے فتاویٰ صادر کئے جاتے تھے اور مسائل شرعیہ کی رہنمائی ہوتی تھی، یہیں مجاہدین اسلام کے لشکر مرتب کئے جاتے تھے، یہیں سے احکام سلطنت جاری کئے جاتے تھے، اور اسی جگہ بیرونی سفراء اور وفود سے ملاقاتیں ہوتی تھیں، غرض کے مسجد مسلمانوں کا ہمہ جہت مرکز تھی، اور مسجد کا امام زندگی کے تمام مسائل میں مسلمانوں کا قائد اور رہنما ہوتا تھا۔

افسوس کہ جیسے زندگی کے دوسرے شعبوں میں اضمحلال آ گیا اور مسلمانوں کا عمل قرن اول سے ہٹ گیا، اسی طرح لوگوں نے مسجد کو نماز واعتکاف تک محدود کر دیا، اور ائمہ صرف پانچ وقتہ نماز کے امام سمجھے جانے لگے، نہ لوگوں میں یہ جذبہ باقی رہا کہ وہ زندگی کے تمام مسائل میں امام کو اپنا قائد ورہنما سمجھیں اور نہ ائمہ میں اپنے درجہ ومرتبہ اور مقام کا احساس باقی رہا کہ وہ صرف نمازوں کے امام نہیں ہیں، بلکہ مسلم معاشرہ کی پوری زندگی کے امام ہیں، آج مسلمان جس

بے دینی ، بے راہ روی اور معاملات اور سماجی زندگی میں شریعت سے غفلت کا شکار ہیں ، اس کا علاج اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ وہ مسجد کو زندگی کے تمام مسائل میں مرکز ہدایت بنالیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بات کو بار بار کہنے اور لکھنے کی ضرورت ہے، مقام مسرت ہے کہ محبی فی اللہ جناب **مولانا عبدالحفیظ ایلولوی** صاحب نے اس مسئلہ کی ضرورت واہمیت کو محسوس کرتے ہوئے تفصیل سے قلم اٹھایا ہے، نیز قرآن وحدیث اور سلف صالحین کی تعلیمات سے استفادہ کرتے ہوئے اس موضوع پر ایک مفصل کتاب مرتب کی ہے، جس میں مساجد اور ائمہ مساجد کے مقام اور ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور ائمہ کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ معاشرہ میں مساجد کے کردار کو بحال کریں اور اپنی ذمہ داریوں کو پوری فعالیت اور بصیرت کے ساتھ انجام دیں، یہ ایک مفید کتاب ہے، مصنف نے مناسب سمجھا کہ تدریج پر عمل کرتے ہوئے اس کے تھوڑے تھوڑے حصے شائع کئے جائیں، اس لیے ابھی اس کا پہلا حصہ جس میں مساجد کی اہمیت اور منصب امامت کے تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی ہے شائع کر رہے ہیں ۔

یہ حقیر ابھی سفر میں ہے، اس نے مختلف مقامات سے مطالعہ کی سعادت حاصل کی ، امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب کتاب ہوگی ، موصوف نے نظام مساجد کی اصلاح کا ایک نظام بھی مرتب کیا ہے، اگر واقعی وہ عمل کے سانچہ میں ڈھل جائے تو یہ ایک بڑا کام ہوگا ، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس کوشش کو قبول فرمائے ۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم ۔

خالد سیف اللہ رحمانی

نزیل : جامعۃ القرآت، کفلیہ، گجرات

۷ شعبان ۱۴۳۸ھ

۳ مئی ۲۰۱۷ء

مولانا محمد اسرار الحق قاسمی (ایم پی)
Mohammad Asrarul Haque
Member of Parliament
(Lok Sabha)

सत्यमेव जयते

16, South Avenue, New Delhi-110011
Ph.: 011-23795046 Telefax: 011-23795314
E-mail: mahaqqasmi@gmail.com

Ref. No. ....

Date 21/10/17

تاثرات

(مفکرملت حضرت مولانا اسرار الحق قاسمی دامت برکاتہم)

شریعت اسلام میں ائمہ کی اہمیت وبرتری اور فضیلت ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ایک موقع پر اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ ”امام اس لیے بنائے گئے ہیں کہ ان کی اقتدا کی جائے“۔اس کا ایک ظاہری مطلب یہ ہے کہ نماز کے دوران اماموں کی اقتدا کرنی چاہیے اوران کے عمل کے مطابق عمل کیا جائے تا کہ ہماری نماز درست اور مکمل ہوسکے۔لیکن ایک مطلب اس کا یہ بھی ہے کہ معاشرے میں امام کے منصب کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے اچھے اوراعلیٰ اخلاق وکردار کو اپنایا جائے اوراس سلسلے میں بھی انہیں اپنا راہنما بنایا جائے۔نبی اکرم ﷺ پوری زندگی مسجد نبوی کے امام وخطیب رہے اور مسلمانوں کو دی جانے والی تمام تر تعلیمات مسجدوں کے ذریعے ہی پایۂ تکمیل کو پہنچتی تھیں۔چاہے معاشرتی مسائل ہوں یا اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے نکلنے کی تدبیریں،چاہے تعلیم وتعلم ہو یا دیگر امور سب امام یعنی نبی پاک ﷺ کے ذریعے ہی لوگوں تک پہنچتے تھے۔اسی طرح لوگوں کو نماز کے اوقات کی خبر دینا اورانہیں دن کے پانچ وقت کامیابی اور خیر کی طرف بلانا بھی نہایت ہی شرف اور فضیلت والا عمل ہے اور نبی پاک ﷺ نے امام کے ساتھ ساتھ مؤذنین کے لیے بھی بڑے اجروثواب کی بشارت دی ہے۔امام ابن تیمیہؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اورانھوں نے دریافت کیا کہ اللہ کے رسول!مجھے کوئی کام بتائیں،تو آپؐ نے فرمایا”اپنی قوم کے امام بن جاؤ“تو انھوں نے کہا”اگر یہ ممکن نہ ہوتو؟“ تو آپؐ نے فرمایا”پھر مؤذن بن جاؤ“۔(شرح العمدہ)اس حدیثِ پاک سے سیدھے طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی نگاہ میں امامت اور مؤذنی ایک اعلیٰ اور شرف والا عمل تھا اسی وجہ سے آپؐ نے ایک صحابی کو اس کی تلقین فرمائی۔ایک دوسری حدیث جسے امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے،اس میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا”تین قسم کے لوگ قیامت کے دن مشک کے ڈھیر پر ہوں گے:ایک وہ جس نے اللہ کے اوراپنے غلاموں کے حقوق ادا کیے ہوں گے،دوسرا وہ شخص جس نے لوگوں کی امامت کی اوراس کے مقتدی اس سے خوش رہے اور تیسرا وہ شخص جس نے روزانہ پانچ وقت لوگوں کو نماز کی دعوت دی“۔یعنی جو اذان دیا کرتا تھا،اس حدیثِ پاک سے تو اور بھی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ امامت اور مؤذنی اللہ کے نزدیک موقر عمل ہے اوردونوں قسم کے لوگوں کے لیے اللہ کی خاص رحمت ومہربانی مقدر ہے۔ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ ”محشر کے دن مؤذنین کی گردنیں سب سے لمبی ہوں گی“۔یعنی وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں نمایاں ہوں گے اور بآسانی پہچانے جاسکیں گے۔ایک موقع پر فرمایا گیا کہ ”اگر لوگوں کو پہلی صف میں نماز پڑھنے اور اذان دینے کی فضیلت کا علم ہوجائے تو قرعہ اندازی کی نوبت آجائے گی“۔اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے خاص طور پر امام اور مؤذن کے لیے رشد ومغفرت کی دعا فرمائی ہے۔(سنن ابوداؤد)

ان فضائل کے ساتھ ساتھ امام اور مؤذن کی اپنے مقتدیوں اور عام مسلمانوں کے تعلق سے مختلف ذمہ داریاں بھی ہیں جنہیں کما حقہ ادا کرنا ضروری ہے،تبھی وہ اس اجروثواب کے حقدار ہوسکیں گے جن کا وعدہ کیا گیا ہے۔مجھے خوشی ہورہی ہے کہ محترم مولانا عبدالحفیظ ایلولوی ائمۂ مساجد کی علمی،فکری،تربیتی موضوعات پر ائمہ کی رہنمائی کے لئے ایک قیمتی کتاب مرتب کی ہے۔اس کتاب میں بڑی جاں فشانی کے ساتھ قرآن وحدیث اور اکابرامت کی تحریروں وافادات کی روشنی میں ائمۂ کرام کی رہنمائی کے لئے نہایت قیمتی باتیں تحریر کی گئی ہیں۔یہ کتاب ہر مسجد کے امام کے پاس ہونی چاہئے تا کہ وہ اس سے استفادہ کرکے اپنی مسجد میں مقتدیوں کی دینی وفکری رہنمائی میں اس سے مدد لے سکیں۔میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولیتِ تامہ وعامہ عطا فرمائے اور مرتب کے لئے دونوں جہان کی سعادتوں کا ذریعہ بنائے۔(آمین)

دعاء گو

(مولانا)اسرار الحق قاسمی
ممبر آف پارلیمنٹ وصدر آل انڈیا تعلیمی وملی فاؤنڈیشن

خادم (مولانا) خورشید احمد 9818893994 / 9013180352

مختصر فہرست (حصہ دوم)

مقدمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ ''نہج الائمۃ فی اصلاح الامۃ'' کا حصہ اول ابھی ابھی منظر عام پر آکر دلوں میں جگہ بنا کر آپ ائمہ حضرات کو مسؤلیت وذمے داری کی مشکل منزل، پر بلند مقام پر چھوڑ گیا ہے اوراس انتظار میں چھوڑ گیا ہے کہ کوئی راستہ ہوجس سے اس ذمے داری کے بوجھ سے سبکدوش ہوجائیں، کیوں کہ آپ اس سے سبکدوش ہونے کے لیے اس طرح بے چین وبے قرار ہیں جس طرح ایک مزدور سر پر اٹھائے بوجھ کو اتارنے کے لیے بے قراری سے منزل کا منتظر ہوتا ہے۔

تو ادھر دیکھئے ہم آپ کی اس بے قراری میں ہاتھ بٹانے اور آپ کے دوش ناتواں کو سبکدوش کرانے کے لیے کتاب کا حصہ دوم ''**طریقہ کار اور اصلاحی مرتب درجات** '' لے کر منتظر کھڑے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ائمہ حضرات اس کا ''بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا'' کہہ کر خوب استقبال کریں گے اور کتاب میں بیان کردہ طریقہ اصلاح کو اپنا کر بہت جلد معاشرے پر اصلاحی پکڑ کو مضبوط کر کے عند اللہ کھویا مقام پانے کا مقام بنائیں گے۔

آپ ائمہ حضرات اس حصہ دوم میں بیان کردہ طریقہ اصلاح کو پڑھ کر اور اپنا کر خود فیصلہ فرمائیں کہ کتاب ''**نہج الائمۃ فی اصلاح الامۃ**'' اصلاح امت میں ائمہ کا طریقہ کار کس قدر اسم بامسمی ہے! اور اسے بھی ملحوظ خاطر رکھیں کہ آج تک کس قدر تعطل حیات کے شکار تھے اور عند الناس کیسے '' رسمی مقام '' کے حامل تھے اور اب کام کے بعد معاشرے میں پاکیزہ اس مشغلے سے کس قدر معطر ہوکر عند الناس وعند اللہ حقیقی مقام بنانے جا رہے ہیں!!

ہمیں پورا یقین ہے کہ اس حصہ دوم کی روش سے ان شاء اللہ آپ اونچی شخصیت کے مالک بنیں گے، اور اب آپ معاشرے اور امت کے حق میں صحیح قائد وامام بنیں گے۔ پھر آپ بزبان آپ کی قوم ''مفکر وحکیم'' ہیں اور ''مصلح وہادی'' بھی، آپ کا تذکرہ ان کی پرائیویٹ مجلسوں ''میٹنگوں'' میں کیا جائے گا شرط یہ ہے کہ آپ ان کو کام کر کے بتائیں۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ''۔

عبدالحفیظ بن عبداللہ ایلولوی

ہمت نگر، سابر کانٹھا، گجرات

(خادم التدریس جامعہ حسینیہ راندیر۔ سورت)

99746 04855

باب: طریقہ کار اور اصلاحی مرتب درجات

فصل اول: طریقہ کار برائے ائمہ

یہ بات ذہن نشین ہو کہ آج اصلاح و تربیت کا نہج چھوٹ بھی چکا ہے اور بدل بھی چکا ہے۔ جس سے اصلاح نظر نہیں آتی۔ جب تک ہمارا انداز تربیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز تربیت میں نہیں ڈھلے گا لوگوں کی صحیح تربیت اور معاشروں کی صحیح اصلاح نہیں ہو سکے گی۔ ہم آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز تربیت اور اصلاح کا منہج بتائیں گے۔ پہلے آپ خاکہ ذہن نشین فرمالیں۔

اصلاح کی مختلف جہتیں ہیں اور ائمہ کے ناتے مختلف درجات بھی یعنی صلاحیت کے ناتے ائمہ کی مختلف قسمیں بھی ہیں۔ مثلاً

اصلاح کی مختلف جہتیں

●	انفرادی اصلاح	●	اجتماعی اصلاح
●	مسجدی اصلاح	●	خارجی اصلاح
●	معروفاتی اصلاح	●	منکراتی اصلاح

ائمہ کے ناتے اصلاحی درجات

●	بالکل ابتدائی درجہ اصلاح
●	درمیانی درجہ اصلاح
●	نصابی درجہ اصلاح

(۱) بالکل ابتدائی درجہ اصلاح

یہ ان ائمہ حضرات کے لیے ہے جو آج تک کسی طرح بھی اصلاحی جہت کی طرف توجہ کر نہیں پائے تھے اور نہ مقتدیوں میں ان کا کوئی مقام باقی رہا تھا۔ انہیں چاہیے کہ وہ درج ذیل اصلاحی طریقوں کو مرتب انداز میں بروئے کار لائیں۔ اور یہ خیال ہرگز نہ ستائے کہ بعض ائمہ صلاحیت سے ہی محروم ہوں گے، پھر وہ کیسے اصلاحی طریقوں کو انجام دیں گے۔ اس کا حل (جواب) آگے ہے۔

مسجدی اصلاح		خارجی اصلاح	
الف :	پہلے انفرادی اصلاح	الف :	پہلے انفرادی اصلاح
ب :	پھر اجتماعی اصلاح	ب :	پھر اجتماعی اصلاح

بالکل ابتدائی اصلاح کا آغاز مسجد سے ہو اور وہ بھی انفرادی۔ کیوں کہ مسجد میں امام کا (بمقابل خارج مسجد) نمایاں ایک مقام ہوتا ہے جسے ہر شخص جانتا ہے جو اصلاح کا راستہ ہموار کرے گا، پھر خارج مسجد۔ ہم آپ کو آگے اس کی کچھ مثالیں بھی بتاتے ہیں اور سب سے بڑی الجھن (کہ مقتدیوں میں اس کا مقام بھی نہیں رہا) کا حل بھی بتاتے ہیں۔

الجھن کا حل : آپ کسی دوسرے عالم صاحب کو یا کسی دوسری مسجد کے امام صاحب کو بلوا کر ان سے نماز پڑھائیں، وہ نماز کے سلام کے بعد قبل الدعا کھڑے ہو کر دس منٹ گفتگو کریں، جس میں وہ

الف : مقتدیوں کے سامنے اصلاح کی ضرورت پیش کریں۔

ب : نمازیوں کو امام کا مقام و رتبہ بتائیں۔

ج : شرعاً امام پر مقتدیوں کی اصلاحی ذمہ داری ہونے کو بتائیں، ایسی ذمے داری کہ وہ سب کے سامنے منکر پر ٹوک سکتا ہے۔

د : سیرت نبویہ سے اصلاح کی مثالیں بتائیں۔ (حصہ اول میں موجود ہیں، سیرت طیبہ پر ایک نظر)

وہ عالم یا امام صاحب کسی نماز کے بعد دس یا پندرہ منٹ خطاب کریں، ایسا ہفتے میں دو بار کریں۔ اور ایک ماہ تک یہ سلسلہ جاری رکھیں۔ مذکورہ بالا طریقہ سے ان شاء اللہ مقامی امام کا ایک مقام مقتدیوں کے یہاں قائم ہوگا۔ پھر مقامی امام صاحب دھیرے دھیرے از خود کام کو ذیل کے مطابق انجام دینا شروع کریں۔

۱۔ مسجدی انفرادی اصلاح

آپ مقتدیوں کو جو کام مسجد میں خلاف شرع و سنت کرتے ہوئے دیکھیں آپ ان کی نرمی و حکمت سے اصلاح کریں۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے بل کہ آپ کا حق بھی۔

(۱) قبل الجماعت اصلاح: مثلاً کسی مقتدی کا وضو میں فرض ادا نہ ہو، پانی میں اسراف کر رہا ہو، سنتیں چھوڑ رہا ہو، یا سنت پڑھتا ہو لیکن اس کے افعال برابر ادا نہ کرتا ہو۔

(۲) بعد الجماعت اصلاح : سنتوں کو چھوڑ کر جا رہا ہو، خلاف سنت و شرع لباس میں نماز پڑھی ہو، احترام مسجد کے خلاف کام کر رہا ہو وغیرہ۔ کیا کوئی بھی امام اپنے مقتدیوں کی اس طرح کی انفرادی اصلاح کی صلاحیت سے محروم ہوگا؟ ہرگز نہیں، یہ تو ہر امام بل کہ ہر شخص کر سکتا ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس طرح کی اصلاح پر خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکت صرف ہوئی ہے۔ لہٰذا عدم صلاحیت کا خیال ہرگز نہ لائیں۔

انفرادی اصلاح کے مؤثر اقدامات

(الف) : بعض افراد کو موقع اور غلطی کے لحاظ سے فی الفور بھی اصلاح کر سکتے ہیں۔ جس طرح حضور ﷺ بعض مرتبہ (افراد اور غلطی کو دیکھ کر) براہِ راست بھی اصلاح فرماتے تھے۔ مثلاً وہ آپ کا عقیدت مند ہو، کہ وہ آپ کو جھک کر سلام کرے، یا آپ کے سلام کا جواب غلط تلفظ سے دے۔

(ب) : بعض دفعہ غلطی کرنے والا اصلاح کا متحمل ہوتا ہے کہ آپ اصلاح کریں تو وہ مان لے، لیکن وہ جگہ جہاں غلطی صادر ہوئی ہے وہ محل اصلاح نہیں ہوتی۔ بل کہ ضرورت ہوتی ہے کہ آپ اسے اپنے گھر لاکر چائے پلا کر یا اس کی چائے پی کر اصلاح کریں۔

حدیث شریف کا خلاصہ ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت سائب رضی اللہ عنہ نے جمعہ کی نماز حضرت معاویہؓ کے ساتھ ان کے (مخصوص) کمرے میں پڑھی جب امام نے نماز ختم کی تو حضرت سائبؓ سنتوں کے لیے فوراً کھڑے ہو گئے۔ حضرت معاویہؓ نے ان کو دیکھ لیا لیکن اس وقت ان کو کچھ نہ کہا جب وہ اپنے گھر چلے گئے تو انہوں نے ایک آدمی بھیج کر حضرت سائبؓ کو کہلوایا کہ آئندہ اس طرح (فرض سے متصلاً سنت) نہ پڑھنا جب تک بات چیت نہ کرلو یا مسجد سے نہ نکل جاؤ۔ کیوں کہ حضور ﷺ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے کہ ہم (فرض) نماز کے ساتھ دوسری نماز (نفل) کو نہ ملائیں (مشکوۃ ۱۰۵)۔ دیکھئے حضرت معاویہؓ نے حضرت سائبؓ کی اصلاح، غلطی واقع ہونے کی جگہ نہیں فرمائی۔

(ج) : بعض دفعہ کھانے کی دعوت سے یا ہدیہ دے کر یا اس کے کسی اچھے کام کو

سراہنے سے یعنی اسکی عزت نفس کا خیال کر کے اصلاح کرنا مفید ہوتا ہے۔

(د) : بعض دفعہ براہ راست نہیں بل کہ اس کی بیوی بچوں، والدین، دوستوں وغیرہ کو ذریعہ بنا کر اصلاح مفید ہوتی ہے۔

(ھ) : بعض دفعہ اس پر واقع کسی مصیبت میں سہارا بننے سے یا اس کی خوشیوں میں شریک ہونے سے بھی اصلاح کی جاتی ہے۔ اس طرح سے اصلاح کرنا سیرت سے ثابت ہے۔ آپ کی اصلاح کا حال یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض وفات میں بھی آپ کی امت آپ کی قبر شریف کو سجدہ گاہ نہ بنائے تنبیہ و تاکید فرمائی ہے (مشکوۃ ۶۹)۔

۲۔ مسجدی اجتماعی اصلاح

اجتماعی اصلاح یہ صرف مسجدی امور سے متعلق ہو خارجی امور کو ابھی نہ چھیڑا جائے۔

سب سے پہلے اعمال مساجد کی نمازیوں میں مذکورہ طریقہ (مصلی پر قبل الدعا کھڑے ہو کر) پر اصلاح کرنا ہے۔ مثلاً کوئی نماز کے لیے دوڑ کر آئے۔۔۔۔ مسجد میں دنیوی بات کرے۔۔۔ وضو میں اسراف کرے۔۔۔ اذان و اقامت میں غلطی کرے۔۔۔ قومہ و جلسہ اور رکوع و سجدہ کو ٹھیک سے نہ کرے۔۔۔ ناقص لباسوں میں نماز پڑھے۔۔۔ تحریمہ کو عجلت سے باندھے۔۔۔ نمازی کے آگے سے گذرے۔۔۔ اقامت کے وقت پیچھے یا اِدھر اُدھر دیکھے۔۔۔ بیت الخلاء کو گندا چھوڑے۔۔۔ لائٹ کو فضول استعمال کرے۔۔۔ وغیرہ

جب اعمال مساجد کی اصلاح سے لوگ تاثر لیں اور اچھی نظروں سے دیکھیں (جس کے لیے میٹھا لہجہ حقیقی خیر خواہی اور علمی زبان درکار ہے) تو اب اس کے بعد انفرادی (خارج مسجد اور اندرون مسجد) اصلاح شروع کریں۔

اجتماعی اصلاح کے دو مقام ہیں۔

(۱) نماز کے سلام کے بعد قبل الدعا کھڑے ہوکر اصلاح فرمائیں۔مثلاً نماز کے لیے دوڑ کر نہ آئیں۔بچوں کو صف میں کھڑا نہ کریں،جماعت پانے کے لیے تھوڑا جلدی آیا کریں۔

(۲) قبل التحریمہ اقامت کے بعد بھی اصلاح فرمائیں۔مثلاً صف سیدھی کریں، پائجامہ اونچا کریں،صف پوری کریں،موبائیل بند کریں وغیرہ۔

آپ ابھی اس طرح روزانہ نہ کریں ہفتے میں دو تین بار کریں۔یقین جانیے جب آپ گھبراتے گھبراتے بھی مذکورہ بالا اصلاحیں کر لیتے ہیں تو سمجھے آپ کو مقتدیوں نے اپنا امام مان لینا شروع کر لیا ہے۔آپ ایک دو ماہ گاہے گاہے اس طرح کرتے رہے تو اب آپ مسجد سے خارج معاشرے کی اصلاح کی طرف توجہ کریں۔لیکن اس میں بھی ترتیب ملحوظ رکھیں پہلے انفرادی اصلاح پھر اجتماعی اصلاح۔اس اصلاح کا ثبوت شریعت سے ہے وہ ملاحظہ ہو۔

مشروع و مسنون طریقۂ اصلاح

آپ کو مذکورہ بالا اصلاحی طریقوں کو اختیار کرنے میں گھبرانا بالکل نہیں چاہیے،اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انداز تربیت اور نہج اصلاح یہی ہے ملاحظہ ہو۔

(الف) بعد السلام اصلاح

(الف) ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فجر کی نماز کافی تاخیر سے پڑھائی اور ہلکی بھی پڑھائی، جب سلام پھیرا تو بلند آواز سے فرمایا ’’جس طرح تم لوگ بیٹھے ہو اسی طرح اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہنا‘‘ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ بات ارشاد فرمائی جو مقصود تھی (مشکوۃ ۱۷)۔

(ب) حدیث شریف میں ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی جب نماز پڑھا چکے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہماری طرف متوجہ ہوکر فرمایا اے لوگو میں تمہارا امام ہوں تم مجھ سے رکوع اور سجدہ کرنے میں سبقت نہ کرنا اور نہ قیام میں اور نہ نماز کے ختم کرنے (سلام) میں (مشکوٰۃ ۱۰۱)۔ دیکھئے آپ نے ختم نماز کے بعد فرمایا۔ نیز اس حدیث شریف سے یہ معلوم ہوا کہ ہر امام کو امامت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح کرنی چاہیے کہ وہ مقتدیوں سے افعال میں آگے رہے اور مقتدیوں کو امام کی متابعت صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح کرنی چاہیے۔

(ج) ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھائی، اور پچھلی صف میں ایک آدمی نے (کوئی حرکت سے) اپنی نماز کو خراب (باطل) کردی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلام کے بعد اس کو یہ فرما کر تنبیہ فرمائی "یافلانُ اَلَا تتَّقِی اللہَ " کیا تو اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا (مشکوٰۃ ۷۷ عن ابی ہریرۃ)۔ ائمہ کو چاہیے کہ نماز کے بعد قبل الدعا کھڑے ہوکر اس طرح (حکمت سے) لوگوں کی اصلاح فرمائیں۔

(د) کعبۃ اللہ میں داخلہ کے بعد جب آپ باہر تشریف لائے تو بیت اللہ کے سامنے دو رکعت نماز پڑھی اور پھر فرمایا "ھٰذِہِ القِبلۃُ" (مشکوٰۃ ۶۷)۔ یہاں بھی نماز پڑھ کر بات ارشاد فرمائی۔

(ھ) لیلۃ التعریس کے واقعہ میں ہے "فَلَمَّا قضَی الصلوٰۃَ قَالَ مَن نَسِیَ الصلوٰۃَ فَلیُصَلِّھَا اِذَا ذَکَرَھَا۔۔" (مشکوٰۃ ۶۶)۔

اصلاح کا طریقہ صرف یہ نہیں کہ وعظ و بیان میں تنبیہ کی جائے، بل کہ اس کا اچھا اور ثابت شدہ طریقہ یہ ہے کہ نماز کے بعد فوراً کھڑے ہوکر اصلاح کی جائے جیسا کہ روایتوں سے

ثابت ہے۔

(ب) قبل التحریمہ اصلاح

روایت میں ہے صف میں ایک شخص تھوڑا آگے بڑھا ہوا تھا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو درست کھڑے رہنے کو فرمایا (عن نعمان مشکوٰۃ ۹۷) بل کہ بعض روایت میں تو صف میں جا کر درست کرنے کا بھی ذکر ہے۔

(ج) منبر پر چڑھ کر اصلاح

الف : جب نہایت ہی اہم بات ہو تو منبر پر چڑھ کر بھی آپ کہہ سکتے ہیں کیوں کہ منبر ہی کی وجہ سے قباحت و ممانعت کی اہمیت واضح ہوگی۔ منبر کا استعمال صرف جمعہ کے خطبہ ہی کے لیے نہیں۔ ایک شخص کھلے میدان میں برہنہ غسل کر رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کو جمع کیا اور عام اسلوب میں اس کی سختی سے ممانعت فرمائی (عن یعلی مشکوٰۃ ۴۹)۔

ب : عن ابی ھریرۃ... علی أعوادِ منبرہ (مشکوٰۃ ۱۲۱)۔

ج :عن عمارۃ علی المنبر قال اجلسُوا (مشکوٰۃ ۱۲۴)۔

ان میں بھی منبر پر اصلاح کی ہے۔

(د) منبر پر نماز پڑھانا

حیرت کی بات یہ ہے کہ معلّم امت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم کی غرض سے نماز (صرف قیام ورکوع) بھی منبر پر پڑھائی ہے (عن سہل مشکوٰۃ ۹۹) اس کا یہ مطلب نہیں کہ ابھی ہم آخری درجہ پر پہنچ جائیں جب کہ شروع کے درجات ہی کو کوئی نہیں جانتا۔ حالات کا تفقد بھی مصلح کے لیے از حد ضروری ہے۔ ابھی آپ پہلے دو درجوں کو اختیار کریں۔ کیا آج اس انداز سے تربیت ہو رہی ہے؟ نہیں تو پھر شروع کیجیے۔

۳۔ خارجی انفرادی اصلاح

خارج مسجد معاشرہ میں انفرادی اصلاح سے پہلے آپ کو ایک اہم اور ضروری بات ذہن نشین رکھنی ہے۔ وہ یہ کہ آپ جب بھی لوگوں سے انفراداً و اجتماعاً جہاں کہیں ملیں تو اصلاح امت و اصلاح معاشرہ پر اپنی دلی بے قراری کا صحیح معنی میں لوگوں کے سامنے اظہار کریں حتی کہ اوپر کے درجات ''مسجدی اجتماعی مواقع'' میں بھی اس کا اظہار کریں۔

مذکورہ درجات کی چیزوں پر ترغیب سے پہلے لوگوں کو اچھائیوں اور خرابیوں کا احساس اور اچھائیوں سے متصف ہونے اور برائیوں سے دور رہنے کی ضرورت کا احساس اس طرح دلائیں جس طرح کوئی شخص میلے کپڑوں کو دھونے اور بے غسل پسینہ سے تر بتر شخص غسل کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

خارجی انفرادی اصلاح کی مثالوں کی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ ہر قدم اصلاح کا متقاضی ہے۔ لیکن آپ کو نرمی و حکمت وغیرہ کی ضرورت ہوگی آپ پہلے اس کتاب (حصہ دوم) کو مکمل پڑھ لیں پھر کام شروع کریں۔

۴۔ خارجی اجتماعی اصلاح

خارجی اجتماعی اصلاح کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اب آپ معاشرے پر اصلاح کے لیے ٹوٹ پڑیں اور ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ جائیں۔ خارجی اجتماعی اصلاح کا مطلب ابھی یہ ہے کہ آپ اپنے اعزہ و اقارب اور اپنے متعلقین کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں اصلاح فرمائیں۔ '' وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ '' تا کہ شریعت کی اتباع بھی ہو اور معاشرے کے لیے آپ کا نمونہ بھی تیار ہو۔ پھر اجنبیوں کی اصلاح ہو۔ کیا اصلاح؟ کس چیز میں؟ ان کو اور ان کی مثالوں کو بتانے

کی ضرورت نہیں اندھیروں میں بھی ان کی مثالیں نظر آتی ہیں اور ایک طرف اختصار بھی ملحوظ ہے۔

(۲) درمیانی درجۂ اصلاح

درمیانی درجۂ اصلاح میں ائمہ حضرات خود ''ابتدائی درجے کو پڑھ کر'' اپنا صحیح اندازہ لگالیں کہ اس ابتدائی درجات کے مطابق کام انجام دے رہے ہیں یا نہیں۔

اگر نہیں تو پہلے وہیں سے آغاز کریں۔ اور اگر اصلاح تو کرتے تھے لیکن اس طرح منظم و مرتب طریقے پر نہیں جو ''ابتدائی درجہ'' میں مذکور ہے بل کہ کیف ما تفق انجام دیتے تھے تو اب آپ کو چاہیے کہ آپ بھی اس ذکر کردہ طریقے کے مطابق کام شروع فرمائیں۔ اور ایک دو ماہ اس طرح کام کے بعد ذیل کے ''درمیانی درجے'' تک پہنچ جائیں۔

۵۔ مسجدی و خارجی اصلاح

الف :	انفرادی اصلاح۔	ب :	اجتماعی اصلاح۔
ج :	معروفاتی اصلاح۔	د :	منکراتی اصلاح۔

پہلے مسجدی انفرادی و اجتماعی اصلاح فرمائیں۔ پھر خارجی انفرادی و اجتماعی۔ پھر معروفاتی و منکراتی۔ درمیانی درجۂ اصلاح کے ائمہ حضرات کے لیے خاص اصلاحی جہت یہ ہے۔

الف :	معروفاتی خارجی	ب:	منکراتی خارجی

معروفاتی کا مطلب یہ ہے کہ کیف ما تفق جو جو جس جس وقت کے کار خیر کسی سے چھوٹتے نظر آئیں اس کی ''عام اسلوب میں'' لوگوں کو ترغیب دی جائے۔ اور منکراتی کا مطلب بھی وہی کہ جس وقت جس کسی سے جو کار بد نظر آئیں اس سے ''عام اسلوب میں'' روکا جائے

انفراداً بھی روکا جائے بل کہ ''روبرو بھی''، لیکن طریقہ سمجھ لیں۔

■ **طریقہ یہ ہے کہ:** اس انداز سے روکیں کہ لوگوں کو منکر کی قباحت بھی سمجھ میں آجائے اور ناگوار بھی نہ ہو، کہتے ہیں ''سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے'' مطلب پسند کے راستے سے روکیں، نفرت کے راستے سے نہ روکیں۔ جس طرح کڑوی دوا کیپسول میں دی جاتی ہے تاکہ مریض کو ناگوار نہ ہو، لیکن بیماری کا احساس ہوجاتا ہے۔ آپ کیپسول والا نسخہ اختیار کریں۔ کیوں کہ شیطان بھی ان کو پسند کے راستے سے ہی بہکاتا ہے۔ ''وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ ''۔

یاد رکھیے جب تک امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا مذکورہ طریقہ اختیار نہیں کریں گے تب تک اصلاح ممکن ہی نہیں، کیوں کہ حضور ﷺ کا انداز تربیت یہی تھا۔ اس کے بغیر لوگ اپنی عادتوں اور طبیعتوں کو نہ چھوڑیں گے۔ ۳۰/۴۰ سال پہلے قوم کے باوقار اور معاشرے کے عریف حضرات کسی کو کوئی برائی کرتے دیکھتے تو علی الاعلان ٹوک دیتے۔ مانا کہ انحطاط کا دور ہے عوام نہ کریں لیکن صاحب منصب (امام) بھی نہ کرے پھر اصلاح ہوگی کیسے!!!

⬟ نوٹ: منکراتی اصلاح کا یہ مطلب نہیں کہ آپ بھرے مجمع میں کسی کو ٹوکیں ابھی آپ اس مقام پر نہیں پہنچیں، وہ مقام ''نصابی درجۂ اصلاح ''میں آنے والا ہے آپ ابھی اس کا انتظار کریں۔ لیکن پہلے یہ کتاب ''حصہ دوم'' پوری ضرور پڑھ لیں۔

(۳) نصابی درجۂ اصلاح

الف :	معروفاتی اصلاح	ب :	منکراتی اصلاح

یہ اصلاح نہج نصاب کتاب اختیار کریں۔

اس درجے میں اصلاحی کارنامہ انجام دینے کی پوری راہ نمائی کے لیے الحمدللہ پورا

نصاب تقریباً ۶۰ / ۷۰ صفحات پر مشتمل مرتب کیا ہے۔جس میں دو فصلیں ہیں۔

ایک اصلاحی مرتب درجات معروفات۔

دوسری اصلاحی مرتب درجات منکرات۔

پہلے کے دو درجات کو پورا کرنے کے بعد ہی اس درجے میں قدم رکھیں۔اس درجہ میں بہت اہم چیزیں ہیں مثلاً : حکمت کی نظیریں۔۔۔اصلاح میں قابل توجہ امور۔۔۔طریقۂ کار اور اس کی تدابیر۔۔۔ائمہ کی صلاحیت کے ناتے قسمیں۔۔۔ائمہ کے کام کا جائزہ۔۔۔ اصلاح خواتین وغیرہ وغیرہ۔

⬟ **نوٹ :** مرتب درجات معروفات ومنکرات سے اصلاح کے درمیان جن کا بیان ابھی آرہا ہے ان کے علاوہ دیگر معروفاتی ومنکراتی امور کی اصلاح کی طرف بھی خصوصی توجہ فرمائیں جو معین اوقات میں ہر سال گردش کرتے ہیں۔مثلاً۔

معروفاتی امور : روزہ، تراویح، حج، قربانی۔۔۔۔وغیرہ

منکراتی امور : محرم میں تعزیہ سازی اور ماتم پرسی، ربیع الاول میں عید میلاد النبی ﷺ، مکر سکرانتی (پتنگ سازی پتنگ بازی) اور دیوالی، ہولی۔۔۔وغیرہ۔

طریقۂ کار : ان امور کے اوقات سے ۲ / ۳ ہفتے پہلے جمعہ کے خطاب میں مؤثر انداز سے معروفات کی ترغیب دیں اور منکرات پر نکیر کریں۔اور ساتھ ہی معاشرے کے باوقار افراد کی جماعت بنا کر انفرادی ملاقات سے ذہن سازی بھی کریں۔جب تک مذکورہ دونوں طریقوں سے کوشش نہیں کی جائے گی تب تک خاطر خواہ فائدہ نہ ہوگا لہٰذا ذہن سازی کی انفرادی محنت بھی ضروری سمجھیں۔

فصل دوم: اصلاحی مرتب درجات معروفات

علمائے کرام (ائمہ حضرات) انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں اور وارث کا وہی کام ہوتا ہے جو اس کے مورث کا تھا لہٰذا وارث ہونے کے ناتے اپنے پر عائد ذمہ داریوں کو بحسن خوبی انجام دیں جس کے لیے ہم نے دو فصلیں قائم کی ہیں۔ اگر انہوں نے ان کے مطابق اصلاح ناس واصلاح معاشرہ میں روش اختیار کی تو ان شاء اللہ معاشرہ اصلاح وسدھار کی راہ پر پڑ جائے گا اور امید ہے کہ ہماری یاس آس سے بدل جائے۔ پہلے ضروری امور۔۔۔

✪ طریقۂ اصلاح میں قابل توجہ امور ✪

(الف) فکر صحیح ہو اور طریقۂ اصلاح بھی صحیح ہو۔

کسی فکر وعمل کو لوگوں میں لانے اور رائج کرنے کے لیے کامیاب اصول یہ ہے کہ آپ کی فکر درست ہو اور کام کا طریقہ بھی درست ہو۔ آپ کو درست فکر اور درست عمل دینے کے لیے ہی ذیل میں کچھ باتیں پیش کی گئیں ہیں اگر اس کے مطابق کام ہوا تو ان شاء اللہ امید ہے کہ آپ اپنی منزل پر پہونچیں گے۔

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ نے لکھا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی سے دین کی کوئی خدمت لے لیں اور اسے قبول فرمالیں تو اس کا فائدہ اس کی سات پشتوں تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی سے دین کا نقصان ہو جائے تو اس نقصان کا اثر بھی سات پشتوں تک پہنچتا ہے۔ (مظاہر حق)۔ بڑے ہی ڈرنے کی چیز ہے کہ آدمی اپنی معمولی خواہش کے خاطر اپنے دین کا اور اپنی نسلوں کے دین کا کتنا بڑا نقصان کر جاتا ہے۔

(ب) اصلاح میں خدائی نصرت کا یقین ہو۔

اصلاحی کام میں آپ یہ نہ سوچیں کہ میں تنہا کیا کروں اور کیسے کروں؟ اور اتنے بڑے کام کے لیے ہمت کہاں سے لاؤں؟ کیوں کہ آپ تنہا نہیں آپ کے ساتھ آسمان وزمین کا پروردگار ہے۔ کام اس کا انجام دیں اور آپ اکیلے ہوں یہ کیسے ممکن ہے؟ ”اِذْھُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللہَ مَعَنَا“ کا منظر یاد کیجئے۔

آپ پہلے دو باتیں ذہن نشین فرمالیں: ایک یہ کہ کام کا پختہ ارادہ آپ فرمالیں، کہ ان شاء اللہ مجھے منصب امامت سے اصلاح معاشرہ کا کام ضرور انجام دینا ہے چاہے جس قیمت پر ہو۔

اگر آپ اس کام کے لیے اپنے کو (تواضعاً) نااہل پائیں تو فکر کی کوئی بات نہیں (احساس تو یہی ہونا چاہیے) ارادہ کی پختگی سے اللہ تعالیٰ اہل بنادیں گے اور اگر پہلے سے ہی اہل ہیں تو اب آپ ان شاء اللہ اہل اللہ کی منزل پر پہونچیں گے۔ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایک امام صاحب آئے، اور کہنے لگے حضرت امامت چھوڑ دینا چاہتا ہوں حضرت نے پوچھا کیوں؟ تو کہا کہ میں اپنے کو امامت کا اہل نہیں پاتا فرمایا تب تو تم امامت کرتے رہو، اور جب یہ خیال آجائے کہ میں اس کا اہل ہوں تو چھوڑ دینا (العلم والعلماء)۔

دوسری بات یہ کہ یہ کام آپ کو نہیں کرنا ہے، کام تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کرے گی، آپ تو صرف کام کی ظاہری شکل اور اس کے وہ اسباب اختیار کریں گے جو آپ کے بس میں ہیں۔ جب آپ اپنے بس کا کام کریں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے بس کا (پورا کرنا) کریں گے۔ کیوں کہ وہ قادر مطلق اور فعال لما یرید ہیں۔

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام جب بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ اب لوگوں کو حج کے لیے آواز دو (وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ) تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا باری تعالیٰ میری آواز سب تک کیسے پہونچے گی؟ ارشاد ہوا اے خلیل آواز لگانا آپ کا کام ہے اور اسے لوگوں تک پہنچانا ہمارا کام ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے باپ کے اصلاب تک اسے پہونچایا۔ اور ایسا پہنچایا کہ آج تک حاجیوں کا سلسلہ قائم ہے (حکیم الامت کے حیرت انگیز واقعات ۲۱۹)۔ بس اس سے یقین حاصل کرتے ہوئے کام شروع فرمائیں، اللہ تعالیٰ اسے اپنی قدرت سے تکمیل تک پہچائیں گے۔ بل کہ آپ کی مزید ہمت کے لیے عقائد کا ایک امر ''معونت'' ذیل میں بیان کرتے ہیں۔ جس معونت سے آپ کے ارادہ میں تقویت حاصل ہوگی۔

عقیدہ معونت سے تقویت

کتب عقائد میں نبی کے معجزہ اور ولی کی کرامت کے ضمن میں معونت کا بھی ذکر آتا ہے۔ معجزہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کے ہاتھ خلاف دستور خلاف عادت کوئی معاملہ ظاہر فرمائیں یعنی کھلی مدد کریں۔ جیسے شق القمر کا معجزہ۔ اور اگر ایسا کسی ولی کے ہاتھ ہو تو اسے کرامت کہتے ہیں۔ لیکن ایک تیسری بھی چیز ہے جس کو معونت کہا جاتا ہے۔

اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک جس طرح معجزہ اور کرامت حق ہے اس طرح معونت یعنی مدد بھی حق بمعنی ثابت اور یقینی ہے اور معونت اسی مذکورہ طرح کی وہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہے جو کسی عام مومن یا بہت سارے مؤمنین کے حق میں ظاہر ہو۔ یعنی معونت کے لیے تو ولی ہونا بھی شرط نہیں بل کہ عام مومن عام مسلمان کے حق میں بھی خلاف عادت ''معونت'' ظاہر ہوتی ہے ہاں

اتنی شرط ہے کہ وہ فاسق نہ ہو۔ "ثالثھُما المعونۃُ لِعوامِ المؤمنینَ مِمّن لِیْسَ فَاسِقاً وَلَاوَلِیّاً"۔ (حاشیہ محمد برخوردار نبراس ۴۳۰)۔اور حاشیہ میں ہے "وَقَد یظھرُ الخوارِقُ مِن قِبلِ عوامِ المسلِمِیْنَ تخلِیصاًلھم عَنِ الْمِحَنِ وَالمکارِہِ وتسمیٰ مَعُونۃً"۔(شرح عقائد ۱۰۵۔ ح ۱۲)۔

جیسے آپ نے ملاحظہ کیا کہ معونت تو عام مؤمن کے حق میں ہوتی ہے، جب کہ آپ تو الحمدللہ پابند شرع اور اچھے خاصے ایمان واعمال سے متصف ہیں اور جو کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ تو عین اللہ کا مقتضیٰ ہے اور اس کو محبوب ہے پھر آپ کی مدد کیوں نہ ہوگی؟ ضرور ہوگی اس لیے کہ یہ عقیدہ، عقیدہ کی حد تک کے لیے نہیں ہے بل کہ اس لیے ہے کہ اسے واقعہ اور حقیقت بنایا جائے اور زندگی میں اسے حاصل کیا جائے۔لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس یقین کے ساتھ کام انجام دیں۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی مدد کتنی قریب ہے اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ عالم اسباب میں جہاں افعال کی نسبت اسباب اور بندوں کی طرف ہوتی ہے، لیکن کبھی کبھار اللہ تعالیٰ بندوں میں اپنے یقین کو مضبوط کرنے اور اسے بڑھانے کے لیے خلاف دستور ان کی نسبت خود اپنی طرف کر دیتے ہیں۔

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جنگ بدر کے دن اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا جس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کنکریوں کی مٹھی لی اور ہمارے سامنے آکر اسے ہم پر پھینک دیا اور فرمایا تمہارے چہرے بگڑ جائیں اس پر ہمیں شکست ہوگئی اور اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی "وَمَا رَمَیْتَ إِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی" (انفال ۱۷)۔اور آپ نے خاک

کی مٹھی نہیں پھینکی جس وقت آپ نے پھینکی تھی لیکن وہ اللہ نے پھینکی تھی۔ جنگ بدر تک حضرت حکیم مسلمان نہیں ہوئے تھے بعد میں مسلمان ہوئے۔

اسی طرح ''فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ''اور ''اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ '' (مائدہ۱۱)۔آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ نبی کے فعل کی نسبت خود اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کر کے یقین دلا دیا کہ ہم ہی ان کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ مذکورہ باتیں اگر ذہن نشین کرلی ہوں تو اب اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے کام شروع فرمادیں۔ ان شاءاللہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے کافی ووالی ہوجائے گا ''وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ''اور آپ اصلاح معاشرہ سے ضرور اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرسکیں گے۔

(ج) نتیجہ نہ پانے سے مایوس نہ ہوں

ہم صرف اصلاحی امور انجام دینے کے مکلف ہیں، نتیجہ کے مکلف نہیں اگر اصلاحی اثرات نہ دیکھیں تو مایوس نہ ہوں۔ حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''طبیعت مایوسی کی طرف زیادہ چلتی ہے، کیوں کہ مایوس ہوجانے کے بعد آدمی اپنے کو عمل کا ذمہ دار نہیں سمجھتا اور پھر اسے کچھ کرنا نہیں پڑتا، خوب سمجھ لو یہ نفس اور شیطان کا بڑا کید ہے۔ (ملفوظات ۱۰۲)۔

(د) گنہگاروں سے حسن ظن ہو

حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے۔ ''تبلیغ میں کام کرنے والوں کو اپنے قلب میں وسعت پیدا کرنا چاہیے، جو اللہ کی وسعت رحمت پر نظر رکھنے سے پیدا ہوگی''۔ حدیث شریف میں ہے ''ظُنُّوْا الْمُؤْمِنِيْنَ خَيْرًا ''اور اِنَّ حُسْنَ الظَّنِّ مِنَ الْعِبَادَةِ ''۔(

ملفوظات ۱۴۶، ۵۰)۔

(ھ) حکمت وموعظت حسنہ کا لحاظ ہو

اصلاح معاشرہ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں حکمت اور موعظۂ حسنہ سے کام لینا ہے۔ قرآن نے ہمیں ان کی ہدایت دی ہے "اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ" (نحل ۱۲۵)۔ کہ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت سے بلائیں اور (اگر ان کے ساتھ بحث ومباحثہ کی نوبت پیش آجائے تو) ان کے ساتھ جدال (مباحثہ) احسن اختیار کیجئے۔

سبیل ربک ایسا عام لفظ ہے جس میں ایمان واسلام، دین وقرآن، ہدایت ورسول اور آخرت واعمال صالحہ کی طرف اور منکرات سے بچانے کی طرف بلانا سب ہی شامل ہیں۔

اس آیت شریفہ میں دعوت الی اللہ کے آداب میں سب سے پہلے حکمت کو رکھا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ داعی کا کام صرف ایک پیغام وکلام لوگوں کے کانوں میں ڈال دینا نہیں ہے، بل کہ حکمت وتدبیر سے مناسب وقت مناسب ماحول دیکھ کر ایسے عنوان سے پہنچانا ہے کہ مخاطب کے لیے قبول کرنا آسان ہوجائے۔

دوسری چیز موعظت ہے۔ جس کے معنی ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ نیک کام کی طرف بلانے کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ داعی کے لیے ضروری ہے کہ جو کلام کرے ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبہ سے کرے۔

تیسری چیز موعظت کے ساتھ حسنہ کی قید ہے۔ اس میں اشارہ ہے عنوان کو نرم اور دل نشین بنانے کی طرف۔ کیوں کہ بعض اوقات کسی کو خالص ہمدردی اور خیر خواہی سے بھلائی کی

طرف بلایا جاتا ہے مگر عنوان اور لب ولہجہ دل خراش ہوتا ہے تو وہ دعوت مؤثر نہیں ہوتی اس لیے حسن کی قید لگا کر لب ولہجہ کو نرم رکھنے کی تاکید کردی۔

خلاصہ یہ کہ ہر مبلغ وداعی کے لیے ان گوشوں پر نظر رکھنا ضروری ہے۔جس کے لیے قرآن شریف میں ذکر کردہ انبیاء علیہم السلام کے دعوتی مضامین پر غور کرنا چاہیے۔اور معلوم کرنا چاہیے کہ نافرمانوں کو وعیدیں کس اسلوب میں پیش کی گئیں۔۔۔ان کا منھ کس طرح بند کیا گیا ۔۔۔ بشارتیں کس لہجہ میں دی گئیں۔۔۔،طریقۂ دعوت کیا تھے۔۔۔اور اس کے اسلوب کیا تھے؟ کہ یہ سب ہی دعوت کے بنیادی اصول ہیں،قرآن میں ان گوشوں پر غور کرنا چاہیے۔

(و) خلوص وللّٰہیت سے ہو

دل خلوص وللّٰہیت میں ڈوبا ہوا ہو،جذبۂ شہرت ونا موری سے بالکل خالی ہو اور حب جاہ کا شائبہ تک نہ ہوتب آپ پوری طرح اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید کے مستحق ہوں گے۔

(ز) ہمدردی اور خیر خواہی سے ہو

ان دونوں کا بیان ائمہ کی صفات حصہ سوم میں آنے والا ہے۔

حدیث مبارکہ سے ثابت شدہ طریقۂ اصلاح

بخاری شریف کے باب فضائل قرآن میں حضرت سیدۃ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث ہے جس کا ہم خلاصہ نقل کرتے ہیں۔جب اللہ تعالیٰ نے مختلف احکام مثلاً شراب وزنا وغیرہ کی حرمت کو نازل کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے وہ مفصل سورتیں نازل فرمائیں جن میں جنت وجہنم کا ذکر ہے تاکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت،اللہ

تعالیٰ کی قدرتوں کا، اس کے انعامات وعذابات، جنت وجہنم اور حساب وکتاب کا یقین دلوں میں جم جائے۔ چناں چہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوگئے اور مقصد حاصل ہوگیا تب حلال وحرام کے احکام نازل کئے۔ اگر سب سے پہلے یہ حکم نازل ہوتا کہ شراب مت پیو تو لوگ کہہ دیتے ہم کبھی بھی شراب چھوڑنے والے نہیں۔ ''وَلَوْ نَزَّلَ اَوَّلَ شَيْءٍ لَاتَشْرَبُوْا الْخَمْرَ لَقَالُوْا لَانَدَعُ الْخَمْرَ اَبَدًا وَلَوْ نَزَلَ لَاتَزْنُوْا لَقَالُوْا لَانَدَعُ الزِّنَا اَبَداً'' بخاری شریف (۲ /۷۴۷)۔

یعنی پہلے ذہن سازی کی گئی اور اوامر ونواہی کو قبول کرنے کی استعداد وصلاحیت پیدا کی گئی پھر احکامات عائد کئے گئے تا کہ کما حقہ ان احکامات کی بجا آوری حاصل ہو۔ اس حدیث شریف سے دو باتیں بطور خاص معلوم ہوئیں۔

(۱) ایک: حکم دینے سے پہلے اس حکم کو ماننے اور قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔

(۲) دوسری: صلاحیت پیدا کرنے میں بنیادی کردار اللہ تعالیٰ کی عظمت وقدرت کا بیان اور امہات عقائد یعنی حساب وکتاب جزاء سزا کا یقین دلانا۔

سنا ہے کہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ دعوتی کام کرنے والوں کو اصول پر لانے سے پہلے ان اصولوں کی اتنی ترغیب دیتے تھے کہ لوگوں کے منھ میں پانی آجاتا حتی کہ لوگ ان اصولوں کا انتظار کرتے، جب لوگوں میں ان کی استعداد دیکھتے تو پھر اصول بتاتے جس سے لوگ ان کو اختیار کر لیتے۔

معاشرہ کی تبدیلی کیسے ہو؟

معاشرہ کی تبدیلی کے بارے میں شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی مدظلہ العالی نے ایک پتہ کی بات لکھی ہے۔ فرماتے ہیں کہ بگڑے معاشرے کی اصلاح کے بارے میں لوگ یہ

سمجھتے ہیں کہ جب تک پورا معاشرہ نہ بدلے اور سب ہی لوگ نہ بدلیں تب تک میں اکیلا آدمی اپنی زندگی میں تبدیلی نہیں لاسکتا۔ یاد رکھیۓ نظام اور معاشرہ نام ہے چند افراد کے مجموعے کا۔ اگر ہر فرد اپنے طور پر یہی سوچتا رہے تو معاشرے میں کبھی تبدیلی نہیں آسکتی۔ تبدیلی ہمیشہ اس طرح آیا کرتی ہے کہ معاشرہ کا کوئی ایک فرد (اللہ کا بندہ بن کر) اپنی زندگی کا چراغ درست اور روشن کرتا ہے، پھر اس کو دیکھ کر دوسرا اپنا چراغ درست کرنے لگ جاتا ہے پھر تیسرا شخص اس طرح تمام لوگ۔ اس طرح افراد کے سنورنے سے معاشرہ سنورنے لگتا ہے۔

بعینہ یہی حال سنورے ہوئے معاشرہ کو بگاڑنے میں بھی ہے کہ اولاً کوئی ایک آدمی معاشرہ میں ایک برائی لاتا ہے جسے دیکھ کر دوسرا شخص بھی اس کو اختیار کرتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ برائی پورے معاشرہ پر چھا جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی معاشرہ ایک دم سے سنور جائے یا بگڑ جائے۔ لہٰذا یہ خیال کہ میں اکیلا کچھ نہیں کرسکتا نفس وشیطان کا فریب ہے۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۱/۲۷۵)۔

سب ہی جانتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو معاشرہ بگاڑ کی کتنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ اس وقت اگر آپ یہ سوچتے کہ اتنا بڑا معاشرہ الٹی سمت جارہا ہے میں تنہا کیا کرسکوں گا اور آپ ہمت ہار کر بیٹھ جاتے تو آج دنیا کی ایک تہائی آبادی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نام لیوا نہ ہوتی۔ اور ہم مسجدوں کے مصلوں اور مدارس کے مسندوں پر نہ ہوتے۔ لہٰذا ہم ائمہ حضرات اسی تبدیلی کا مبارک سہرا اپنے سر باندھنے کے لیے اپنے کو مستعد کریں۔

ایک اہم حدیث شریف ملاحظہ ہو

عن سهلِ ابن سعدٍ رضی اللہ عنہ أنّ رسولَ الله ﷺ قالَ إن هذَا الخيرَ خزائِنُ ولتِلكَ الخزائِنِ مَفاتيحُ فطوبىٰ لِعبدٍ جعلَه اللهُ مِفتاحاً لِلخيرِ مِغلاقاً لِلشرِّ، وويلٌ لعبدٍ جعلَه

اللہُ مِفتاحاً لِلشرِّ مِغلاقاً لِلخیرِ۔(ابن ماجہ ۲۱)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ یہ دین نعمتوں کا خزانہ ہے، اور ان نعمتوں کے خزانوں کے لیے کنجیاں ہیں۔خوش خبری ہو اس بندے کے لیے جسے اللہ تعالیٰ خیر(ہدایت) کی کنجی اور شر(گمراہی) کا تالا بنادے۔اور خرابی ہو اس بندے کے لیے جسے اللہ تعالیٰ شر کی کنجی اور خیر کا تالا بنادے۔

یعنی آدمی کی سعادت و نیک بختی اور اس کی کامیابی اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں دوسروں کی ہدایت و بھلائی کا اور پھیلتی گمراہی کے روکنے کا ذریعہ بنادیں۔سچ یہ ہے کہ اس پرفتن دور میں اگر کوئی شخص امت میں دین وہدایت کی محنت سے دور رہے چاہے وہ دین پر قائم ہو تب بھی وہ لازماً شر اور گمراہی کے پھیلنے کا ذریعہ ضرور بن جائے۔لہٰذا ضروری ہے کہ ہم دین پر قائم رہتے ہوئے دوسروں میں دین لانے کی محنت کریں تاکہ اللہ تعالیٰ خیر و بھلائی کا ذریعہ بنائیں۔

تَنَبُّہ: اصلاح میں ابتدا تو منکرات و برائیوں کو چھڑانے سے کرنا اصل ہے۔ کیوں کہ کسی کام کو کرنے سے رک جانا، اس کو کرنے کے مقابلہ میں آسان ہوتا ہے، نیز مفاسد سے بچنا منافع سے آراستہ ہونے پر مقدم ہے اور رذائل سے دور رہنا خوبیوں سے آراستہ ہونے سے پہلے ہوتا ہے "ان الکفَّ ایسرُ مِن انشاءِ الفعلِ لان اجتنابَ المفاسدِ مقدمٌ علَی اِجتِلابِ الْمصالحِ والتّخلّی عن الرّذائلِ قبلَ التحلِّی بالفضائلِ" (تعلیق الصبیح ۱/۳۳)۔

کلمۂ توحید بھی یہی سکھاتا ہے کہ اس میں پہلے شرک و کفر کی ناپاکی سے پاک کیا گیا ہے پھر توحید کی خوبی سے آراستہ کیا گیا ہے "لاالہ الااللہ" اور لاحول ولاقوۃ الا باللہ میں بھی نفی مقدم ہے یعنی لَاحَوْلَ عَنْ مَعْصِیَۃِ اللہِ اِلَّابِعِصمۃِ اللہِ، وَلَاقوۃَ لِطاعۃِ اللہِ اِلَّا بَعَوْنِ

اللہ۔ عارف ربانی حضرت شیخ معروف کرخی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک منکر کو چھوڑنا ہزار معروفات پر عمل سے مقدم اور بہتر ہے۔

لیکن حکمت کے پیش نظر ابتدا معروفات پر لانے سے کرنا ہے۔ کیوں کہ آج کل گناہوں اور خواہشات اختیار کرنے کی لوگوں کی عادت اتنی پختہ ہوچکی ہے کہ اگر آپ اس کو لے کر ان پر ہاتھ ماریں گے تو وہ پہلے ہی سے بھڑک جائیں گے اور آپ سے علیحدہ ہوکر رہ جائیں گے اور آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ کیوں کہ اس میں لوگ اپنے لیے ننگ و عار محسوس کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ ان سے اچھے اعمال (معروفات) انجام دلانا چاہیں گے تو وہ اسے جلد قبول کرلیں گے لیکن اگر گناہ چھڑانا چاہیں گے تو اتنی سہولت سے قبول نہیں کریں گے۔

مفکر ملت حضرت مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ کے نظریہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عام ماحول کے خلاف مولانا محمد الیاس کی بصیرت پر یہ منکشف فرمایا کہ منکرات کو مٹانے کا یہ طریقہ نہیں کہ ایک ایک منکر کے مٹانے کے درپے ہوا جائے، کیوں کہ ایک منکر کے مٹانے میں بعض اوقات عمریں گذر جاتی ہیں پھر بھی وہ نہیں مٹتا، اگر وہ مٹ بھی جاتا ہے تو وہ صرف ایک مقامی اصلاح ہوتی ہے، اور بعض اوقات ایک دوسرا منکر پیدا ہوجاتا ہے، دنیا میں اس وقت صدہا منکرات ہیں، عمریں ختم ہوجائیں تو بھی وہ سب نہیں مٹ سکتے۔

مولانا کے نزدیک صحیح طریقہ یہ تھا کہ ان منکرات سے بحالات موجودہ براہ راست تعرض نہ کیا جائے بل کہ ایمانی شعور اور دینی احساس کو بیدار کیا جائے اور معروفات کی تکثیر وترویج کی جائے۔ یہ منکرات اپنی جگہ بغیر کسی جھگڑے کے مضمحل ہوجائیں گے۔ معروفات کا

جتنا فروغ ہوگا منکرات کو اتنا ہی زوال ہوگا۔

ایک سلیم الفطرات میواتی (میاں جی داؤد) نے جو مولانا کے خاص تربیت یافتہ تھے مجھ سے کہا کہ ایک دن میں چھڑکاؤ کررہا تھا، سب طرف چھڑکاؤ کیا لیکن جہاں کھڑا تھا وہ جگہ خشک رہ گئی، سب طرف سے ٹھنڈی ہوائیں آئیں تو وہ جگہ خود بخود ٹھنڈی ہوگئی۔ اس وقت یہ نکتہ میری سمجھ میں آیا کہ اگر اپنی ہی جگہ چھڑکاؤ کیا ہوتا اور اس کے گردوپیش خشک رہتا تو اپنی جگہ ٹھنڈی نہ ہوتی۔ اس وقت مولانا کا یہ اصول پوری طرح سمجھ میں آیا۔ (مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت ۲۲۷)۔

کام کرنے کے لیے درکار حکمت کی نظیریں

اصلاحی کام کرنے والے کے لیے حکمت اختیار کرنا نہایت ہی ضروری ہے، ورنہ نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق ہوگا۔ ہمیشہ وہ مصلح کامیاب رہا ہے جو حامل حکمت ہو۔ سو ہم آپ کے لیے حکمت کی چند مثالیں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہیں تا کہ آپ کامیاب مصلح کا مقام حاصل کرسکیں۔

(ا) ایک مرتبہ ایک دیہاتی شخص مسجد (نبویؐ) میں آیا اور کھڑے ہوکر مسجد میں پیشاب کرنا شروع کردیا صحابہ رضی اللہ عنہم اس کو روکنے لگے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اسے مت روکو بل کہ پیشاب کرلینے دو، جب پیشاب سے فارغ ہوگیا تو آپؐ نے اسے بلاکر فرمایا کہ یہ مساجد ہیں جہاں گندگی نہیں کرنا چاہیے بل کہ یہ ذکر اللہ اور نماز اور قرآن پڑھنے کی جگہیں ہیں، پھر پانی کا ڈول منگوایا اور اس پر پانی کا ڈول بہادیا۔ (مشکوٰۃ شریف ۵۲)۔

اندازہ کیجئے کہ مسجد جیسی مقدس ومتبرک جگہ میں پیشاب جیسی گندی حرکت کرنا کتنا سنگین جرم اور برا کام ہے، اس پر جتنا بھی غصہ آئے کم ہے لیکن رحمت کے پیکر محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بلاکر نہ مارا نہ دھمکایا صرف اتنی بات سمجھائی کہ یہ اللہ کا گھر ہے یہ عبادت کی جگہ ہے

پیشاب کی جگہ نہیں ہے۔اس طرح کی نرمی وحکمت سے لوگوں میں دینی امور لائے جاسکتے ہیں۔

(۲) ایک نوجوان حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر زنا کرنے کی اجازت طلب کرنے لگا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو قریب کر کے اس طرح سمجھایا کہ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ کوئی تمہاری ماں کے ساتھ زنا کرے اس شخص نے کہا نہیں پھر آپؐ نے فرمایا لوگ بھی یہ نہیں چاہتے کہ ان کی ماؤں کے ساتھ زنا کیا جائے، پھر آپؐ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ تمہاری بیٹی کے ساتھ کوئی زنا کرے اس نے کہا نہیں تو آپؐ نے فرمایا لوگ بھی یہ نہیں چاہتے کہ ان کی بیٹیوں کے ساتھ زنا کیا جائے اس طرح سمجھا کر مطمئن کیا اور اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر دعا فرمائی اے اللہ! اس کے دل کو پاک فرما۔(مسند احمد والطبرانی)

اس واقعہ سے اندازہ لگایئے کہ ایک امتی اپنے نبی سے زنا کی اجازت طلب کرے تو اس نبی کے غصہ کی حالت کیا ہونی چاہیے لیکن رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بغیر کسی غصہ کے حسن اخلاق سے سمجھا کر اسے مطمئن فرمایا یہ ہے کام۔آدمی جب ٹھان لیتا ہے کہ مجھے یہ کام کرنا ہے چاہے جس قیمت پر ہو تو پھر اسے کر کے ہی دم لیتا ہے۔بس اس طرح شفقت وترحم سے کام کو کام سمجھ کر کریں گے ان شاء اللہ ساری منزلیں آسان ہوجائیں گی۔

(۳) ام الفضل رضی اللہ عنہا (حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی بیوی) کہتی ہے کہ (ایک مرتبہ) عرفہ کے روز میرے سامنے کچھ لوگ (صحابہؓ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روزے کے بارے میں بحث کرنے لگے۔بعض کہتے تھے کہ (آج) آپ کا روزہ ہے اور کچھ کہتے تھے کہ آپ روزے سے نہیں تو (تصفیہ کے لیے) میں نے دودھ کا ایک پیالہ آپ کے پاس بھیجدیا آپ اس وقت میدان عرفات میں ایک اونٹنی پر کھڑے تھے چناں چہ آپ نے وہ دودھ (لے کر) پی لیا۔(مشکوۃ

شریف ۱۷۹)۔ دیکھئے لوگوں کے مباحثہ کا دفعیہ کتنی بہترین تدبیر سے کردیا اور ثابت کردیا کہ یا تو آپ کا روزہ نہیں تھا یا نفلی روزہ تھا تو کسی حکمت سے افطار کر کے آپ نے ظاہر کردیا کہ روزہ نہیں۔

(۴) بعثت نبوی سے پہلے جب حجر اسود کو اپنی جگہ نصب کرنے کا مسئلہ پیش آیا تو قبائل عرب جنگ کے لیے آمادہ تھے لیکن اس شرف کے لیے بلا جنگ کسی کو ترجیح دینے کے روادار نہیں تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فیصل طے ہوئے تو آپ نے چادر منگا کر چار بڑے قبائل کے چار سرداروں کو چادر کا ایک ایک گوشہ پکڑا کر منتقل کروایا اور قریب آنے کے بعد اپنے دست مبارک سے اٹھا کر اس کی جگہ رکھدیا اور جنگ کو حکمت سے ٹال دیا۔ یہ تھی حکمت۔

(۵) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے وقت خلیفہ کی تعیین میں انصار و مہاجرین صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں کچھ اختلاف ہوا۔ انصاری صحابہؓ حضرت سعد بن عبادۃ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ طے کر چکے تھے، جب حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو اس کا علم ہوا تو وہ سقیفۂ بنوساعدہ جہاں انصار جمع تھے پہنچیں، اولاً حضرت ابوبکرؓ نے حدیث ''الائمۃ من القریش۔۔۔۔۔'' سنائی کہ خلیفہ کا استحقاق قریش کو حاصل ہے تو معاملہ سرد پڑا۔ ورنہ مہاجرین کہتے تھے ایک امیر ہم سے ہو اور اے انصار ایک تم سے، اور انصار کہتے تھے نہیں امیر تو ہم سے ہوگا اور وزیر تم سے حتی کہ اس میں کافی قیل وقال ہوا۔

لیکن جیسے اوپر مذکور ہوا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حدیث پیش کی اور فرمایا کہ نہ مجھے اس منصب کی لالچ ہے نہ میں نے کبھی اللہ تعالیٰ سے اس کی دعا کی ہے کہ ایسا منصب مجھے عطا فرما اور پھر انہوں نے بجائے اپنی ذات کے خلافت کے لیے حضرت عمر اور حضرت عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہما کا نام پیش کردیا۔ لیکن صاحب فراست حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگے بڑھ کر

حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے اور سب کو یہ کہہ کر لا جواب کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوبکرؓ کو اپنی زندگی ہی میں امام بنایا تھا لہٰذا خلافت کے مستحق وہ ہی ہیں۔ پھر دھیرے دھیرے تمام صحابہؓ بیعت ہو گئے اور معاملہ ٹل گیا۔ (نبراس شرح، شرح عقائد ۳۰۲) آپ نے غور کیا ہوگا کہ کس قدر عظیم حکمت سے بہت ہی بڑے فتنہ کو دبا یا ورنہ اغیار کہتے کہ نبی کے رخصت ہوتے ہی ان کے صحابہؓ میں عہدۂ خلافت کے لیے جنگ ہوئی جس سے تا قیامت مسلمان تاریخ میں اپنا وزن کھو دیتے۔ جزاھم اللّٰہ عنھم اجمعین احسن الجزاء۔

(۶) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے انتقال پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گزر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس سے ہوا تو حضرت عمرؓ نے ان کو سلام کیا لیکن حضرت عثمانؓ نے کوئی جواب نہیں دیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جا کر اس کی شکایت کر دی وہ دونوں حضرت عثمانؓ کے پاس آئے اور ابوبکرؓ نے اس کا تذکرہ کیا تو حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ نہ عمرؓ میرے پاس سے گذرے ہیں نہ انہوں نے سلام کیا ہے تو حضرت عمرؓ نے اللہ کی قسم کھا کر فرمایا واللہ میں نے سلام کیا ہے پھر بھی آپ نے جواب نہیں دیا ہے تو حضرت ابوبکرؓ سمجھ گئے اور حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ عثمانؓ واقعۃً معذور ہیں تو حضرت عثمانؓ نے تائید کی کہ ہاں اور وہ حضورؐ کے انتقال کی وجہ سے (ایک طرف شدید حزن وغم کا سوار ہونا تھا اور دوسری طرف) دین کے بارے میں سوال کرنا تھا وہ نہ کر سکا۔۔۔ جس کی آگے تفصیل ہے۔ (مشکوٰۃ شریف ۱۵)۔ دیکھئے حضرت ابوبکرؓ نے کس آسانی سے مسئلہ کو نمٹایا جب کہ حضرت عمرؓ اس کو بہت بڑی حیثیت دے کر شکایت کر رہے تھے اگرچہ وہ اپنے طور پر حق بجانب تھے۔

(۷) علامہ کردی رحمہ اللہ تعالیٰ نقل کرتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقدس نواسے حضرات

حَسَنین (حسن وحسین) رضی اللہ عنہما نے ایک مرتبہ دریائے فرات کے کنارے ایک بوڑھے دیہاتی کو دیکھا کہ اس نے جلدی جلدی وضو کیا اور اس طرح جلد بازی میں نماز بھی پڑھی جس میں مسنون طریقہ کی کوئی رعایت نہیں کی حضرات حسنینؓ اسے سمجھانا چاہتے تھے لیکن اندیشہ یہ تھا کہ یہ شخص عمر رسیدہ ہے کہیں اپنی غلطی سن کر بھڑک نہ جائے،

دونوں حضرات اس کے قریب پہنچے اور کہا کہ ”ہم دونوں جوان ہیں اور آپ تجربہ کار آدمی ہیں آپ وضو اور نماز کا طریقہ ہم سے بہتر جانتے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو وضو کر کے اور نماز پڑھ کر کے دکھائیں تا کہ ہماری کوئی غلطی ہو تو آپ ہمیں بتادیں۔ انہوں نے اس کے بعد سنت کے مطابق وضو کر کے سنت کے مطابق نماز پڑھ کر دکھائی۔ جب بوڑھے شخص نے سنتوں کی رعایت والا وضو اور نماز دیکھی تو سمجھ گیا کہ اصل میں ان کی اصلاح مقصود نہیں بل کہ میری اصلاح مقصود ہے لیکن انہوں نے ادب کے خاطر یہ طرز اختیار کیا ہے تو اس بوڑھے نے اعتراف غلطی کے ساتھ اپنی غلطی اور کوتاہی سے توبہ کی اور سنت طریقہ اختیار کیا (مناقب الامام الاعظم للکردی ۱/۳۹)۔

(۸) حدیث شریف میں ہے کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی کی نکیل پکڑ کر رات کی تاریکی میں چل رہے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوار تھے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا عقبہ میں تمہیں قرآن شریف کی دو بہترین سورتیں نازل شدہ نہ سکھاؤں؟ حضرت عقبہؓ نے فرمایا کہ حضورؐ نے مجھے سورۃ فلق وسورۃ ناس سکھائیں۔ لیکن اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے کچھ زیادہ خوش ہوتے نہیں دیکھا جب فجر کی نماز کے وقت ایک جگہ اترے تو آپؐ نے فجر کی نماز میں ان ہی دو (چھوٹی) سورتوں کو پڑھا اور نماز سے فارغ ہو کر (حضرت عقبہ کی طرف رخ فرما کر) فرمایا اے عقبہ تم نے کیسا پایا؟ (مشکوۃ شریف ۸۰)۔

تم نے کیسا پایا؟ کا ایک مطلب یہ ہے کہ اے عقبہ باوجود یکہ تم کو دو بہتر سورتیں سکھائی تھیں پھر بھی اس سے خوش نظر نہیں آ رہے تھے اور اب جب کہ ان دو چھوٹی سورتوں کو فجر کی نماز میں میں نے بڑی سورتوں کی جگہ پڑھ کر اس کی اہمیت جتلا دی تو اب ان کی اہمیت و بہتری سے تمہیں خوش ہونا چاہیے۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ایک یہ مطلب بیان کیا ہے کہ عقبہؓ رات کی تاریکی میں نکیل پکڑ کر نیچے چل رہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں سانپ بچھو وغیرہ سے حفاظت کے لیے یہ دو سورتیں سکھائی تھیں جن میں ہر مضر شئی سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ کا ذکر ہے۔ لیکن عقبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس مقصد کو سمجھ نہ سکے اور خوش نہ ہوئے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو فجر میں پڑھ کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ عقبہ دیکھا تم رات کی تاریکی میں ہر مضر شئی سے محفوظ ہو کر اب صبح کی روشنی تک صحیح وسالم پہونچ گئے یہ ان دو سورتوں کی برکت تھی جو تم کو اس وقت سکھائی تھیں۔ اس واقعہ سے یہ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ سکھانے اور کسی عمل پر لانے کے لیے بڑی حکمت سے کام لیا کرتے تھے اور موقع کی بات حکمت سے سکھاتے اور اس کے فوائد سے باخبر کرتے۔ (مرقاۃ المشکوۃ شریف ۲/۲۹۸)۔

(۹) **مجدد الملت حضرت تھانوی** رحمہ اللہ تعالیٰ نے اصلاح کرنے والوں کے لیے ایک بڑی اچھی بات تحریر فرمائی ہے۔ فرمایا کہ آپ کا کوئی بیٹا نالائق ہو اور آپ کو تنگ کرتا ہو تب بھی لوگوں کے سامنے آپ کی زبان پر اس کے عیوب نہیں آئیں گے بل کہ آپ چاہیں گے کہ اس کے عیوب کسی پر ظاہر نہ ہوں اور آپ اس کو تنہائی میں مناسب طریقہ سے سمجھائیں گے کہ یہ حرکتیں چھوڑ دو۔ یہ ہرگز نہ ہوگا کہ آپ اس کے عیوب جگہ جگہ گاتے پھریں۔ لہٰذا جس کی اصلاح کرنا ہے

اس کو اپنے بیٹے کی طرح سمجھ کر سمجھائیں۔ یہی اصلاح کا طریقہ ہے۔ تبلیغی اکابر فرماتے ہیں کہ لوگوں کے عیوب دوسروں سے اس طرح چھپاؤ جس طرح ان سے اپنے ستر کو چھپاتے ہو۔ کتنا مؤثر جملہ ہے!!

(۱۰) کبھی کبھار حکمت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جو کرنا چاہتے ہیں اسے وقتی طور پر کرنا چھوڑ دیں۔ کیوں کہ اس وقت اس کو کرنا ہی خلاف حکمت ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر کبھی مسئلہ کا حل یہی ہوتا ہے کہ اسے حل نہ کیا جائے اور اسے مسئلہ ہی نہ سمجھا جائے۔ حضرت اقدس حکیم الامت تھانویؒ نے شورش کے زمانہ میں اہل مدارس دیوبند کو لکھا کہ اب تک تو آپ حضرات تدابیر میں رہے، اب ترک تدابیر کر کے بھی دیکھ لیں یہ نسخہ بھی بڑا مجرب ہے۔ اور اس ترک تدابیر میں اگر کوئی نقصان ہوا بھی تو اتنا نہ ہوگا جتنا تدابیر میں ہوا ہے مگر اکثر لوگ تدابیرات میں ہی لگے رہتے ہیں۔ (العلم والعلماء ۸۷)۔

بندہ کہتا ہے کہ اس کی مثال خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت سے ثابت ہے۔ وہ ہے صلح حدیبیہ کا واقعہ کہ آپ اور آپ کے صحابہ کی کوشش تو عمرہ کی تھی لیکن کفار نے روکا اور مسئلہ کھڑا کیا تو آپؐ نے اس مسئلہ کو مسئلہ نہیں سمجھا کہ نہیں عمرہ کریں گے ہی بل کہ واپس مدینہ تشریف لے گئے تو خود بخود مسئلہ حل ہو گیا واقعہ شاہد ہے۔

(۱۱) کبھی حکمت کا طریقہ مقابلہ کا بھی ہوتا ہے۔ حضرت اقدس علامہ تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی اچھا طریقہ بتلایا ہے۔ آپ نے عصری اور مذہبی تعلیم کے دو طبقوں کی اونچ نیچ کو دیکھا کہ عصری تعلیم والے بایں وجہ مذہبی تعلیم والوں کو حقیر سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس نہ کوئی مال و دولت ہے نہ ان کو تعلیمی کوئی ملازمت ملتی ہے اور نہ ان کو کوئی پوچھتا ہے تو مذہبی تعلیم والوں کو فرمایا کہ تم بھی عصری تعلیم والوں کو حقیر سمجھنا شروع کر دو کہ یہ نوح علیہ السلام کی سنت ہے جیسے کہ قرآن کا ارشاد

ہے ''اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ''

اور الزامی جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ کبھی عصری تعلیم (بی،اے) کی ڈگری والوں کو بھی دیکھا ہے جن کو ملازمت نہیں ملتی یہ نوبت عربی پڑھنے والوں کی نہیں آتی۔ دیکھئے سب سے کم تعلیم اذان کا سیکھ لینا ہے اگر وہی آجائے تو پھر روٹیوں کی کمی نہیں۔ ایک شخص عصری تعلیم (بی اے) میں فیل ہوگیا تو شرم کی وجہ سے ریل کی پٹری پر لیٹ گیا اور خاتمہ ہوگیا۔ (العلم والعلماء ۲۹۷)۔

(۱۲) اب اخیر میں ایک بات خوب ذہن نشین کرلیں کہ آپ کو منصب امامت سے کبھی فریقین میں صلح بھی کرانی پڑے گی تو اس وقت کی خاص ہدایت یاد رکھیں جس کو حضرت حکیم الامت علامہ تھانویؒ نے بتائی ہے فرمایا کہ اصلاح (صلح) کے معنی یہ ہیں کہ حکم الٰہی کے موافق فیصلہ کیا جائے، اب اگر صلح کرانے میں کسی صاحب حق کو دبایا جائے تو یہ دبانا (مجبور کرنا) حکم الٰہی کے خلاف ہوگا یہ صلح نہیں۔

پس صلح کرانے کا آج کل جو طریقہ رائج ہے کہ دونوں فریق کو کچھ کچھ دبایا جاتا ہے حتی کہ صاحب حق کو بھی دبایا جاتا ہے یہ طریقہ درست نہیں، بل کہ صلح کا طریقہ یہ ہے کہ جو ناحق پر ہو اس کو ہی دبایا جائے۔ کیوں کہ صاحب حق کو دبانا اضرار (نقصان پہونچانا) ہے اور غیر صاحب حق کو دبانا اضرار نہیں بل کہ اس میں تو اس کو اضرار سے روکنا[۱] ہے۔ (العلم والعلماء ۸۵)۔

---

[۱] کام کی تدابیر کا بیان اخیر میں ہے

اصلاحی مرتّب درجاتِ معروفات

اصلاح میں اصل ابتدا تو منکرات سے ہے کما مرّ تاہم مصلحت کے پیش نظر معروفات سے مناسب ہے۔اس لیے اولاً معروفات کو بیان کیا جاتا ہے۔معروفات میں بہت سے درجات ہیں جن میں الاسہل فالاسہل کی رعایت بھی ملحوظ ہے۔

اصلاح کی دو جہتیں ہیں : ایک اجتماعی ۔ دوسری انفرادی۔ ذیل میں اجتماعی اصلاح کے مرتب درجات پیش کئے جاتے ہیں۔جنہیں مدنظر رکھ کر ائمہ حضرات اصلاحی کام کو بالترتیب سبقاً سبقاً انجام دیں۔لیکن اس کے ساتھ حسب موقع انفرادی اصلاح پر بھی توجہ فرمائیں بل کہ اسی پر زیادہ تر توجہ فرمائیں۔جیسے اوپر حکمت کی نظیروں میں انفرادی اصلاحات آپ نے ملاحظہ فرمائیں۔

عامۃ لوگوں میں جو دینی بے فکری، بے عملی بل کہ بدعملی ایسی راسخ ہوچکی ہے کہ کتنے ہی دینی پروگرام اور دینی باتیں پینے پلانے یا سننے سنانے کے باوجود ان میں عملی قدم مفلوج نظر آتے ہیں کوئی خاص عملی تبدیلی نظر نہیں آتی ان اصلاحی درجات سے اسی بے فکری و بے عملی اور بدعملی کو دور کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

ہاں کچھ حضرات جن کا کسی دینی شعبہ سے تعلق ہے ان میں تھوڑی بہت اصلاح نظر آتی ہے۔لیکن اکثریت اس سے محروم ہے۔اگر ہم اس اکثریت کی اصلاح کرنا چاہیں تو یہ بھی ایک مشکل کام ہے کیوں کہ نہ اس کا مہذب نظام نہ اس کا مرتّب کوئی نصاب نہ اصلاح کا کسی کے پاس کوئی منصب۔تو اس بارے میں ائمہ حضرات کی راہ نمائی کے لیے ہم نے معروفات ومنکرات کا ایک خاکہ ترتیب دیا ہے جو بمنزلہ نصاب کے ہے۔کیوں کہ منصب امامت اس کے

لیے بہت ہی موزوں ہے جس کا نیٹ ورک وسیع ہے اور وہ ہر جگہ میسر بھی ہے۔ لہٰذا ائمہ حضرات درجات کو ملحوظ رکھ کر اصلاح کا کام انجام دیں ان شاء اللہ ضرور مفید ہوگا۔

ان اصلاحات میں جب قدیم اسلوب سے صرف نظر کیا جائے گا اور جدید اسلوب اختیار کیا جائے گا، تب ہی وہ اس لائق ہوں گے کہ وہ دین کے لیے کچھ جدوجہد کریں۔ کیوں کہ قدیم طرز سے بڑی سے بڑی اور عمدہ سے عمدہ بات بھی (بے فکری کی وجہ سے) ماری جائے گی۔ جس کے لیے معروفات ومنکرات کے ختم بیان پر کام کی تدابیر کو ملاحظہ فرمائیں۔

یہ درجات ترتیب صعودی سے مرتب ہیں تا کہ ائمہ حضرات کو ان مرتب درجات سے اپنی محنت کا نتیجہ معلوم ہوتو ایک درجے سے دوسرے درجے کی طرف منتقل ہونے میں سہولت رہے۔ کیوں کہ اگر عمومی طور پر کیف ما اتفق تمام اعمال اسلامیہ ودینیہ کی طرف دعوت دی جائے جب کہ ائمہ حضرات کو نہ اپنی محنت کا کوئی مبدا معلوم ہو نہ منتہیٰ تو نتیجہ بھی کیسے معلوم ہوگا؟ ان درجات کی ترتیب وتالیف کا خاکہ ایسا ہی سمجھیں جیسا عربی مدارس کے درس نظامی کے نصاب کا ہے۔ کہ بعینہ یہ نصاب نہ شرعاً لازم ہے نہ اس کا ثبوت بل کہ مقصود منزل تک رسائی ہے چاہے جس طریق سے بھی ہو بشرطیکہ کہ وہ طریق کسی بھی طرح خلاف شرع نہ ہو۔

پہلا درجہ

اس درجے کے مباحث پڑھنے کے بعد فیصلہ فرمائیں کہ وہ موزوں ہیں یا نہیں۔ وہ یہ ہے کہ ائمہ حضرات لوگوں کو ایسے کام (معروف) کی طرف دعوت دیں جو بے حد آسان ہوں تا کہ لوگ بسہولت انجام دے سکیں۔ کیوں کہ مشکل کام ہوں گے تو ان کی رغبت کم ہوجائے گی۔

سوال یہ ہے کہ ایسے کونسے کام ہیں جو بے حد آسان ہوں۔ تو آیئے ہم اس کی مثالیں

بتاتے ہیں۔

اس درجہ کی مثالیں وہ افعال (باطنہ) ہیں جن میں بغیر کسی عمل کے آدمی اجر وثواب کا مستحق ہو۔وہ ہے فکر حسنہ۔۔۔اور تخیل وارادہ۔نفس انسانی کا خاصہ ہے کہ وہ اچھے اور برے خیالات سے کبھی خالی نہیں رہتا۔نیز انسانی قوتوں میں خیال وہ سپر پاور ہے جو آنکھ جھپکنے میں فرش سے عرش اور مشرق سے مغرب تک ہر شئی کو دیکھ لیتا ہے۔اسی لیے حدیث شریف میں اس کی اہمیت بتائی گئی ہے۔اگر اس قوت کو مسلمان کرلیا جائے تو زندگی میں زبردست انقلاب آسکتا ہے۔ترتیب یہ ہے کہ پہلے ذہن میں کوئی خیال پیدا ہوتا ہے پھر دل میں اس کو کرنے کا ارادہ آتا ہے پھر اس پر آدمی عمل کرتا ہے۔

اگر خیال پاکیزہ ہے تو ارادہ اور عمل بھی پاکیزگی لیے ہوئے ہوں گے۔اس لیے خیال کو مسلمان کرنا ضروری ہے۔اچھی سوچ اچھی عادتوں اور بری سوچ بری عادتوں کا ذریعہ ہے۔

فکر حسنہ

آیئے ہم ذرا معلوم کرتے ہیں کہ معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو کس قدر فکر حسنہ کی تعلیم دی ہے! جب اذان کو مشروع کرنے کا وقت آیا تو تمام عبادتوں کی مشروعیت کے طرز سے ہٹ کر اور طرز وطریقہ اختیار کیا گیا حالاں کہ بذریعہ حضرت جبرئیل (علیہ السلام) کلمات اذان دیئے جاسکتے تھے۔چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع فرمایا اور نماز کے لیے لوگوں کو مطلع کرنے اور جمع کرنے کے طریقہ کے بارے میں متفکر کیا اور رائے طلب کی کہ کیا طریقہ ہو؟ تو ہر ایک نے اپنے طور پر مختلف رائے پیش کی لیکن کوئی فیصلہ نہ ہوسکا آخر تمام صحابہ رضی

اللہ عنہم متفرق ہو گئے اور اس فکر کو لے کر اٹھے۔اس فکر کے نتیجہ میں تقریباً گیارہ صحابہؓ نے خواب میں اذان دینے والے کو اور اذان کے کلمات کو دیکھا اور سنا۔(مرقات شرح مشکوۃ ۱۴۹/۲)۔واقعہ مشہور ہے یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ اس جداگانہ طرز کا مقصد صحابہؓ کو فکر کی دولت سے آگاہ کرنا تھا۔ورنہ ایک روایت میں ہے کہ یہ کلمات اذان تو آپ کو شب معراج ہی میں بتلائے جا چکے تھے۔چناں چہ وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔خلاصہ یہ کہ ہم مقتدیوں سے غلط فکر اور بے فکری مٹا کر ان کو فکری زندگی گزارنے پر لائیں ان شاء اللہ ان کی زندگی میں انقلاب آئے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے سامان عبرت بنائیں۔آمین

حسن ارادہ

ائمہ حضرات مقتدیوں کو حسن نیت اور حسن ارادہ پر کھڑا کریں ان سے ابھی اچھے عملوں کی صرف نیتیں کرائیں۔یہ اتنا آسان ہے کہ کوئی بھی شخص اس سے عاجز نہیں۔کیوں کہ اس میں بدنی کسی عمل کی زحمت ہی نہیں اور وہ بغیر عمل کے اجر وثواب کے مستحق ہوں گے۔مثلا بہت سے لوگ فی الحال بہت سے کاموں کی قدرت نہیں رکھتے لیکن وہ اچھی نیتیں کر سکتے ہیں۔ مثلاً غرباء یہ نیت کریں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں مال عطا کیا تو سخی غنی کی طرح ہم بھی زکوٰۃ وصدقات دیں گے، حج کریں گے اور دیگر دینی مواقع میں خرچ کریں گے۔اسی طرح کوئی نوجوان بیمار ہو جس کی وجہ سے جوان تندرست کی طرح عبادت نہیں کر سکتا لیکن وہ نیت یہ رکھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے صحت دی تو میں عبادت کروں گا۔

حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مثال لکھی ہے کہ کوئی شخص مکان بناتے وقت یہ نیت کرے کہ کھڑکی اس لیے رکھتا ہوں تا کہ اس سے میں اذان کی آواز سن سکوں، کسی کی

فریاد سن سکوں اور مدد کر سکوں تو اس کو اس نیت کا ثواب ملے گا اور ہوا اور روشنی کا ملنا مفت ہوگا۔آپ خود بتائیں کہ کیا نیت کرنے میں مال صرف ہوتا ہے یا بدنی کوئی زحمت ہوتی ہے! کتنا آسان کام ہے۔یہی بات ایک حدیث سے بھی ثابت ہے۔چناں چہ مرقات شرح مشکوۃ میں لَاحَسَدَ اِلَّافِی اثْنَتَیْنِ (مشکوٰۃ ۳۲) کے تحت لکھا ہے کہ حسد تو حرام ہے لیکن اس جگہ حسد مجازی مراد ہے یعنی رشک اور غبطہ اور یہ جائز ہے۔جس کی مثال یہ ہے کہ کسی مالدار شخص کو مسجد وغیرہ بناتے وقت دیکھ کر کسی کا یہ نیت کرنا کہ کاش میرے پاس مال ہوتا جس طرح اس کے پاس ہے تو میں بھی اس طرح مسجد بنواتا۔پھر لکھا ہے کہ یہ رشک دنیوی امور میں مباح ہے اور دینی امور میں مستحب جو بہر صورت پسندیدہ ہے جس پر اجر وثواب ہے۔(مرقات شرح مشکوۃ ۴/ ۳۳۷)۔تو دیکھئے صرف حسن نیت پر ثواب مل رہا ہے۔

احادیث مبارکہ (۱) روایت ہے ''تَفَکُّرُ سَاعَةٍ خَیْرٌ مِنْ عبَادَةِ سَنَةٍ'' ایک ساعت کا فکر ایک سال کی (نفلی) عبادت سے بہتر ہے۔وذکر السیوطیؒ ''فِکْرَةُ سَاعَةٍ خَیْرٌ مِنْ عِبَادَةِ سِتِّیْنَ سَنَةً'' (مرقات شرح مشکوۃ ۲/ ۱۷۹)۔ایک ساعت کا فکر ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔(۲) علامہ طیبی اور ملا علی قاری رحمہا اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے ''قَدْوَرَدَ فِی مُسندِ اَبِی یَعْلیَ الْمُوصِلِی مَرْفُوعاً اِنَّ اللہَ تَعَالیٰ یَقُوْلُ لِلْحَفَظَةِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ...'' (مرقات شرح مشکوۃ ۱/ ۴۷)۔اللہ تعالیٰ قیامت کے روز نامۂ اعمال لکھنے والے فرشتوں سے ارشاد فرمائیں گے کہ میرے بندے کے نامۂ اعمال میں اتنا اتنا (یا ایسا ایسا) ثواب لکھو، تو وہ کہیں گے اے پروردگار اس بندے کا ایسا عمل جو اس نے کیا ہو ہم نہیں جانتے اور نہ اس کے دفتر میں لکھا ہوا ہے (کیوں کہ اس کو کرتے ہوئے ہم نے دیکھا ہی نہیں) تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے (کیا تو نہیں

لیکن) اس عمل کی اس نے نیت کی تھی۔ پہلی دو احادیث فکر حسنہ اور یہ حسن نیت کی فضیلت کو بتا رہی ہیں جس سے خوب واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ آدمی فکر حسنہ اور حسن نیت سے بغیر عمل بھی اجر وثواب کا مستحق بنتا ہے۔

(۳) ایک حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو نیت پر (وہ اجر وثواب) عطا فرماتے ہیں جو اعمال پر بھی عطا نہیں فرماتے۔ ''اِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ لَیُعْطِیِ العبدَ علی نیّتِهٖ مالا یُعطِیه علَی عَمَلِهٖ''۔ (مرقات شرح مشکوۃ ۱/۴۲)۔ اسی وجہ سے ایک حدیث شریف میں ہے نِیّۃُ المؤمِنِ خیرٌ مِن عملهٖ وفی روایۃٍ اَبلغُ مِنْ عملِه (مرقات شرح مشکوۃ ۱/۴۲) کہ مومن کی نیت اس کے عمل سے (بھی) بہتر ہے۔ اس سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ نیت، عمل سے بہتر ہے اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ نیت پر ثواب حاصل ہوتا ہے بل کہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نیت کا ثواب، عمل کے ثواب سے بہتر بھی ہوتا ہے۔

رہا مسئلہ نیت کی افضلیت کا کہ وہ عمل سے کیوں افضل ہے؟ تو شراح حدیث نے اس کی چند وجہیں ذکر کی ہیں۔

(۱) عمل میں تو ریا کاری کا احتمال ہوتا ہے کیوں کہ وہ ایک ظاہری شی ہے جب کہ نیت پوشیدہ شی ہے جس میں ریا کا احتمال نہیں۔

(۲) نیت اصل اور عمل فرع ہے اور اصل کا درجہ فرع سے بلند ہوتا ہے۔ نیز بسا اوقات فرع بغیر اصل کے پائی جاسکتی ہے یعنی عمل نیت کے بغیر پایا جاسکتا ہے تو اس صورت میں اس عمل کا ثواب حاصل نہ ہوگا نیتِ ثواب نہ پائے جانے کی وجہ سے۔ (مظاہر حق ۳/۱۹۵)۔

(۳) عمل کے مقابلہ میں نیت میں زیادہ گنجائش ہے کیوں کہ آدمی یہ نیت کرسکتا ہے کہ ساری زندگی اللہ کی فرمابرداری کروں گا نافرمانی ذرا بھی نہیں کروں گا، لیکن اس پر عمل بہت دشوار ہے لہٰذا

نیت کا ثواب ملے گا۔

(۴) نیت کا تعلق دل سے ہے اور اعمال کا تعلق اعضاء سے ہے اور دل اللہ تعالیٰ کی معرفت کا مرکز ہے اس لیے نیت افضل ہے۔ (روضۃ الصالحین ۳/۷ ۴)۔ ان احادیث مبارکہ کی روشنی میں واضح ہوگیا کہ مقتدیوں کو فکر حسنہ اور حسن نیت کی دولت دلانے سے تین بڑے فائدے حاصل ہوں گے۔

(۱) ان اعمال حسنہ کا اجر وثواب حاصل ہوگا جن کی سوچ جن کی نیت کی ہے۔

(۲) اس کا غیر معمولی فائدہ یہ ہے کہ یہ اچھی نیتیں، اچھے اعمال کا ذریعہ بنیں گی۔ کیوں کہ اکثر بدنی عمل اس وقت تک صادر نہیں ہوتا جب تک اس کے کرنے کا داعیہ اور ارادہ پہلے دل میں نہ آئے۔ (گویا نیت وارادہ اصل اور عمل اس کی فرع ہے)۔ اب جیسی نیت ہوگی ویسے اعمال صادر ہوں گے (انما الاعمال بالنیات)۔

(۳) برے اعمال کا سدباب ہوگا۔ یعنی جب اچھے اعمال صادر ہوں گے تو برے اعمال خود بخود چھوٹ جائیں گے۔ اندازہ کیجئے کہ بلا خرچ بلا مشقت کتنے بڑے فائدے حاصل ہو رہے ہیں اب کہئے کہ مقتدیوں کو ان پر لانا چاہیے یا نہیں؟ تو پھر پہلے درجہ میں مقتدیوں کو اچھی نیت اچھی سوچ کا عادی بنائیں۔

دوسرا درجہ

دوسرے درجہ میں ائمہ حضرات مقتدیوں سے وہ کام (معروفات) انجام دلائیں جو پہلے درجہ کے کاموں سے ذرا مشکل ہوں اور عمل سے تعلق رکھتے ہوں چاہے بہت کم تعلق ہو یعنی بہت آسان ہوں۔ اس درجہ کی دو مثالیں۔

پہلی مثال : مسلمانوں کا آپس میں سلام کرنا۔ظاہر ہے سلام کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔لہٰذا آپ مقتدیوں کو بتائیں کہ وہ آپس میں خوب سلام کو رواج دیں۔راستوں، بازاروں ،کھیتوں ، گھروں، مسجدوں اور مدرسوں سب ہی جگہ سلام کریں۔حتیٰ کہ پہچان والوں اور اجنبی مسلمان سبھی کو سلام کیا جائے۔اگر دور ہو تب بھی لیکن اس وقت سلام کر کے ہاتھ سے اشارہ بھی کیا جائے تاکہ معلوم ہو کہ آپ کو سلام کیا ہے۔

حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حدیث شریف میں ہے کہ سلام کو عام کرو، عام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اتنا عام کرو کہ وہ قوم کی وضع قطع کی حد میں شامل ہو جائے اور اس کی اتنی کثرت کرو کہ وہ قوم کی پہچان اور اس کا عرف بن جائے کہ لوگ ان کو سلام والے لوگوں سے پہچانیں۔سلام یہ مسلمانوں کا ایسا ہی تحیہ وادب ہے جس طرح مسجد کا تحیہ دو رکعت نماز اور کعبۃ اللہ کا تحیہ اس کا طواف ہے۔بہتر یہ ہے کہ جواب میں الفاظ مکمل کہے جائیں یعنی وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ کہے۔کیوں کہ جتنے زیادہ کلمات ہوں گے اس کا ثواب بھی زیادہ ہوگا جیسے مشکوٰۃ شریف کی حدیث ہے۔(مشکوٰۃ ۳۹۸)۔

دوسری مثال : ائمہ حضرات مقتدیوں کو بتائیں کہ جب لوگ ایک دوسرے سے ملیں تو خندہ پیشانی سے اور مسکراتے ہوئے ملیں کیوں کہ یہ مسکرانا بھی صدقہ اور اجر کا ذریعہ ہے ۔ حدیث شریف میں ہے "تَبَسُّمُكَ فِيْ وَجْهِ اَخِيْكَ صَدَقَةٌ"۔(مشکوٰۃ ۱۶۸)۔

بل کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان کو خوش کرنے کے بارے بڑی تعجب خیز بات لکھی ہے فرمایا! مسلمان کو بہر حال خوش کرو، یہ ایسی اور اتنی بڑی نیکی کا کام ہے کہ اس میں ریا نہیں ہوتا " تطییب قلب مسلم میں ریا نہیں" یعنی کسی بھی طرح مسلمان کو خوش کرنا نیکی اور

بھلائی ہے۔ پھر حضرت نے اس کو حدیث شریف کی روشنی میں ثابت کیا ہے آپ حوالہ پر ملاحظہ فرمائیں (خطبات حکیم الامت ۴۸۵)۔ اور حضرت ملا علی القاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی عمل کے بارے میں ایک عجیب بات لکھی ہے فرمایا: کہ کسی مسلمان کے دل کو خوش کرنا جن وانس کے مجموعہ اعمال سے بھی افضل عمل ہے "تَطْیِیبُ قَلْبِ الْمُؤْمِنِ اَفْضَلُ مِنْ عَمَلِ الثَّقَلَیْنِ "(مرقات شرح مشکوۃ ۴/۴۴۴)

آدمی کسی عمل کو انجام اس لیے نہ دے کہ اس میں مشقت ہوتی ہے تو اس کی کچھ وجہ بھی ہوسکتی ہے لیکن آپ خود فیصلہ کریں کہ ان دو درجات کے کاموں میں کوئی مشقت ہے؟ کتنے آسان کام ہیں!!! پھر اب تک انجام نہ دینے کی تین وجہیں ہوسکتی ہیں۔

(۱) اعمال سے بس بے فکری اور ان کی ناقدری۔

(۲) ضعف ایمان کی وجہ سے بے مشقت عمل کی بھی دلوں میں اہمیت کا نہ ہونا۔

(۳) ان کی صحیح طور پر فکری راہ نمائی نہ ہونا۔

آپ جانتے ہیں اس عمل کو لوگوں میں زندہ کرنے پر کیا فوائد مرتب ہوں گے؟ اس درجہ کے کاموں کو لوگوں میں پیدا کرنے میں ۴ بڑے فوائد حاصل ہوں گے۔

(۱) ان اعمال حسنہ کا اجر وثواب۔

(۲) فکر وشعور کا بیدار ہونا۔

(۳) بتدریج عملی مشقت کے مجاہدہ کی عادت۔

(۴) آپس کی دلی کدورتوں کا دور ہوکر، تعلقات کا استوار ہونا اور صلہ رحمی کا پایا جانا۔ سوچئے آپ ائمہ حضرات کی معمولی توجہ سے لوگوں میں کتنے بڑے بڑے فوائد مرتب ہو رہے ہیں تو پھر ضرور ان راستوں سے ان سے بے فکری کو دور کر کے فکر وشعور کو جگائیں۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق نصیب فرمائیں۔ آمین۔

تیسرا درجہ

اس درجہ میں وہ اچھے کام ہیں جو دوسرے درجہ کے کاموں سے کچھ مشکل ہیں لیکن ویسے وہ بھی آسان ہیں۔اس درجہ کی تین مثالیں۔

پہلی مثال : کسی مسلمان کو اس کی خوشی میں مبارک باد دینا اور اس کے رنج وغم میں شریک رہنا۔ ائمہ حضرات مقتدیوں کو اس کی خوب ترغیب دیں کہ ہر مسلمان چاہے غریب ہو کہ مالدار چھوٹا ہو کہ بڑا دوسروں کی خوشیوں میں مبارک باد دے، اور ان کی مصیبتوں پر ان کی خیر خبر لے ان کی تعزیت کرے۔

اور یہ بھی بتادیں کہ اس کے لیے وہ ان کے گھر جائیں صرف راستوں اور مسجدوں کی ملاقات کی مبارک باد پر اکتفانہ کریں۔اور یہ کہ ہر چھوٹی بڑی خوشی وغمی پر انہیں انجام دیں۔جب اس طرح انجام دیں گے تب اس کا اہتمام کرنا کہا جائے گا۔ مثلاً بچہ کی ولادت پر، شادی پر، منگنی پر، تعلیمی امتحان کی کامیابی پر، مکان ودکان کی خریداری پر، کوئی عالم ہے تو تعلیمی تکمیل پر، امامت وتدریس کی تقرری پر اور اس کی تالیف وتصنیف پر اور اسی طرح غمی کے موقع پر مثلاً انتقال پر، اور شادی کے بعد طلاق پر، گاڑی یا جانور کی ہلاکت پر، بیماری پر اور دکان ومکان میں کوئی مصیبت پہنچنے پر وغیرہ وغیرہ۔

دوسری مثال: ائمہ حضرات ان کو بتادیں کہ جب بھی ہم سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچ جائے (حالاں کہ تکلیف پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا) تو وہ فوراً بغیر کسی شرم وحیا کے کہیں کہ ہمیں معاف کرنا۔(جیسا کہ غیر لوگ Sorry کہنے کا اہتمام کرتے ہیں) اللہ تعالیٰ کو ایسی معافی بہت پسند ہے۔اللہ تعالیٰ لوگوں کی نگاہوں میں اس کے درجہ کو بلند فرمائیں گے۔قرآن وحدیث

میں اس کی بڑی فضیلت وارد ہے آپ اس کا مطالعہ کر کے مقتدیوں کو اس کی خوبیاں بتائیں۔

تیسری مثال: کسی کے احسان پر اس کا شکر بجالانا۔ اگر کسی نے ہم پر کوئی احسان کیا مثلاً ہمیں تجارت کی راہ نمائی کردی، بچوں کی تعلیمی راہ نمائی کردی، کوئی ہدیہ پیش کیا، کسی جانی ومالی نقصان سے بچادیا، تو اس کے اس احسان پر اس کا شکریہ ادا کرنا۔ چاہے یہ احسان کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ مثلاً ہمیں پانی کا گلاس ہی پیش کردیا، یا اس نے ہم تک ہمارے دوست کا سلام ہی پہونچایا، یا ہمارا کسی کے سامنے تعارف ہی کرایا۔ ان سب میں اس کو جزاك الله خیر الجزا سے دعادیں اور اس کا شکریہ ادا کریں۔

حدیث شریف کا خلاصہ ہے آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی کو ایسے طریقے سے خوش کرے جو اس کو پسند ہو تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اسے خوش فرمائیں گے۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ فرائض کے بعد اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین عمل مسلمان کو خوش کرنا ہے۔

کیا آپ ان مذکورہ معمولی کاموں کے فوائد جانتے ہیں کہ اگر ان کو محنت وکوشش سے لوگوں میں زندہ کردیا تو اس کے فوائد ونتائج کیا ہوں گے؟ ان سے لوگوں کے دلوں کی کدورتیں ختم ہوں گی۔۔۔ ان کے قلوب مجلیٰ اور صاف ہوں گے ۔۔۔ان کے آپس کا اختلاف اور بعد، الفت ومحبت اور قرب ونزدیکی سے بدلے گا۔۔۔کیا یہ معمولی چیز ہے؟ یہ تو اتنی مشکل چیز ہے جو محنت شاقہ کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی لیکن یہ چیز ائمہ حضرات کی محنت سے ان شاء اللہ آسانی سے حاصل ہوسکتی ہے جب کہ وہ مذکورہ طریقے سے محنت وکوشش کریں اور اس کی دعا بھی کریں۔

تدابیر : اس کو لوگوں میں لانے کے لیے اخیر میں تدابیر کا بیان ہے اس کو پڑھیں۔

●ایک کام یہ بھی کریں کہ ابتداء میں اپنے سے قریب آٹھ دس افراد کو ان مذکورہ عمل کے لیے خوب تیار کریں کہ وہ پہل کریں۔ وہ سب سے پہلے احسان کا شکریہ بجالانا، سلام کرنا، مبارک باد دینا خندہ پیشانی سے ملنا وغیرہ اختیار کریں پھر ان آٹھ دس سے سبقاً سبقاً ماحول ترقی کرے گا۔

●ان اچھے کاموں کی ترویج اور اس میں پختگی کے لیے دوسرا کام یہ بھی کریں کہ ائمہ حضرات جب مردوں کو ان امور کو انجام دیتے دیکھیں تو ان کو اس کا پابند بنائیں کہ وہ اپنے گھر کی پردہ نشین بہنوں کو بھی ان پر لائیں۔ اس سے ان شاء اللہ دوسروں میں عمل کا جذبہ پیدا ہوگا اور کام کا میدان ہموار ہوگا اور آپ ائمہ حضرات کے کام میں معاونت حاصل ہوگی۔

ایک غلط فہمی : درحقیقت لوگ دلی نفرتوں اور عداوتوں کے لحاظ سے اتنے برے نہیں ہوتے جتنا ایک دوسرے کو تھوڑی سی عداوت ہوجانے کے بعد سمجھنے لگتا ہے۔ حقیقت میں ہوتا یہ ہے کہ جب دو شخصوں میں کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو اس سے تھوڑی دوری پیدا ہوجاتی ہے جس کے بعد جو کوئی قول وفعل ایک دوسرے کے سامنے آتا ہے تو اسی بدظنی اور دوری کی وجہ سے اس کو عداوت پر محمول کرتا ہے پھر یہی بدظنی (بغیر تصفیہ وتحقیق کے) بڑھتی رہتی ہے جو ان دونوں میں بعد واختلاف اور عداوت کو پختہ کرتی رہتی ہے حتی کہ اس کی ہر حرکت وسکون اور ہر قول وفعل کو عداوت پر محمول کرتا رہتا ہے حتی کہ پھر وہ عداوت دو فرد سے متجاوز ہوکر گھر اور خاندان تک پہنچ جاتی ہے اور یہ مرض لاعلاج اور مہلک ثابت ہوتا ہے۔ حالاں کہ اتنے بڑے مرض اور خرابی کی تہ میں جاکر دیکھیں تو بدظنی اور شکوک وشبہات کے سوا کچھ نہ پائیں گے۔

اس مرض کے زائل نہ ہونے کی ایک وجہ اس کو اس وقت زائل کرنے کی طرف توجہ نہ کرنا ہے جب اس کا ابتدائی وقت تھا۔ اور دوسری وجہ صحیح طریقہ پر ازالہ کی کوشش نہ ہونا ہے۔ اگر

درست طریقہ سے کوشش کی جائے تو یہ ناممکن ہے کہ یہ مرض زائل نہ ہو۔اس کے ازالہ کا درست طریقہ یہی ہے کہ جب ابتدا میں عداوت واختلاف کے اسباب پائے جائیں تو ان دونوں میں سے کوئی ایک چھوٹا بن کر دوسرے سے معافی مانگ لے اور تصفیہ کرلیں اور کم از کم سلام کرے اور مسکرادے۔ یہ وہی کرسکتا ہے جس میں اسلامی ہمدردی ہو اور رضاء الٰہی کا جذبہ ہو اگر ایسا کرے گا تو خدا کی قسم اس کی عزت گھٹے گی نہیں بڑھے گی۔(مَنۡ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَهُ اللّٰهُ)

چوتھا درجہ

اس درجہ میں ائمہ حضرات اپنے مقتدیوں کو ایسے کاموں کی ترغیب دیں جو تیسرے درجہ کے کاموں سے ذرا مشکل ہوں۔مثلاً جو حضرات نمازوں کا اہتمام کرتے ہیں لیکن جماعت کا اہتمام نہیں کرتے ایسا اہتمام جیسے ہر مسجد میں دو چار کرتے ہیں۔اکثر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد ایک آدھ صف کے علاوہ ساری صفیں بقیہ رکعتوں کے لیے کھڑی ہوجاتی ہیں۔

تدابیر : ان کو جماعت کے اہتمام پر لانے کے لیے دو تین طریقے سے آپ سمجھائیں۔

● ایک تو جماعت کی فضیلت سنائیں جو فضائل اعمال کتاب میں موجود ہے۔جب فضائل والی احادیث سنائیں گے تو ان شاء اللہ وہ اس پر آنے لگیں گے۔ایک حدیث شریف میں ہے کہ جس طرح ہر چیز کا ایک خلاصہ ہوتا ہے اس طرح پوری نماز کا خلاصہ تکبیر تحریمہ ہے ”لِكُلِّ شَيۡءٍ صَفۡوَةٌ وَصَفۡوَةُ الصَّلٰوةِ التَكۡبِيۡرَةُ الۡاُوۡلٰى فَحَافِظُوۡا عَلَيۡهَا “ (مرقات شرح مشکوۃ ۳/۹۹ عن البزار وابی داؤد)۔ظاہر ہے اگر خلاصہ ہی فوت ہوجائے تو اس کا کمال ہاتھ نہ لگے گا۔

نماز کے لیے تحریمہ ایسا ہے جس طرح بدن کی زکوۃ روزہ۔جیسے کہ حدیث شریف میں

ہے کہ ہر چیز کی ایک زکوٰۃ (طہارت) ہوتی ہے بدن کی زکوٰۃ روزہ ہے، اور ہر چیز کی ایک بلندی ہوتی ہے اور قرآن کی بلندی سورۃ بقرہ ہے اور ہر چیز کی ایک صفائی ہوتی ہے دلوں کی صفائی اللہ کا ذکر ہے۔ (مشکوٰۃ ۱۸۹،۱۹۹)۔

● دوسرا طریقہ سمجھانے کا یہ ہے کہ آج کل ہر جگہ ہر ایک کے پاس وقت معلوم کرنے کے لیے گھڑی موجود ہے اور اذان کی آواز سنانے کے لیے لاؤڈ اسپکر ہے۔ اب ہر شخص اذان سن کر اپنے مکان، دوکان اور کھیت وغیرہ سے نکلتے وقت مسجد تک کے راستے، استنجاء اور وضو وغیرہ کے وقت کا اندازہ کر لے کہ مجھے ان سب کے لیے کتنا وقت درکار ہے تو یہ اندازہ اور حساب غلط نہیں پڑے گا اور تکبیر تحریمہ کو درست طور پر پالے گا بس شرط یہ ہے کہ حساب اور اندازہ کی عادت ڈالیں۔ پھر بتائیں کہ کل سے حساب لگانا شروع کر دیں ابتداء میں تھوڑی سی مشق کی ضرورت ہوگی پھر یہ چیز آسانی سے معمول میں آجائے گی۔

● تیسرا آسان طریقہ یہ ہے اگر فرض نماز سے پہلے جو بھی سنت مؤکدہ یا غیر مؤکدہ نمازیں ہیں سب ہی کو معمول سے پڑھنا ٹھان لیں بس پھر آپ کی جماعت ان شاء اللہ فوت نہ ہوگی۔ جس کے لیے آدمی اذان سنتے ہی اس طرح تیار ہو جائے جس طرح ریل میں سفر کرنے والے اسٹیشن سے اٹھتے وقت سیٹی بجنے پر تیار ہو جاتے ہیں اور گاڑھی میں چڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

مدینۃ المنورہ میں ایک حدّاد (لوہار) صحابی تھے جب وہ گرم لوہے پر کوٹنے کے لیے اپنا ہتھوڑا اٹھاتے اس عرصہ میں اگر اذان کی آواز کان میں پڑ جاتی تو اس ہتھوڑے کو رکھ دیتے اور نماز کو چلدیتے وہ اٹھائے ہتھوڑے سے آخری بار بھی کوٹنے کا کام نہ لیتے وہ کہتے اللہ کے منادی کی آواز سن کر اس کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس سے کام لیا جائے۔ اللہ اکبر!۔

مؤثر طریقہ: ایک بات آپ ائمہ حضرات کے کان میں کہتا ہوں اگر آپ اپنے مقتدیوں کو نماز و جماعت کا خوب اہتمام کرنے والے پاک باز اور نیک طبیعت دیکھنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے آپ کی جدو جہد ضروری ہے۔ اگر چہ آپ اہتمام کرتے ہی ہیں لیکن ایسا اہتمام مطلوب ہے جو امتیازی ہو۔ جس طرح برابر قد والوں میں کوئی بہت دراز قد والا شخص یعنی لمبا شخص آجائے تو کیسا امتیاز پایا جاتا ہے کہ سب ہی لوگ اس کو دیکھتے رہتے ہیں اس طرح کا امتیازی اہتمام ہو۔

کیوں کہ قائدین اور مقتدا کا، جدو جہد میں عام لوگوں سے فائق ہونا اسلام اور مسلمانوں کا وصف خاص ہے۔ پوری تاریخ اس کی شاہد ہے کہ جتنے پیشوا گذرے ہیں سب کی زندگی کا نمایاں وصف اور قیمتی سرمایہ یہ تھا کہ پہلے انھوں نے قربانی کا نمونہ پیش کیا تب لوگوں نے ان پر اعتماد کیا اور پھر لوگوں نے ان کے نقش قدم کی پیروی کی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے لے کر تابعین، مجاہدین اسلام، مبلغین دین، محدثین عظام، مفسرین قرآن، فقہاء اسلام اور سلوک وتصوف کے قطب وابدال، قطب ارشاد، قطب مدار، نقیب ونجیب اور وتید واوتاد وغیرہ اور ماضی قریب میں **حکیم الامت علامہ تھانوی اور بانی تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس** رحمہم اللہ تعالیٰ تک ہر ایک کی سیرت قربانیوں سے چھلک رہی ہے۔

طارق بن زیاد نے فتح اندلس کے وقت جو تاریخی خطبہ اپنے رفقاء کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے دیا تھا وہ بڑا پر اثر تھا جس میں قربانیوں بل کہ جان کی بازی لگانے کی دعوت تھی۔ فرمایا تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا اس وقت ممکن ہوگا جب تم اپنے آپ کو موت کی دعوت دو،

اور میں تمہیں ایسے معاملہ سے نہیں ڈراتا جس سے میں خود باز اور الگ رہوں، اور میں جس غیر معمولی کام (جان کی بازی) پر آمادہ کر رہا ہوں اس میں ابتدا اپنی ذات سے کروں گا۔ اور یہ بھی سمجھ لو کہ میں جس چیز کی طرف تمہیں دعوت دے رہا ہوں اس پر سب سے پہلے لبیک کہنے والا میں ہی ہوں گا، اور دونوں لشکروں کے مڈھ بھیڑ کے وقت سرکش قوم لُذریق پر سب سے پہلے حملہ میں کروں گا۔

"وإنَّ انتهازَ الفرصةِ فيهِ لَمُمكنٌ إنْ سَمَحْتُمْ لأنفسِكُمْ بالموتِ، وإنّي لَمْ أُحذِّرْكُمْ أمراً أنا عنه بنجوةٍ، ولا حملتُكمْ على خُطّةٍ أرخصُ متاعٍ فيها النّفوسُ إلّا أبدأُ بنفسي...... واعلموا إنّي أوّلُ مجيبٍ إلى ما دعوتُكُمْ إليهِ، وإنّي عندَ مُلتقى الجمعَيْنِ حاملٌ بنفسي على طاغيةِ القومِ لُذَريقَ"۔ (القراءۃ الرشید ۴/۸ص)

لہٰذا آپ کو بھی اپنے مقتدیوں کے لیے بطور نمونہ عمل پیش کر کے پھر ان سے جد و جہد اور قربانی کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ بس آپ اور خادم مسجد سب سے پہلے مسجد میں تشریف لائیں اور سنن ونوافل اور دیگر عبادتوں میں مصروف رہیں ان شاء اللہ مقتدی حضرات آپ کو دیکھ کر آپ کی اتباع کریں گے اور جب آپ اس کی دعوت دیں گے تو وہ اس پر لبیک کہیں گے۔ لہٰذا ماحول بنانے کی حد تک ان سنن ونوافل کو جو فرض سے پہلے اور بعد میں ہیں مسجد ہی میں ادا کریں۔ چاہے ان کو گھروں میں پڑھنا افضل ہے جیسا کہ حدیث عن کعب بن اجرة ؓ سے ثابت ہے۔ (مشکوٰۃ شریف ۱۰۵)۔

گھروں میں نماز نفل وسنت پڑھنے کی فضیلت بے شمار روایتوں میں وارد ہے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آدمی کی اپنے گھر میں پڑھی ہوئی نماز میری اس مسجد" مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم" میں پڑھی ہوئی نماز سے زیادہ افضل ہے سوائے فرض

نمازوں کے (مشکوٰۃ شریف ١١٥) حالاں کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایک فرض نماز پڑھنے کا ثواب ایک ہزار نمازوں کے پڑھنے کے ثواب کے برابر درجہ ہے۔لیکن اس حدیث شریف میں اس سے بھی افضل گھر میں پڑھنے کو بتایا جارہا ہے اس سے اندازہ کیجئے کہ گھروں میں پڑھنے کی ترغیب کتنی ہوئی۔گھروں میں پڑھنے کے چند فوائد ہیں۔مثلاً

(١) ریا کاری اور ناموری سے حفاظت ہوتی ہے۔

(٢) مکانات کی جن وانس کی شرارتوں سے حفاظت ہوتی ہے۔

(٣) اس سے گھروں میں نیکی اور سکون و برکت حاصل ہوتی ہے۔

(٤) مکینوں کی عمروں میں برکت اور نیکی کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔

(٥) گھر کے بڑی عمر کے بے نمازی لوگوں کے لیے عملی تبلیغ ہوتی ہے۔

(٦) چھوٹے بچوں کے لیے نماز کی عادت کا ذریعہ بنتی ہے۔وغیرہ وغیرہ۔

پانچواں درجہ

ان کاموں کا ہے جو اگلے درجہ کے کاموں سے اور ذرا مشکل ہیں کیوں کہ اب مشکل کاموں کی تھوڑی سی عادت بنتی جارہی ہے۔اس درجہ کی مثال لوگوں کو فجر اور عصر کی نمازوں کے بعد قرآن شریف کی تلاوت اور ذکر اللہ میں مصروف رکھنا ہے۔کیوں کہ ان دو اوقات میں ذکر اللہ کے فضائل بکثرت وارد ہیں۔ایک حدیث شریف میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: غافل لوگوں میں ذکر کرنے والا خشک درختوں میں سبز ٹہنی کی طرح ہے،اور غافلوں میں ذکر کرنے والا تاریک گھر میں چراغ کی طرح ہے اور غافلوں میں ذکر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ زندگی ہی ہیں اس کے جنت کا ٹھکانہ دکھائیں گے۔(مشکوٰۃ شریف ١٩٩)۔

زندگی میں جنت کا ٹھکانہ بتایا جانا کتنی بڑی دولت ہے اللہ تعالیٰ ہم کو یہ دولت نصیب فرمائیں۔زندگی میں جنت دکھائے جانے کے چند مطلب ہیں۔ایک یہ کہ یا تو خواب میں دکھائی جائے۔۔۔دوسرے بذریعہ کشف بیداری میں دکھائی جائے۔۔۔اور تیسری یہ کہ دنیا ہی میں ایسا پختہ آخرت میں حاصل ہونے کا یقین عطا کیا جائے گویا وہ اس وقت ہی دیکھ رہا ہے۔۔۔علماء فرماتے ہیں کہ یہ تیسری صورت کا حاصل ہونا پہلی دوصورتوں سے بہتر ہے۔نیز ذکر اللہ سے اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے جیسے ارشاد ہے ''اِنَّ اللہَ مَعَ الذَّاکِرِیْنَ'' جو لوگ معیت کا مفہوم جانتے ہیں وہ اس کی اہمیت کو جانتے ہیں کہ یہ کتنی بڑی دولت ہے۔

اگر وہ ان اوقات میں دس منٹ بھی اللہ کا مبارک ذکر کر لیتے ہیں تو بڑی توفیق اور سعادت ہوگی۔ابتدا میں یہ عمل صرف دس منٹ ہو تو کافی ہے پھر بتدریج حسب استطاعت اضافہ فرمائیں۔اس عمل میں (جماعت کا اہتمام کرنے اور نہ کرنے والے) دونوں طبقے کے لیے قربانی ومجاہدہ شامل ہے جو ان کی ترقی کا ذریعہ ہوگا۔لیکن اگر مسجد میں دعوتی محنت کی فضا پہلے سے قائم ہے اور ان نمازوں کے بعد مسجد وار جماعت کا کوئی عمل مثلاً دینی فکروں کا مشورہ یا کتاب کی تعلیم وگشت وغیرہ ہوتا ہو تو اس کو چھوڑ کر ذکر اللہ میں نہ لگائیں بل کہ اسی دعوتی عمل کو ترجیح دیں اور اس میں نمازیوں کو جوڑیں۔

کیوں کہ آدمی جب اپنے ساتھ دوسروں کے دین کی فکر کرے گا تو کافی حد تک اپنے دین کے بارے میں ضرور فکر مند رہے گا لہٰذا وہ ذکر بھی ضرور کر لے گا چاہے کوئی اور وقت میں کرے۔کیوں کہ دعوت آدمی کو خود اس عمل پر کھڑا کرتی ہے جس کی دعوت دی جاتی ہے اور ظاہر ہے یہ ایمان ونماز،علم وذکر، اکرام واخلاص اور جان ومال کو راہ خدا میں قربان کرنے کی دعوت

ہے تو پھر اس سے بہتر اور کیا عمل ہوگا؟

ایک عالم نے اپنی کتاب میں ”لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ“ کے تحت بڑی عمدہ بات لکھی ہے کہ قیامت کے روز (بندوں سے) خدا کی دی ہوئی نعمتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا، حتیٰ کہ ٹھنڈے پانی کی نعمت حاصل ہے تو اس کے بارے میں بھی سوال ہوگا۔ اور تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت دین ہے۔ دین کے بارے میں صرف دین اختیار کیا یا نہیں اتنا ہی سوال نہیں ہوگا بل کہ دین کے لیے عطا کردہ صلاحیتوں مثلاً صحت ۔۔۔ عقل ۔۔۔ قوت ۔۔۔ زبان ۔۔۔ اور علم وغیرہ کے بارے میں بھی سوال ہوگا کہ اگر کسی کو دوسروں کے مقابلے میں یہ صلاحیتیں اعلیٰ درجہ کی ملی تھیں اور وہ شخص صرف اپنے دین کو اختیار کر کے بیٹھا رہا تو اس بارے میں اس کا مؤاخذہ ہوگا۔

کیوں کہ اعلیٰ صلاحیتیں اعلیٰ دینی امور انجام دینے کے لیے عطا کی تھیں۔ جب ٹھنڈے پانی پر سوال ہے تو ان اعلیٰ حلاحیتوں پر کیوں سوال نہ ہو؟ کہ یہ اسی لیے عطا کر رکھی تھیں تا کہ دوسروں کو بھی دین پر حتی الوسع لاتا رہے۔ لہٰذا صرف اپنے اعمال اختیار کر کے یا صرف مکتب و مدرسہ کے طلباء کو پڑھا کر یا صرف امامت کر کے بے فکر نہ ہو جائے۔ بڑی عمدہ سمجھداری کی بات کہی ہے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ جو لوگ دین و ایمان میں حد درجہ کمزور ہیں، اعمال دینیہ سے بھی دور ہیں بل کہ ان میں دینی کوئی طلب ہے نہ شعور ان میں طلب جگانا اور پھر ان کو اعمال پر کھڑا کرنے کے لیے تعلیمی حلقوں اور مسجد وار جماعت میں جوڑنا اور دینی فکروں میں شامل کرنا اعلیٰ درجہ کا کام ہے۔ لہٰذا دعوتی و ایمانی فضا کو چھوڑ کر کسی خاص عمل میں نہ لگائیں اس طرف ہر امام صاحب کی نظر جانی چاہیے، اللہ تعالیٰ سمجھ عطا فرمائیں اور اس کی توفیق بھی۔

اگر بازار کی مسجد ہے جہاں نمازی لوگ نماز کے بعد فوراً اد کانوں پر چلے جایا کرتے ہیں تو انہیں بھی یہ بتادیں کہ یہ اگر چہ آپ کی مصروفیت کا وقت ہے لیکن رضاء الٰہی کے لیے کم سے کم پانچ منٹ بھی مسجد میں بیٹھ کر ذکر کرلیں اور بقیہ تسبیحات راستوں اور دکانوں پر پوری کرلیں، اور فجر کی نماز کے بعد اپنے محلے کی مسجد میں پڑھ لینے کی فکر دلادیں کہ وہاں اطمینان سے ممکن ہے۔

ذکر کے لیے تین تسبیحات ایک استغفار کی دوسری تیسرے کلمہ کی اور تیسری دورد شریف کی۔ اور اگر کوئی کسی شیخ سے مرید ہے تو ان کے بتائے ہوئے معمولات کا ورد کرے۔ مسجد میں ذکر کرنے اور قرآن شریف کی تلاوت کرنے والوں کو آداب سے بجالانے کو بھی بتادیں کہ اگر عذر نہ ہو تو رو بقبلہ باادب ہو کے استحضار کے ساتھ ان کو بجالائیں ان شاء اللہ کچھ وقت کے بعد آپ اس کا اثر ضرور دیکھیں گے کہ لوگ ان اعمال نبویہ واعمال آخرت پر آرہے ہیں۔ کیوں کہ جو باپ یا استاذ یا امام یا شیخ کسی عمل کو اختیار کرتا ہے تو اس کے ماتحت افراد بیٹا، شاگرد و مقتدی اور مرید بھی اس کو اختیار کرتے ہیں۔

جب لوگ ان کاموں پر آجائیں تو ان کو فضائل اعمال کی تعلیم جس نماز کے بعد ہوتی ہو اس میں شرکت کی ترغیب دیں۔ کیوں کہ اس سے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وبڑائی آئے گی، اوامر ونواہی میں امتثال اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سنتوں کی اہمیت اور ان پر عمل کی توفیق ہوگی اور مجاہدہ کی عادت بنے گی اور عمل کے ساتھ ضروری علم آئے گا اور وہ جہالت، بدعات، رسومات، برائیوں، غفلت، ریاکاری، کبر وحسد اور بدعملی سے بچ کر اور نکل کر صفات حمیدہ سے آراستہ ہوں گے۔ ان کو یہ بتادیں کہ اس تعلیم اور دینی فکروں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا پانی زندگی

کے تمام شعبوں میں پہونچے گا۔

چھٹا درجہ

اس درجہ میں وہ کام شامل ہیں جو پانچویں درجہ سے بھی مشکل ہیں۔

پہلی مثال : فجر کی نماز کے بعد ذکر وتلاوت میں اشراق تک مشغول رہ کر اشراق کی نماز پڑھنا۔ نیز فرض نمازوں کے ساتھ تمام سنن ونوافل کا پڑھنا چاہے سنن رواتب ہوں کہ غیر رواتب۔

دوسری مثال: اوابین کی نماز پڑھنا اور شب وروز میں سے کچھ وقت دعاء کے لیے فارغ کرنا کہ اہتمام سے روزانہ اس میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی جائے۔

حضرت مولانا احسان الحق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مترجم حیاۃ الصحابہؓ نے ایک مرتبہ فرمایا گھڑی میں دیکھ کر روزانہ بیس منٹ دعا مانگو۔ حضرت مولانا محمد یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سب کو دعا والے بنا کر گئے ہیں، یہ نہیں کہ بزرگوں کے ہوتے ہوئے ہم کیا دعا مانگیں۔ سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہوتے ہوئے ایک تابعی دعا مانگتا ہے اور اس کی دعا پر سواری زندہ ہوتی ہے۔

(پھر دین کی دعوت کی اہمیت پر فرماتے تھے) یہ راستہ یوں نہیں دیا گیا کہ بعض دعا والے بن جائیں، بعض شیطان بن جائیں اور جب ان پر مصیبت آجائے تو وہ دعا والوں کے پاس چلے جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہ راستہ دے کر نہیں گئے نہ عالموں کو عوام پر چھوڑا نہ حاکم کو محکوم پر نہ محکوم کو حاکم پر چھوڑا۔ تم ذرا تصور کرو اس زندگی کا کہ کوئی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا، کسی کی چیز پر نگاہ نہیں رکھتا، کوئی کسی سے لالچ نہیں رکھتا، ہر ایک کی زندگی مستقل بن رہی ہے، چیزوں

پر موقوف نہیں، ۲۴ گھنٹے زندگی کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں پر گزار لو، ان کے طریقے سے پیسے گھٹے تو گھٹنے دو، کیوں کہ پیسے کے راستے سے دعا قبول نہیں ہوگی، آپؐ کے راستے سے دعا قبول ہوگی، تو صالح بن، تو ولی بن، تو دعا والا بن، (تحفۃ الائمہ ۴۵)۔

مقتدیوں کو دعا کے آداب سکھائیں اور یقین کے ساتھ دعا مانگنے کو کہیں اور دعائیہ کلمات کی رہبری بھی فرمائیں۔ کیوں کہ دعا اعلیٰ اوسط اور ادنی مرادوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

● وہ یہ کہ اپنی دنیوی ضرورتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ہدایت، اعمال صالحہ کی توفیق، ایمان کامل اور حلاوت ایمان، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں اور سنتوں کا شوق ان پر عمل کی توفیق، ایمان کامل پر موت، دنیا و آخرت کی بھلائی، عافیت و برکت، حلال رزق وغیرہ اللہ تعالیٰ سے طلب کریں۔ یہ چیزیں اپنے لیے اور اعزہ و اقارب اور تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے بھی مانگیں اور پوری امت کے لیے اللہ تعالیٰ سے مانگیں۔

● اور یہ مانگیں کہ اے اللہ امت کو ضلالت سے ہدایت پر۔۔۔ معصیت سے طاعت پر۔۔۔ جہالت سے علم پر۔۔۔ غفلت سے تیری یاد پر۔۔۔ پستی سے بلندی پر۔۔۔ اور اختلاف سے اتحاد و اتفاق پر کھڑا فرمائیے۔۔۔ اور اے اللہ دین کو امت میں زندہ فرمائیے۔۔۔ اور دین کی محنت کو زندہ فرمائیے۔۔۔ اور نبی والا غم اور نبی والی فکر ہم سب کو نصیب فرمائیے وغیرہ۔

ساتواں درجہ

چھٹے درجہ کے بعد اگر آپ چاہیں تو اس ساتویں درجہ کا اضافہ کریں (ورنہ اس کے بعد والا درجہ اختیار کریں)۔ اضافہ کے اس درجہ میں ذیل کی چیزیں پیش کر سکتے ہیں۔

پہلی مثال: مختلف دعائیں اور سنتیں سکھائیں۔

دوسری مثال: آپ مقتدیوں کو باوضو رہنے کی ترغیب دیں۔

اگر چہ عام لوگوں کے لیے ابتداءً مشکل ہے، کیوں کہ عامۃً یہ سمجھا جاتا ہے کہ وضو تو صرف نمازوں اور قرآن شریف کے پڑھنے کے لیے ضروری ہے۔ لیکن بذات خود یہ عمل آسان ہے اگر اس کی فضیلت بتائی جائے۔ حدیث شریف میں ہے کہ وضو پر مداومت مومن ہی کرتا ہے۔ یعنی باوضو رہنے کی صفت مومن کی بتائی ہے نیز اس سے خطائیں معاف ہوتی ہیں، نیکیاں حاصل ہوتی ہیں۔

فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ نے وضو پر ایک واقعہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غلاف کعبہ کے لیے کپڑا خریدنے کے واسطے کسی کو مصر بھیجا۔ ملک شام سے گزرتے ہوئے کسی راہب کا عبادت خانہ دکھائی دیا، وہ صحابی رضی اللہ عنہ اس کی ملاقات کے لیے گئے دروازہ پر دستک دی کافی دیر بعد دروازہ کھلا اور ملاقات ہوئی تو راہب سے تاخیر کی وجہ پوچھی، راہب نے کہا آپ کو دور سے آتا دیکھ کر ہم سب پر ایسی ہیبت طاری ہوئی جیسی کسی بادشاہ کی ہوتی ہے اس سے ہم ڈر گئے اور وضو کر کے نماز پڑھنے لگ گئے پھر دروازہ کھولا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا تھا اگر کسی بادشاہ کا خوف ہوا کرے تو وضو کر لیا کرو اور سب گھر والوں کو بھی وضو کرادیا کرو باوضو آدمی میری حفاظت میں رہتا ہے۔ (روضۃ الصالحین ٣/ ١٦٨)۔

اور وضو کی برکت کا حدیث میں بھی ذکر ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا بلال تم کیا عمل کرتے ہو کہ میں نے تمہارے جوتوں کی آہٹ جنت میں سنی۔ عرض کیا ہمیشہ باوضو رہتا ہوں اور جب بھی نیا وضو کرتا ہوں تو دو رکعت تحیۃ الوضو پڑھتا ہوں

۔ یہ تھی وضو کی برکت۔

علماء نے لکھا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو ہیں تو نفل لیکن فرض سے بڑھی ہوئی ہیں۔ (ویسے ہر فرض عمل، نفل عمل سے ۷۰ درجہ بڑھا ہوا ہوتا ہے سوا ان تین عمل کے) ایک قرض معاف کرنا جو قرض میں مہلت دینے سے افضل ہے۔ دوسری سلام میں پہل کرنا جو جواب سے افضل ہے۔ تیسری وقتِ نماز سے پہلے وضو کرنا جو وقت کے آنے کے بعد وضو کرنے سے افضل ہے۔ (مظاہر حق ۳/۵۲۷)۔

تیسری مثال : مقتدیوں کو موقع کے نفلی اور سنت روزوں کا عادی بنانا ہے۔ احادیث میں جو روزوں کے فضائل وارد ہیں وہ انہیں سمجھانا اور ترغیب دینا ہے۔ ایک حدیث شریف کا خلاصہ ہے کہ جو کوئی صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ایک نفل روزہ رکھے تو اللہ تعالیٰ اس کے اور جہنم کے درمیان اتنی مسافت قائم کر دیتے ہیں جتنی کسی کوّے کے بچہ ہونے کی عمر سے بوڑھے ہو کر مرنے تک اڑنے میں ہوتی ہو۔ (مشکوٰۃ ۱۸۱)۔

شراح حدیث رحمہم اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ کوّے کی عمر ہزار برس ہوتی ہے۔ اس سے اس مسافت و دوری کا اندازہ ہوا کہ وہ کتنی بڑی دوری ہوگی۔ اس طرح کے عمل سے لوگوں میں دینی شوق جگانا ہے اور ان کے اندر سے بے فکری اور غفلت کو دور کرنا ہے تاکہ وہ دین سے اس طرح وابستہ ہوں جس طرح دنیا سے وابستہ ہیں۔

آٹھواں درجہ

معروفات کے سابقہ درجات میں یہی درجہ اصل اور بنیاد ہے کیوں کہ اس درجہ میں اسلامی بنیادیں اور اسلامی فرائض شامل ہیں۔

پہلی مثال : نماز ہے۔ جو مسلمان مسجد اور نماز سے دور ہیں ان کو موقع و محل سے

بطور خاص نماز پر لانے کی فکر کی جائے۔

تدابیر

پہلی تدبیر : جس کی ایک صورت یہ ہے کہ اب جمعہ کے بیان میں خصوصیت سے نماز کا موضوع لے کر ترغیبی پہلو سے سنجیدگی کے ساتھ نماز پر آمادہ کیا جائے۔ اس طرح دو تین جمعہ کیا جائے۔

دوسری تدبیر : اگر اس کے بعد بھی کوئی فرق ظاہر نہ ہو تو دوسری صورت یہ ہے کہ جماعتوں کی نماز کے بعد آپ امام صاحب اور دوسرے دو ساتھی مل کر ان کے گھر جا کر سمجھائیں شرمندگی سے ان شاء اللہ ضرور نماز پر کھڑے ہوں گے۔ پہلے عصر و مغرب اور عشاء کی نمازوں میں ایسا کریں پھر فجر اور ظہر میں جن میں نیند کا غلبہ رہتا ہے۔ کسی بھی طرح کسی بھی حکمت سے ان کو نماز پر کھڑا کریں۔ اور خصوصًا ۴۰ دن اس طرح نماز پڑھائیں کہ وہ تکبیر تحریمہ کو پالیں۔ کیوں کہ

اولاً جب کوئی نماز پر کھڑا ہوگا تو اس کا مطلب وہ آئندہ ان شاء اللہ برائیوں اور گناہوں سے بچے گا کیوں کہ نماز کی تاثیر یہ ہے کہ وہ نمازی کو برائیوں سے بچاتی ہے ’’اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ‘‘۔

ثانیاً کسی مسلمان کو ۴۰ روز تکبیر تحریمہ پانے پر کھڑا کرنے کا مطلب اس کو نمازی بنانا ہے۔ کیوں کہ حدیث شریف میں ہے کہ اس سے دو براءتیں یعنی دو نجاتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک جہنم سے نجات دوسری نفاق سے نجات (مشکوۃ شریف ۱۰۲)۔ یہ عمل کسی کو نمازی بنانے کے لیے بہترین نسخہ ہے۔ کیوں کہ جب چالیس دن تک مسلسل تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز پڑھے گا تو اس کی برکت سے وہ منافق نہیں رہے گا تو پھر وہ نمازی ہو جائے گا۔

دوسری مثال : رمضان شریف کے روزوں اور اہل ثروت کے مالوں کی زکوٰۃ کی

ادائیگی اور صاحب استطاعت لوگوں کے وظیفۂ عمر حج بیت اللہ ادا کرنے کی محنت وفکر کی جائے۔ لہٰذا بڑی تیاری اور حکمت کے ساتھ اس طرح ترغیب دیں کہ لوگ ان کو بجالانے پر آمادہ ہوں۔

آپ کتنے خوش قسمت ہوں گے اگر آپ کی حکمت بھری فکروں اور کوششوں سے لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے اوامر زندہ ہوں۔ شاید آپ کو یہ خیال ستا رہا ہو کہ اصلاحی درجات میں فرائض کو مقدم کرنا چاہیے انہیں مؤخر کیوں کیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے جیسا کہ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی ادب کو چھوڑتا ہے تو وہ نوافل سے محروم کر دیا جاتا ہے اور جو نوافل سے محروم ہوتا ہے وہ پھر سنتوں سے محروم کر دیا جاتا ہے، اور جو سنتوں سے محروم ہو وہ فرائض سے محروم کر دیا جاتا ہے اور جو فرائض سے محروم ہو تو قریب ہے کہ وہ معاصی کا مرتکب ہو۔ (تعلیق الصبیح ۱/۴۲)۔ یعنی کسی بھی عمل صالح اور نیکی کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ یہی چھوٹی چھوٹی نیکیاں بڑی نیکیوں کا دروازہ کھولتی ہیں۔

جب یہ بات ہے تو اوپر کے درجات کے نیک عمل مثلاً سنن و نوافل، ذکر و تلاوت اور دعائیں وغیرہ ان شاء اللہ فرائض پر عمل کا دروازہ کھولیں گے۔ مذکورہ فرائض میں سے آپ ایک ایک کو باری باری لے کر خوب ترغیب وحکمت سے سمجھائیں اور ترغیب کے لیے احادیث مبارکہ کا مطالعہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ان مذکورہ اعمال پر آپ کے تمام مقتدیوں کو قائم فرمائیں۔ آمین۔

يَارَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلَى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

فصل سوم : اصلاحی مرتّب درجاتِ منکرات

ماقبل میں یہ بات گزر چکی ہے کہ اصلاً اصلاح میں منکرات کو چھڑانا مقدم ہے پھر معروفات پر قائم کرنا ہے۔لیکن گناہوں کی عادت کی وجہ سے ان کا چھڑانا ذرا مشکل ہے اس لیے اولاً معروفات کے ذریعہ اصلاح مناسب ہے جس سے امتثال امر کی ایک طرح کی استعداد پیدا ہوگی تو پھر منکرات چھوڑنے کی استعداد بھی پیدا ہوگی اس لیے اب منکرات کو بیان کیا جاتا ہے۔منکرات کے درجات میں بھی الاسھل فالاسھل کی رعایت ملحوظ ہوگی۔

پہلا درجہ

پہلے درجہ میں ایسے منکر اور ایسی برائی کو چھڑانے کی کوشش نہ کی جائے جس میں پوری قوم مبتلا ہو اور اس کی عادت لوگوں میں پختہ ہو چکی ہو، ورنہ لوگوں پر شاق ہوگا اور ہماری کوشش کا ثمرہ مؤخر ہو جائے گا۔بل کہ ایسی برائی کی کوشش کرنی ہے جو یا تو چند افراد میں ہو یا سب میں ہو لیکن پختہ نہ ہو۔آپ اس درجے کی چیز پر اور اس کی مثال پر اور اس کی تدابیر پر غور فرمائیں کہ کیا یہ چیزیں موزوں ہیں یا نہیں؟

اس درجہ کی مثال لوگوں کا اپنے گھروں کی صفائی کر کے اس کا کوڑا کرکٹ یا تو دوسرے کے گھر کے سامنے یا عام سڑک پر ڈال کر لوگوں کو تکلیف پہنچانے سے بچانا ہے۔سوچئے لوگوں کا عمل کس قدر خلاف شریعت جا رہا ہے۔شریعت کا حکم تو یہ ہے کہ آدمی راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دے تا کہ دوسروں کو راحت حاصل ہو لیکن ہو یہ رہا ہے کہ دوسروں کو تکلیف پہنچانے سے ہی فرصت نہیں۔یہ ہے ہمارے اسلام کی حالت۔کسی کو تکلیف پہنچانے کا یا کسی گناہ کے

ارتکاب کا عامۃً سبب بوجہ ضعف ایمان اس شخص کو یا اس گناہ کو حقیر سمجھنا ہوتا ہے تب ہی تو اس کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ ورنہ جو اپنے نزدیک قابل تعظیم ہو اس کو کون تکلیف پہنچاتا ہے!۔

حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تین باتیں خوب ذہن نشین رکھو اور ان سے ضرور بچو اور دوسروں کو بھی ان سے بچاؤ۔

(۱) کسی بھی مسلمان کو حقیر نہ جانو ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے اس میں ولایت چھپائی ہو!!! ''لَعَلَّ خَبَّأَ اللّٰہُ فِیْہِ وِلَایَتَہٗ''۔

(۲) کسی بھی طاعت کو حقیر نہ سمجھو ہو سکتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضامندی چھپا رکھی ہو۔

(۳) کسی بھی گناہ کو معمولی نہ سمجھو ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی ناراضگی چھپا رکھی ہو۔ (نبراس شرح شرح عقائد ۱۷۳)۔

حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ میں نے اپنے بے شمار بزرگوں سے سنا فرماتے تھے کہ میری حالت یہ ہے کہ میں ہر مسلمان کو اپنے آپ سے فی الحال اور ہر کافر کو احتمالاً افضل سمجھتا ہوں! مسلمان کو تو اس لیے افضل سمجھتا ہوں کہ وہ مسلمان اور صاحب ایمان ہے۔ اور کافر کو اس وجہ سے کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی ایمان کی توفیق دیدیں اور وہ مجھ سے آگے بڑھ جائے۔ لہٰذا کسی کافر کو بھی حقیر نہ سمجھنا چاہیے اور شفقت و خیر خواہی سے اس پر محنت کی جائے کیا بعید ہے کہ اللہ پاک تمہیں اس کی ہدایت کا ذریعہ بنادیں اور تمہارے لیے ذخیرہ آخرت بن جائے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۱/۲۲۷)۔

◆ **تدبیر** : لہٰذا ائمہ حضرات اس قبیح فعل کے دینی و دنیوی نقصانات مقتدیوں کو سمجھا کر اس سے بچائیں۔

(۱) دینی نقصان یہ کہ احادیث مبارکہ میں دوسروں کو تکلیف پہنچانے کی جو وعیدیں ہیں وہ سمجھائیں مثلاً: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو شخص (کسی مسلمان کو) نقصان پہنچائے گا اس کو اللہ تعالیٰ نقصان پہنچائے گا، اور جو کسی کو مشقت و تکلیف میں ڈالے گا اللہ تعالیٰ اس کو تکلیف میں ڈالے گا (ترمذی ۲/۱۶)۔ دوسری حدیث شریف میں ہے وہ شخص ملعون ہے جو کسی مسلمان کو ضرر پہنچائے یا اس کے ساتھ کوئی مکر اختیار کرے۔ (ترمذی ۲/۱۶)۔ مطلب جو شخص کسی مسلمان کو خواہ ظاہری طور پر یا پوشیدہ طور پر ضرر پہنچائے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہوگا۔

(۲) دنیوی نقصان مثلاً گندگی کا پھیلنا، طبیعت کا مکدر رہنا، صحت کا خراب ہونا اور لوگوں کی نظر سے گر جانا وغیرہ۔ جب آپ ان مذکورہ نقصانات پر اور مسلمانوں کی ہمدردی و خیر خواہی پر روشنی ڈالیں گے تو لوگ آپ کی موافقت کریں گے آپ کی ہمنوا بنیں گے۔ کیوں کہ لوگ فطری طور پر نظافت پسند ہوتے ہیں تب ان کی یہ ہمنوائی آپ کے لیے معین و مددگار ہوگی۔

◆ خاص تدبیر : عمومی و کلی تدابیر کا ذکر تو سارے درجات کے اختتام پر ہوگا لیکن اس کی جزئی و خصوصی تدبیر اس طرح اختیار کریں۔ کہ ہفتہ میں دو بار کسی نماز کے بعد تمام نمازیوں کے سامنے اس کی ترغیب دیں۔ جب ترغیب کے دو ہفتے گزر جائیں تو آپ اور دو ایک معزز شخص لوگوں کے گھروں کے سامنے اور سڑک پر اس طرح سے گزریں کہ اگر کسی کے گھر کے سامنے کوڑا ڈالا ہوا ہو تو تھوڑی دیر وہاں کھڑے رہ کر اس کوڑے پر اور ادھر ادھر لوگوں کے گھروں پر اس طرح نظر ڈالیں کہ لوگ آپ کی اس جانچ پڑتال کی ہیئت کو دیکھ لیں۔

اگر کوئی صفائی کے لیے آ گیا تو الحمد للہ۔ نہیں تو آپ از خود اس کوڑے کو راستہ وغیرہ سے ہٹا دیں۔ جب محلے کے لوگ آپ کو صفائی کرتے دیکھیں گے تو پھر کچھ لوگ آ کر خود صفائی

کرلیں گے اورڈا لنے والا ان شاء اللہ اس حرکت سے باز آجائے گا۔اس طرح دوتین مرتبہ آپ کو خودکواس کا ثواب حاصل کرنے کا موقع مل جائے گا اور لوگوں کی اس نیک عمل کی طرف راہ نمائی کا ثواب دائمی طور آپ کوملتا رہے گا۔

اور اگر اس طرح سے بھی لوگوں کی اصلاح نہ ہوتو کوڑا ڈالنے والوں کو مسجد میں نماز کے بعد الگ سے بٹھا کر سمجھائیں کہ وہ اپنی مستورات کو اس سے باز رکھیں۔ وہ پڑوسیوں کا قصور پیش کریں گے، آپ کو حکمت سے مسئلہ حل کرکے ان سے اس برائی کو دور کرنا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایک دو مرتبہ آپ کو اس کی زحمت اٹھانا ہے۔آپ خود ہی بتائیں کہ اگر آپ کی اس معمولی زحمت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے برائی نکل کر اچھائی آئے تو کیا آپ اس سے خوش نہیں، کیا یہ آپ کی خوش قسمتی نہیں۔لہٰذا اس کے لیے اس طرح حکمت سے اپنی قوم کو اخلاق حسنہ سے آراستہ کریں۔حدیث شریف میں ہے "مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ فَھُوَ فِیْ نَفْسِہٖ صَغِیْرٌ وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ عَظِیْمٌ"۔ (مشکوٰۃ شریف ۴۳۴)۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے مرتبہ کو بلند کریں گے۔ چناں چہ وہ اپنی نظر میں تو حقیر ہوتا ہے لیکن لوگوں کی نظر میں بلند مرتبہ ہوتا ہے۔

حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ تواضع سے رفعت حاصل ہوتی ہے۔ایک بزرگ کی ایک شخص نے دعوت کی اور اپنے مکان پر بلایا جب وہ اس کے مکان پر پہنچے تو داعی نے کہا کیوں آئے کیسے آئے؟ فرمایا بھائی تم نے دعوت دی تھی، کہا کس نے دعوت کی تھی، خواہ مخواہ لوگوں کے سر پڑتے ہو، وہ بیچارے واپس جانے لگے تو کہتا ہے: جاتے کہاں ہو ہم نے تو دعوت کی تھی، وہ پھر واپس چلے آئے تو پھر کہنے لگا: سبحان اللہ آپ تو

کھانے کے لیے ہاتھ دھوئے پھرتے ہیں تو وہ بیچارے پھر واپس ہونے لگے تو پھر کہتا ہے عجیب آدمی ہو ہم نے تو تمہاری دعوت کی تھی اس طرح کئی بار وہ واپس چلے جاتے اور واپس بھی آجاتے۔ آخرکار وہ پیروں میں گر پڑا کہ حضرت میں تو دیکھنا چاہتا تھا پس میں نے آزمالیا کہ واقعی آپ بزرگ ہیں فرمایا میاں دھوکہ نہ کھانا بزرگی تو وہ ہے جو انسان کے اوصاف میں ہو اور جو بات تم نے میرے اندر دیکھی ہے یہ صفت تو کتے کے اندر بھی ہے کہ دھمکادو تو چلا جائے گا اور روٹی دکھلا دو تو آجائے گا۔ (یہ بات تو پہلے سے بھی زیادہ تواضع کی ہے)۔ (خطبات حکیم الامت ۴۲۵)۔

دوسرا درجہ

ائمہ حضرات اس درجہ میں لوگوں کو ایسے برے کام سے باز رکھیں جو اول درجہ سے ذرا مشکل ہوں۔

اس درجہ کی مثال: لوگوں کو غصہ اور بدخلقی سے بچانا ہے جبکہ غصہ پر عملی اقدام اور بدخلقی کا اظہار ہو۔ جو حضرات معمولی معمولی کاموں اور باتوں پر غصہ کرتے رہتے ہیں جن کے رات ودن گویا غصہ میں گزرتے ہیں، ایسے افراد کو پہچان لیں پھر ان کو محنت وکوشش سے غصہ سے ایسے دور کردیں گویا ان میں غصہ کم ہے یا ہے ہی نہیں۔ جیسے ہر گاؤں اور شہر میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو کبھی غصہ نہیں کرتے، ان سے کسی کا کوئی جھگڑا ہی نہیں، نہ گھر میں نہ خاندان میں نہ گاؤں میں۔

غصہ ویسے اچھی چیز ہے۔ کیوں کہ غصہ انسانی فطرت میں رکھا ہی اس لیے ہے کہ اس کے ذریعہ آدمی اپنے آپ کو تکلیفوں سے بچائے، کیوں کہ غصہ ایک ایسی فطری قوت کو کہتے ہیں جو تکالیف کو دور کرے ''اَلْغَضَبُ: قُوَّةٌ تُدْفِعُ الْمضَارَّ'' اگر غصہ نہ ہو تو آدمی تکلیفوں کا شکار بن جائے۔ لیکن اگر وہ ناحق جگہ ہو یا اس پر عملی اقدام ہو اور اس کا غلط اظہار ہو تو یہ بری چیز ہے کیوں

کہ یہ اس کی آفت ہے جو دوسروں کو ناحق ایذا پہنچانے کا ذریعہ ہے ''فَمِنْ اٰفَتِهٖ اَلْاِیْذَاءُ بِلَاحَقٍّ'' (نبراس شرح، شرح عقائد ۳۵۸)۔

پہلی تدبیر

اس مذموم چیز کو نکالنے کے لیے آپ غصہ کی قباحت بیان کریں اور غصہ کے وقت کی حالت بیان کریں۔ کہ جب آدمی غصہ ہوتا ہے تو اس کا چہرہ کتنا خوف ناک ہوجاتا ہے آنکھیں کیسی بڑی ہوجاتی اور باہر نکل آتی ہیں، آواز کیسی اونچی اور بھدی ہوجاتی ہے کہ کوئی اس کے چہرے کو دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اور احادیث مبارکہ میں جو غصہ کو ختم کرنے کی ہدایتیں وارد ہوئی ہیں وہ سنائیں۔ مثلا کھڑا ہو تو بیٹھ جائے پھر بھی ختم نہ ہو تو لیٹ جائے۔ اور اس کے ساتھ پانی پی لے اور وضو کرلے۔ کیوں کہ غصہ کی حرارت شیطانی اثر ہے تو بیٹھ جانا لیٹ جانا مٹی سے لگ جانا اور پانی پینا یا وضو کرلینا اس حرارت اور شیطانی اثر کو مٹادے گا۔

دوسری تدبیر

غصہ سے حاصل ہونے والے نقصانات کو بیان کرنا ہے۔ کہ اس غصہ کی وجہ سے کتنی اولادیں بےقصور ماں باپ کے ہاتھوں پٹتی جاتی ہیں حالاں کہ اس کا سبب ماں باپ ہی کا بیجا غصہ ہوتا ہے۔ اسی سے پڑوسیوں سے لڑائی جھگڑے بنے رہتے ہیں۔ میاں بیوی میں لڑائی اور مار پیٹ ہوتی ہے اور کتنے گھر اجڑ جاتے اور طلاقیں واقع ہوتی ہیں۔ اسی سے قتل وخون ہوتا ہے اور والدین کی نافرمانی اور بھائی بہنوں میں نااتفاقی اور دوری ہوجاتی ہے۔

اس غصہ سے جب زبان درازی کی جاتی ہے اور اس سے کسی کا دل زخمی کردیا جاتا ہے تو اس زخم اور بیماری کا کیا حال ہوتا ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔ شعر

وکلُّ جِراحَۃٍ فَلَھَا دَواءٌ	وَخُلقُ السوءِ لَیْسَ لَہ دَواءٌ

ترجمہ : کہ ہر زخم کی دوا ہے لیکن بدخلقی کی کوئی دوا نہیں۔ ایک شاعر نے بدخلقی کے زخم کا حال اس طرح بیان کیا ہے۔ شعر

جِراحاتُ السِّنانِ لَھَا الْتِیَامُ	وَلَا یَلتامُ مَا جَرحَ اللِّسَانُ

ترجمہ : یعنی اگر کسی نے کسی کو تلوار و نیزوں سے زخمی کر دیا تو یہ جسمانی زخم تو بھر سکتا ہے لیکن اگر کسی نے بدخلقی اور زبان درازی سے دل کو زخمی کر دیا تو یہ زخم نہیں بھر سکے گا۔

غصہ اور ضبط دونوں فطری : ہم یہ نہیں کہتے کہ غصہ کی بات پیش آئے تب بھی غصہ نہ آئے، کیوں کہ غصہ کی بات پر غصہ آنا نہ صرف انسانی فطرت ہے بل کہ کبھی وہ موافق شریعت بھی ہوتا ہے۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ قرآن شریف اور شریعت میسرہ نے ہمیں اس کا مکلف نہیں کیا ہے کہ ہمیں غصہ نہ آئے بل کہ اس کا مکلف کیا ہے کہ غصہ آ جائے تو ضبط کریں اور اسے پی جائیں اور معاف کر دیں چناں چہ قرآن نے "وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ" کہا ہے ۔"وَالْعَادِمِیْنَ الْغَیْظَ" نہیں کہا ہے کہ غصہ نہ آئے۔ (مرقات شرح مشکوۃ ۱۹۵/۱)۔

کیوں کہ غصہ آنا جس طرح انسانی فطرت ہے اس طرح اسے پی جانا بھی انسانی فطرت ہے، تب ہی تو شریعت نے ہمیں اس کا مکلف بنایا ہے۔ حدیث شریف میں ہے دو گھونٹ اللہ کو بہت پسند ہیں ایک غصہ کا گھونٹ دوسرا صبر کا۔

ضبط غصہ کا بس پہلا قدم : مقتدیوں کو بتائیں کہ غصہ پینے کی مشق کرنے اور اس کی عادت ڈالنے سے ہی غصہ ختم ہوگا اور اس کی عادت بدلے گی۔ ابتداء أبالقصد غصہ کو ضبط کرنا ہوگا اس میں بوجھ پڑے گا پھر ان شاء اللہ دھیرے دھیرے یہ چیز دور ہو جائے گی۔ انہیں بتائیں کہ

وہ اپنے اندر حلم وتحمل کی صفت پیدا کریں جو تمام انبیاء علیہم السلام کی سب سے بڑی صفت ہے، بل کہ خود اللہ تعالیٰ کی بھی صفت ہے۔

حدیث شریف میں ہے " مَا احدٌ اَصبرُ علی اذیً یَسمعُه مِنَ اللهِ یَدعُوْنَ لَه الولدَ ثُمَّ یُعافِیْهِمْ ویَرْزُقُهُمْ "۔ (مشکوٰۃ ۱۳) کسی تکلیف دہ کلمہ کو سن کر اللہ تعالیٰ سے زیادہ صبر وتحمل کرنے والا کوئی نہیں کہ لوگ (مشرک) اللہ کے لیے اولاد قرار دیتے ہیں (کہ اللہ تعالیٰ کی بھی ہماری اولاد کی طرح اولاد ہے) پھر بھی اللہ تعالیٰ ان کو عافیت بخشتے ہیں اور رزق عطا کرتے ہیں۔ دیکھا اللہ تعالیٰ کتنے حلیم ہیں، کہ اللہ کے بندے ہو کر اللہ کے لیے نسب اور اولاد ثابت کرتے ہیں جو کتنا بڑا جرم اور کتنی بڑی نافرمانی ہے پھر بھی اللہ تعالیٰ نہ سزا دیتا ہے نہ پکڑ کرتا ہے نہ ان کی روزی روٹی بند کرتا ہے بل کہ عافیت وروزی کا سلسلہ جاری رکھتا ہے اور مہلت دیتا ہے۔ مقتدیوں کو بتائیں کہ اگر وہ اپنے اندر سے غصہ کو ختم کریں گے اور حلم کی صفت پیدا کریں گے تو وہ ایسا محسوس کریں گے گویا کوئی کھوئی دولت پائی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں زندگی کا چین اور سکھ نصیب فرمائیں۔

تیسرا درجہ

تیسرے درجہ میں وہ منکر چھڑانا ہے جو دوسرے درجہ کے منکر سے بڑا ہو لیکن بالکل عمومی ابتلا کا منکر نہ ہو۔ اس کی ہم دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔

پہلی مثال: جو لوگ مخصوص چوپالوں اور بیٹھکوں پر رات ودن بیٹھ کر نہ صرف اپنے اوقات کو ضائع کرتے ہیں بل کہ ان مجلسوں سے ہنسی مذاق، غیبت، ناجائز کھیل، کسی سے حسد وعداوت بھڑکانے کی برائیاں بھی جنم لیتی ہیں اور آدمی کو گنہگار بناتی ہیں، ایسی مجالس اور ان کے برے مشاغل سے بچانا اور روکنا ہے۔ جو حضرات اوقات کی قدر کرتے ہیں ان کے یہاں تو

ان کی قیمت سونے سے کم نہیں ان کے یہاں اوقات ضائع کرنا خودکشی کے مرادف ہے۔ جیسے کہ اس کی اہمیت کو حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے کہ ان چوپالوں اور بیٹھکوں کی صحبت بہت زیادہ قابل انسداد ہے ملاحظہ ہو۔ (خطبات حکیم الامت ۳۰ ص ۴۷) ایسے کچھ ہی لوگ ہوتے ہیں وہ کوئی زیادہ مقدار میں نہیں ہوتے، کیوں کہ اکثر لوگ اوقات کی حفاظت کر کے دینی ودنیوی فوائد حاصل کرنے کی اہمیت جانتے ہیں اور ضیاع اوقات کے ذریعہ دینی ودنیوی نقصانات کرنا نہیں چاہتے، ہاں کچھ لوگ خواہشات کی پیروی میں اس کے عادی بنکر پھر پوری آبادی کا ماحول خراب کرتے ہیں۔

ظاہر ہے ان مجلسوں میں بیٹھ کر زبان کی غیبت چغلی، جھوٹ اور مذاق وغیرہ سے حفاظت ایسی ہی ناممکن ہے جس طرح کوئی پانی میں داخل ہو اور کپڑے تر نہ ہوں۔ کیوں کہ ہم کوئی فرشتے نہیں کہ گھنٹوں بیٹھیں اور زبان سے برائیاں سرزد نہ ہوں اور زبان کی حفاظت ایسی اہم چیز ہے جس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنت کی بشارت سنائی ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک نوجوان کو ہنستے دیکھ کر فرمایا بیٹا تو پل صراط سے گزر چکا ہے کیا تجھے اپنے لیے معلوم ہو چکا ہے کہ تو جنت میں جائے گا یا جہنم میں؟ کہا نہیں فرمایا پھر یہ ہنسی کیسی؟ اس کے بعد کبھی اس لڑکے کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقولہ ہے: ذکر اللہ کے علاوہ ہر کلام لغو ہے۔۔۔ غور وفکر کے بغیر ہر خاموشی غفلت ہے۔۔۔ عبرت کے بغیر ہر نظر لہو ولعب ہے۔۔۔ اور فرمایا مومن بولتا کم اور کرتا زیادہ ہے۔۔۔ منافق کرتا کم اور بولتا زیادہ ہے۔۔۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے اس شخص کے لیے ہلاکت وبربادی ہے جو کوئی باتیں بنا کر دوسروں کو ہنسائے۔ فقیہ ابو اللیث رحمۃ اللہ تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جوامع الکلم میں

یہ جملہ نقل کیا ہے کہ سونے والے اور باتیں کرنے والے کے پیچھے نماز نہ پڑھو۔یعنی بہت زیادہ سونے والے اور باتیں کرنے والے کے پیچھے (روضۃ الصالحین ۱/۱۱۹)۔

ایک حدیث شریف کا خلاصہ ہے کہ آپ نے تمام بھلائیوں کے دروازے اور دین کی جڑ اس کا ستون اس کی بلندی اور ان سب کی جڑ اپنی زبان پکڑ کر فرمایا اس کو بولنے سے روک لو۔اس حدیث پر گہری نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ خاموشی کا کتنا بڑا مقام آپ نے بیان فرمایا ہے۔اسی وجہ سے وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جن کا مقام ہر ایک جانتا ہے اتنے بلند درجہ کے باوجود فرماتے تھے۔کاش میں گونگا ہوتا سوا ذکر اللہ کے۔" وِلِذَا قَالَ الصِّدِّیقُ لَیْتَنِیْ کُنْتُ اخرسَ اِلا عن ذِکرِ اللہِ" (مرقات شرح مشکوۃ ۱/۱۰۶)۔

دوسری مثال : اولاد کی تربیت سے پہلو تہی کرنا اور اس کی طرف توجہ نہ کرنا۔ان کو اس دلدل سے نکال کر اور اولاد کی تربیت پر متوجہ کر کے زیور تربیت سے آراستہ کر کے پورے معاشرے کو معطر اور خوش نما بنانا ہے۔کچھ لوگ تربیت اولاد سے ایسے غافل ہیں کہ نہ دنیوی تربیت کی طرف ان کا دھیان ہے نہ دینی۔انہیں اپنی اولاد کی قیمت وقسمت کا کوئی احساس ہی نہیں صرف روزی روٹی کے چکر میں پھنسے رہ کر اپنی زندگی کو برباد کر رہے ہیں۔

حالاں کہ کچھ بچے اعلیٰ فطری صلاحیت پائے ہوئے ہوتے ہیں وہ خاندان، پورے معاشرے کا نام روشن کر سکتے ہیں بل کہ ملت ومذہب کو ترقی دے سکتے ہیں لیکن جب ہی کہ ان کی صحیح طریقہ سے تربیت کی جائے۔اسی لیے ایک شاعر کہتے ہیں کہ یتیم وہ بچہ نہیں جس کے والدین انتقال کر چکے ہوں اور اسے بے سہارا چھوڑ گئے ہوں، بل کہ یتیم وہ ہے جس کی ماں ہو لیکن تربیت نہ کرتی ہو اور باپ بھی ہوں لیکن کام کاج سے ہی فارغ نہ ہو۔

ماں باپ اولاد کی تعلیم وتربیت میں جو وقت اور پیسہ صرف کریں گے اس کے لمحے لمحے اور پیسے پیسے پر اجر وثواب دیا جائے گا اور وہ صدقۂ جاریہ شمار ہوگا۔ بچہ کو بچپن سے ہی کرتا پائجامہ اور ٹوپی پہنائی جائے اور سب سے پہلے کلمہ سکھایا جائے۔

یہ دونوں مثالیں ایسی ہیں کہ پہلی عادت (غلط مجلسیں) ختم کرنے سے دوسری عادت (تربیت اولاد) اور دوسری عادت ختم کرنے سے پہلی عادت کے مٹانے اور ختم کرنے میں تقویت ومدد حاصل ہوگی۔

اصول تربیت کا اشارہ قرآن وحدیث سے

حضرت زکریا علیہ السلام جب حضرت مریمؑ کے پاس جاتے تو وہاں کچھ بے موسم پھل پاتے تو حضرت مریم سے پوچھتے اے مریم یہ پھل تمہارے پاس کہاں سے آئے تو حضرت مریمؑ فرماتی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ''كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّى لَكِ هَذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ '' (آل عمران ۳۷)۔ اس سے قرآن نے تربیت اولاد کے اصول کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ماں باپ اور نگراں کو اولاد کے احوال پر دھیان دینا چاہیے کہ اولاد کیا کر رہی ہے؟ کیا کھاتی ہے؟ کیا پیتی ہے؟ ان کے پاس کیا کیا چیزیں آتی ہیں؟ کہاں سے آتی ہیں؟ بچے کہا جاتے ہیں؟ کس کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں؟ ان کی زبانوں کے بول کیسے ہوتے ہیں؟ وغیرہ۔ اب اس تربیت پر روایت کو ملاحظہ فرمائیں۔

روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے صدقہ کی کھجوروں میں سے لے کر اس کو منھ میں رکھا اور کھانا چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کخ کخ'' (یعنی گندا گندا یا ڈال دو ڈال دو) پھر آپ نے فرمایا ''اَمَا شَعَرْتَ اِنَّا لَا نَاكُلُ الصَّدَقَةَ'' کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم

صدقہ کا مال نہیں کھا سکتے (مشکوٰۃ ۱۶۱)۔ علماء اسلام فرماتے ہیں اما شَعَرْتَ (کیا تم نہیں جانتے) یہ جملہ بطور تعجب اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی بڑا شخص عقلمندی کے خلاف کام کرے کہ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ کام نہیں کیا جاتا۔ سوال یہ ہے کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ جملہ حضرت حسنؓ سے کیسے فرمایا حالاں کہ وہ تو ناسمجھ بچے تھے؟ تو علماء حضرات نے یہ لکھا ہے کہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھوٹے بچے کو کہہ کر سنایا ہے بچوں کے والدین کو کہ تمہیں معلوم نہیں تمہارے چھوٹے بچے کیا کر رہے ہیں؟ یعنی یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم ان کی دیکھ بھال کرو اور جب وہ برے کام کریں تو تم ان کو برے کاموں سے بچاؤ۔[۱]

تدابیر

پہلی تدبیر : ہفتے میں دوبار ۱۵ منٹ اس موضوع سے متعلق اچھا مواد جمع کر کے ان کے سامنے پیش کیا جائے۔ ان مجلسوں سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو اور ان کے نقصانات کو اجاگر کیا جائے اور تضییع اوقات کے نقصانات کو واضح کیا جائے، اور اس کے بالمقابل ان اوقات کو ان سے بچا کر دینی امور میں صرف کرنے کے فضائل وفوائد سمجھائے جائیں۔ جب دو تین ہفتے سمجھالیں تو بیٹھکوں کے اوقات میں بیٹھکوں سے تھوڑے فاصلے سے آپ نیچی نگاہ سے گزر جائیں اور نظر بچا کر دور سے دیکھتے رہیں کہ وہ آپ کو دیکھ کر کھڑے ہو جانے اور چھپنے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں یا نہیں۔

اگر پہلی صورت ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا احترام کرنا چاہتے ہیں اور یہ واضح ہو گیا کہ آپ کی محنت الحمد للہ رنگ لا رہی ہے لہٰذا آپ دوسرا راستہ بدل کر نکل جائیں، اور اس کی

[۱] راقم نے اسی موضوع پر بنام ''اولاد کی تربیت میں اسلامی کردار'' کتاب تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل تحریر کی ہے جو ۲۰۱۳ء سے گجرات ادارۂ صدیق ڈابھیل سے طبع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے۔ الحمد اللہ بہت مفید ثابت ہوئی۔ لہٰذا اس کا مطالعہ اولاد کی تربیت میں مفید ہوگا۔

مزید محنت جاری رکھی جائے۔اور اگر دوسری صورت ہے تب بھی راستہ بدل کر نکل جائیں اور دو چار ہفتے مزید سمجھانے میں صرف کریں پھر وہاں سے گزریں اس طرح یقین ہوجانے تک محنت وکوشش کرتے رہیں۔

دوسری تدبیر: دوتین ہفتے ۱۵ منٹ سمجھانے کے بعد بیٹھک کرنے والوں میں سے اپنے سے قریب شخص کو یا جس میں کچھ سمجھداری محسوس ہو اس کو انفرادی ملاقات سے سمجھائیں، پھر مذکورہ بالا تدبیر اختیار کریں اور ان کو شرم وحیا پر آمادہ کریں۔ان شاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ یہ بیٹھکیں اپنی غربت وحشت پر حسرت کے آنسوں بہائیں گی۔اور ساتھ ہی اولاد کی تربیت کے فوائد بھی پیش کرتے رہیں گے اور تربیت کرنے والے اور اس کی اولاد کی مثالیں پیش کریں گے کہ معاشرے میں ان کی کیسی عزت ہے تو ان شاء اللہ وہ سمجھنے پر آمادہ ہوں گے پھر وہ لوگ اس سے باز آجائیں گے۔

چوتھا درجہ

اس درجے میں وہ منکرات ہیں جو تیسرے درجے کے منکر سے بڑے بھی ہوں اور ان کو چھوڑنا بھی کچھ مشکل ہو۔

پہلی مثال: ان لوگوں کو جو مواضع تہمت پر آمد ورفت رکھتے ہیں، اور شکوک وشبہات میں ڈالنے والے اعمال اختیار کرتے ہیں مثلاً دن بھر گناہوں میں مبتلا رہنے والوں کے ساتھ نشست وبرخواست رکھتے ہیں اور قرائن بھی ان گناہوں کے ارتکاب پر قائم ہوں لیکن آنکھوں سے گناہ کرتے دیکھا نہ ہو تو ان کو ان گناہوں کی جگہوں سے اور ان اعمال سے بچانا ہے چاہے زنا، شراب، سود اور رشوت وغیرہ کی جو بھی تہمت کی جگہیں ہوں۔

لیکن اس بارے میں بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ کیوں کہ خواہ مخواہ کسی سے صرف بدظنی سے اس کو موردِ تہمت بنانا بڑا گناہ ہے۔ بعض دفعہ تہمت کی ظاہری علامتیں تو پائی جاتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ آدمی اس گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک آدمی کے بارے میں لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ فلانی عورت سے زنا کا مرتکب ہے اور دلیل صرف اتنی ہے کہ اس عورت کے ساتھ ظاہر میں ملتا ہے دلیل یہ نہیں کہ اسے اس کے ساتھ زنا کرتے آنکھوں سے دیکھا ہے تو ظاہر ہے صرف اتنی بات پر زنا کی تہمت بری بات اور بڑا گناہ ہے۔

جس طرح کسی کے منھ سے شراب کی بدبو آنے پر شراب پینے کی تہمت درست نہیں ہے جب تک شراب پیتے دیکھ نہ لیا جائے۔ چناں چہ حضرت علقمہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک آدمی کے منھ سے شراب کی بو آئی تو اس کو حد لگائی۔ یہ کچھ طویل روایت ہے (مشکوٰۃ ۱۹۳)۔ علماء اسلام فرماتے ہیں کہ کسی کے منھ سے محض شراب کی بو آنے پر حد لگائی نہیں جاسکتی جب تک وہ شراب پینے کا اقرار نہ کرلے یا گواہوں سے ثابت نہ ہوجائے۔ کیوں کہ بعض دفعہ ترش سیب اور امرود کے کھانے کی بو بھی شراب جیسی ہوتی ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں بھی یہی مسئلہ بیان ہوا ہے کہ صرف بدبو کی وجہ سے یا شراب کی قئی کرنے کی وجہ سے حد نہیں لگائی جائے گی۔ (ہدایہ ۲/۵۱۶ اور قدوری ۲۱۷)۔

مسلمان اور پردہ پوشی

بل کہ سیرت طیبہ اور احادیث نبویہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر ہم نے کسی مسلمان کو کسی صریح گناہ کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو تب بھی ہمیں اس کا حکم ہے کہ اس گناہ کا تذکرہ کسی سے نہ کریں۔۔۔ اس پر پردہ ڈالیں۔۔۔ اور اپنے دل کو سمجھانے کے لیے اس کے

فعل کی کوئی اچھی تاویل کریں۔

شرعی واخلاقی ہمیں یہ حکم ہے کہ ہم ایک مسلمان کے گناہ کی تاویل کریں چاہے ہم نے اسے گناہ کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔نہ ہمیں اس گناہ کے افشاء کی اجازت ہے نہ دل سے اس شخص کو برا سمجھنے کی اجازت ۔

مثلاً اگر ہم نے کسی کو شراب پیتے دیکھ لیا تو اپنے دل کو سمجھانے کے لیے یہ تاویل کریں کہ وہ شراب نہ ہو۔۔۔بل کہ کوئی حلال چیز ہو۔۔۔یا شراب ہی ہو لیکن حد سکر کو پہنچی ہوئی نہ ہو۔۔۔یا علاجاً پیا ہو۔۔۔یا جبراً پیا ہو وغیرہ۔۔۔اس طرح کسی کو زنا کرتے دیکھ لیا تو یہ تاویل کریں کہ میرے دیکھنے میں غلطی ہوئی ہو۔۔۔یا وہ اجنبیہ عورت نہ ہو بل کہ خود اس کی بیوی ہو۔۔۔یا اجنبیہ ہو لیکن اس سے غلطی ہوگئی ہو وہ اپنی بیوی سمجھ بیٹھا ہو۔۔۔یا اجنبیہ نہ ہو بل کہ اس سے نکاح کر رکھا ہو اور مجھے اس کا علم نہ ہو۔۔۔یا وہ زنا پر مجبور کیا گیا ہو وغیرہ۔احادیث میں ان سب کا ذکر ہے، حتیٰ کہ کسی سے اگر حد لازم ہونے والا کبیرہ گناہ صادر ہو تب بھی حتی الامکان (گناہ ثابت نہ ہونے تک) حد کو ٹالنے کا حکم کیا گیا ہے۔ارشاد ہے ’’ اُدْرَؤُا الْحُدُوْدَ عَنِ الْمُسْلِمِيْنَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ‘‘(مشکوٰۃ ۳۱۱)۔

اور اس طرح کا واقعہ بھی ماعز اسلمی اور غامدیہ عورت کا مذکور ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۳ مرتبہ تک اقرار زنا کے بعد بھی واپس کیا حد جاری نہ کی اور چوتھی مرتبہ بھی ثبوت زنا کے لیے ’’هَلْ ضَاجَعْتَهَا ۔هَلْ بَاشَرْتَهَا ۔هَلْ جَامَعْتَهَا ‘‘ سے اقرار کرایا تب حد جاری کی (مشکوٰۃ ۳۱۲)۔قربان جائے اسلام پر کہ اس نے معاشرے کو پاکیزہ بنانے کے لیے کس قدر بلند اصول عطا فرمائے ہیں۔

اور اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اس شکوک وشبہ والے آدمی کے ساتھ ملنے والا کوئی اس کا دوست ہو تو اسے بھی صرف اس سے تعلق کی وجہ سے شکوک وشبہات کی نظروں سے دیکھنا یا اس پر بھی وہ تہمت لگانا پہلے سے بھی بڑھ کر بری بات اور بڑا گناہ ہوگا۔ محض اتنی سی بات پر کہ وہ اس سے تعلق رکھتا ہے تہمت لگانا یا شبہ پیدا کرنا کیسے درست ہوگا؟ ظاہر ہے کہ تعلقات کی کئی وجوہات ہوتی ہیں پھر زنا ہی کی جانب کو ترجیح دینا کتنی غلط سوچ اور بے اصل بات ہے۔ خیر یہاں بات ان لوگوں کے بارے میں ہے جن کی ساری حرکات وسکنات اور اکثر کردار اس کے شاہد ہوں کہ وہ ایسے ہوں گے تو ان کو مواضع تہمت سے بچانے کی کوشش کی جائے۔

تدبیر : سب سے پہلے اس کو برے ماحول سے جدا کیا جائے، غلط تعلقات منقطع کرائے جائیں پھر اچھے ماحول سے جوڑ دیا جائے اور اچھے ہم نشین میسر کئے جائیں اور پوری طرح نگرانی رکھ کر مضرت کے پہلو سے بچا کر مفید پہلو کی طرف راہ نمائی کی جائے۔

مثلاً نماز کا اہتمام کرایا جائے کہ نماز خود بری باتوں سے روکنے کا ذریعہ ہے۔ نیز ایسے لوگوں کو آخرت کی فکر دلائی جائے۔ تعلیمی حلقوں اور دعوتی گشتوں میں ساتھ رکھے جائیں۔ اور معاش کی فکر اور بیوی بچوں کی ذمہ داری نبھانے کی فکر میں مصروف رکھے جائیں۔ اور ان کو سمجھایا جائے کہ یہ سب تمہاری ذمہ داریاں ہیں۔ اور اس طرح بھی سمجھائیں کہ کسی شخص کو اس کی قوم اس کی غلط کاری کی وجہ سے بری نظر سے دیکھ لیتی ہے تو پھر لوگ اس سے اپنے لین دین بات چیت اور رشتہ ناتہ میں دور رہتے ہیں اور وہ شخص اپنی قوم میں اپنا مقام کھو بیٹھتا ہے۔ اور بطور خاص ان کی ہدایت کی دعا کی جائے۔

دوسری مثال : قوم وبرادری میں پھیلتی بدظنی کو روکنا ہے۔ عامۃً جو بھی قطع تعلق،

لڑائی جھگڑا اور تہمت اور جھوٹی گواہی وغیرہ گناہ کے کام قوم میں جڑ پکڑتے ہیں ان کی بنیاد بدظنی ہوتی ہے۔ بدظنی کو گناہ قرار دیا گیا ہے۔ جب بھی کوئی بات سامنے آئے تو اس کی تحقیق کرنا چاہیے صرف بدظنی کی بنیاد پر اسے سچ اور صحیح تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔ نیز جھوٹ، گالی گلوج، حسد اور کینہ سے بچانا یہ سب ہی اس کی مثالیں بن سکتی ہیں۔ پہلے ان کے برے نتائج اور ان سے بچنے کے فوائد بتائے جائیں اور ان کی ضدوں مثلاً سچ، نرم کلامی، ہمدردی کو اور ان کے درمیان فرق کو سمجھایا جائے۔

پانچواں درجہ

اس درجہ میں وہ منکرات شامل ہیں جو بڑے بھی ہیں اور لوگوں میں کچھ عام بھی اور ان سے بچنا کچھ زیادہ مشکل ہو۔

پہلی مثال : عورتوں میں عام بے پردگی، مرد وزن کا سڑکوں پر عام اختلاط، بے شرمی و بے حیائی اور علی الاعلان بدنظری ہے۔

ائمہ حضرات اپنے ماتحتوں کو ان گناہوں اور خرابیوں سے باہر نکالیں، لوگ ان گناہوں میں ڈوب چکے ہیں مرد بھی اور عورتیں بھی اور انہیں اپنے ڈوب جانے کا نہ کوئی احساس ہے اور نہ کوئی خطرہ۔ اگر اس وقت ان کو کھینچ کر باہر نہیں نکالا تو یہ خرابیاں مستقبل میں زنا، ولدزنا، اختلاط نسب، طلاق اور قتل وخون کا ذریعہ بن جائیں گی پھر ان سے واپس لوٹنا دشوار ہو جائے گا۔ بل کہ کچھ نقصانات تو ابھی دیکھے بھی جا رہے ہیں۔

تدابیر

پہلی تدبیر : سب سے پہلے تو ان میں سے ہر ایک کی جو اہمیت شریعت میں وارد

ہے وہ بتائی جائے یعنی پردے کی، شرم وحیا کی، مرد وزن کے اختلاط سے بچنے کی اور بدنگاہی سے بچنے کی۔ پھر ان سے نہ بچنے کے خطرات اور اس کے نقصانات بتائے جائیں، کہ اگر یہ ماحول ختم نہ کیا گیا تو ماں بیٹیوں کی عصمتیں خطرے میں پڑ جائیں گی اور پورا معاشرہ برائیوں اور بدامنی کے دلدل میں پھنس جائے گا، پھر وہ خدائی رحمت سے دور جا گرے گا اور زمینی وسمائی آفتوں کا شکار ہو جائے گا، نیز ان کے بجالانے کے فضائل وفوائد سمجھائے جائیں۔

مثلاً پہلے تو ان سب کی جڑ شرم وحیا پر لایا جائے، ان کو بتایا جائے کہ حیا ایمان کا ایک خاص شعبہ ہے۔ حیا ایک تو فطری ہوتی ہے جو تمام انسانوں میں ہوتی ہے اس میں مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں۔ حیا کی حقیقت یہ ہے کہ وہ انسان کو غلط کام سے بچنے پر آمادہ کرتی ہے اور صاحب حق کو حق میں کوتاہی کرنے سے روکتی ہے۔ مثلاً ستر کھولنا اور کھلے طور پر زنا کرنا وغیرہ۔ اور ایک ایمانی حیا ہے۔ ایمانی حیا اس اچھی عادت کو کہتے ہیں جو ایمان کے سبب آدمی کو برے کام سے روکے چاہے جو بھی کام ہو۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ حیا کی حقیقت یہ ہے کہ تمہارا مالک تمہیں اس جگہ نہ دیکھے جہاں اس نے تم کو جانے (کرنے) سے روکا ہے۔ ”حقیقۃُ الحیاءِ ان مَولاکَ لایَراکَ حیثُ نہاکَ“۔ (مرقات شرح مشکوۃ ۱/۷۰)۔

حضرت جنید رحمہ اللہ تعالیٰ سے حیا کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ جب کوئی شخص ایک طرف اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو دیکھے اور دوسری طرف اپنی کوتاہیوں کو دیکھے ان دونوں کی وجہ سے جو حالت بنے اس کو حیا کہتے ہیں۔ ”سُئِلَ الجُنیدُ ؒ عِن الحیاءِ فَقَالَ رُویۃُ الآلاءِ وَرویۃُ التقصِیْرِ فَیَتولّدُ مِنْ بَینِہِمَا حالۃٌ تُسمّٰی الحیاءُ“۔ (استحقار)۔ پھر حیا کی چند قسمیں ہیں حیاء جنایت، تقصیر، اجلال، کرم، حشمت اور استحقار۔ (تعلیق الصبیح ۱/۲۳)

عملی قدم کا جادو لوگوں میں اور ان کے گھروں میں پردہ۔۔۔ اور شرم وحیا۔۔۔ پیدا کرنے کے لیے ان کو یہ بتایا جائے کہ پردہ اور شرم وحیا پر صرف ۲ / ۵ تقریریں سننے سے اس کا اتنا ماحول قائم نہ ہوگا جتنا اس پر عملی ایک قدم اٹھانے پر۔ اس کی ایک مثال سمجھئے : کسی کے گھر میں نئی بہو آئی وہ شرم وحیا کے لحاظ سے کسی اور کاموں سے اتنی متاثر نہیں ہوگی جتنی اپنے خسر یا جیٹھ (شوہر کے بڑے بھائی) کے گھر میں داخلہ کے وقت سلام کرنے سے۔

خسر اگر گھر میں سلام کر کے داخل ہو تو وہ بہو فی الفور متاثر ہوگی اور یہ سمجھ لے گی کہ میرے خسر باحیا ہیں اب وہ ان کے سامنے کھلے سر نہیں آئے گی۔ اس کے برخلاف اگر خسر بغیر سلام کے گھر میں داخل ہو اور بہو بھی غیر سنجیدہ ہو تو دھیرے دھیرے بے دھڑک کھلے سر سامنے آنا شروع کر دے گی۔ اسی طرح اگر بہو باحیا ہے اور خسر صاحب ذرا غیر سنجیدہ ہیں تو بہو کو چاہیے کہ ذرا ادبی لہجہ میں خسر صاحب سے کہے یا ساس سے کہلائے کہ ابا جان اگر گھر میں داخلہ کے وقت حضور ﷺ کی سنت ''سلام'' یاد نہ رہے تو یاد رکھنے کے لیے کوئی تدبیر اختیار کر لی جائے جس سے یہ سنت یاد آجائے تو سنت بھی زندہ ہو جائے اور ہم سب گھر والوں کو آپ کی جانب سے سلامتی کی دعا بھی مل جائے۔ اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اس سے خسر باحیا بنیں گے اور ان کا ذہن بھی اس طرف نہیں جائے گا کہ بہو مجھے غیر سنجیدہ سمجھ کر اصلاح کر رہی ہے۔

اس طرح کے گھروں کے باحیا نظام کا اثر پورے معاشرے پر پڑے گا۔ کیوں کہ ہمسایہ لوگ بھی اس طرح کے احوال دیکھیں گے کہ بہو اور خسر اس طرح رہ رہے ہیں تو وہ بھی متاثر ہوں گے۔ اور جب ہمارے رشتہ داروں کی بکثرت آمد ورفت ہوگی تو وہ بھی یہ حالات دیکھ کر تاثر لیں گے۔ اور یہی بہو اور خسر جب بازار وغیرہ جگہ میں جمع ہوں گے تب بھی ایک دوسرے سے حیا

کریں گے کیوں کہ گھر میں حیا کا نظام قائم ہے اور لوگ اسے دیکھیں گے تو بازار کے ماحول پر بھی حیا کا رنگ چڑھے گا اور ان شاء اللہ معاشرہ پردہ وحیادار بنے گا۔

پھر پردے کی اہمیت بتائی جائے۔ جن حضرات کی نظر قرآن وحدیث پر ہے وہ اس کی اہمیت کو جانتے یں۔ پردہ پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ پردہ عورت کی عصمت کا ضامن ہے جب عورت پردے میں رہتی ہے تب تک اس کی عزت وعصمت محفوظ رہتی ہے۔ عورت کہتے ہی ہیں ستر یعنی پردہ کو۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں جب عورتوں کو مسجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت تھی تب بھی ان پر چند شرطوں کی پابندی تھی۔

مثلاً یہ کہ وہ پردے میں آئیں، خوشبو لگا کر نہ آئیں، زینت اختیار نہ کریں، نماز کی صفوں میں جب کہ مرد وعورت ایک ہی جماعت سے نماز ادا کریں تو عورتوں کی پہلی صف کو برا اور آخری صف کو اچھا کہا گیا ہے کیوں کہ آخری صف بنسبت پہلی صف کے مردوں سے دور ہوگی۔ پردہ کی اہمیت پر ایک زریں جملہ کسی نے بیان کیا ہے کہ ”نِعم الصهرُ القبرُ“ کہ عورت کا بہترین سسرال قبر ہے یعنی عورت کتنا ہی پردہ کا اہتمام کرے لیکن کچھ نہ کچھ تو کوتاہی ہو ہی جاتی ہے جب تک وہ اپنے حقیقی سسرال قبر میں نہ پہنچ جائے کہ تب ہی اس کا مکمل پردہ ہوسکتا ہے۔

راستوں اور سڑکوں پر بھی عورتوں کو حکم یہ ہے کہ راستوں کے بیچ نہ چلیں بل کہ کنارے پر چلیں۔ لہٰذا ان کو مردوں کے ساتھ مل کر راستوں پر چلنے اور بدنظری سے روکا جائے۔ حضرت ابو اُسید انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا جب کہ آپ مسجد سے باہر تھے اور راستے میں مرد اور عورتیں ملے ہوئے تھے، عورتو تم پیچھے ہٹ جاؤ تمہارے لیے مناسب نہیں کہ تم راستے میں (مردوں سے) مزاحمت کرو تمہیں راستے کے

کنارے ہی چلنا چاہیے، ابو اسیدؓ کہتے ہیں آپ کے ارشاد کے بعد عورتیں راستوں کے کنارے پر بنے ہوئے مکانوں کی دیواروں سے اس قدر سمٹ کر چلتی تھیں کہ ان کے کپڑے دیواروں سے الجھ جاتے تھے۔ (ابوداؤد ۲/ ۷۱۴)۔

اور زینت کے بارے میں ان کو باخبر کیا جائے کہ عورتوں کو زینت اختیار کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہے لیکن وہ اپنے گھر میں اپنے شوہر کے لیے ہے، گھر سے باہر زینت اختیار کرکے اور خوشبو لگا کر اس طرح نکلنے کی اجازت نہیں کہ لوگ ان کو دیکھنے کی طرف مائل ہوں ۔ان کو جاذب نظر باریک کپڑوں اور چُست کپڑوں کو پہننے سے روکا جائے اور ایسے ناقص کپڑوں سے بھی روکا جائے جن میں کوئی عضو کھلا رہے۔ان کو موٹے، کھلے اور مکمل کپڑوں کے پہننے پر مجبور کیا جائے۔

ان کو بتایا جائے کہ یہ مقولہ مشہور ہے۔ ''اَلنَّاسُ بِاللِّبَاسِ'' کہ لوگ لباسوں سے پہچانے جاتے ہیں، لباس کسی قوم کا تعارف ہوتا ہے۔ کتنی قومیں اپنی وضع قطع کی پابند ہیں، مسلمانوں کو تو بطریق اولی اپنے مذہبی لباس کا محافظ ہونا چاہیے، یہ لباس ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان مابہ الامتیاز ہے۔ یہ سب مقتدیوں کو بتانے کے بعد عورتوں تک پہونچایا جائے اور سختی سے کہا جائے کہ آئندہ اس طرح کی خرابیوں سے ملوث کوئی پائی نہ جائے۔

⬅ دوسری تدبیر : اولیاء کے ذریعہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں پر بے پردگی ، بے شرمی، بدنظری اور اختلاط پر پابندی لگائی جائے۔معاشرتی پابندی کے لیے اجتماعی مشوروں کی ضرورت پڑے تو اسے بھی انجام دیا جائے۔ چوں کہ معروفات کے مختلف درجات سے منکرات کے اس درجہ تک گاؤں کی اکثریت آپ کے اس کام کی حمایت کر چکی ہوگی تو اس طرح کا اقدام بھی ممکن ہے۔

تیسری تدبیر: اس طرح سمجھانے کے کچھ عرصہ بعد ائمہ حضرات اپنے ساتھ آبادی کے باوقار چند افراد کو لے کر سڑکوں پر نکلیں، اور کچھ کہے ٹوکے بغیر صرف معاینہ کریں اور ان میں سنجیدگی سے شرم وحیاء اور وقار لانا سکھائیں۔ اس طرح کہ وہ آپ کو دیکھ کر کترانے لگیں اور دب کر چلنے لگیں، اگر یہ صورت ہے تو سمجھئے آپ کی محنت رنگ لا رہی ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔ لیکن اگر کچھ زمانہ کے بعد بھی عورتیں ایک طرف نہ چلیں اور لڑکے اور لڑکیاں ساتھ چلیں تو چند باوقار آدمی علی الاعلان بھرے بازار میں ٹوک دیں۔ ایسا ایک دو مرتبہ ہوگا تو اس سے ان شاء اللہ یہ فتنہ دب جائے گا۔

دوسری مثال: مردوں کو ڈاڑھی رکھنے پر آمادہ کرنا ہے۔ ڈاڑھی تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ اسلامی شعار ہے۔ ڈاڑھی نہ رکھنے والا ہر وقت گناہ میں مبتلا رہتا ہے۔ ڈاڑھی سے آدمی کی عزت ہوتی ہے۔ وہ شرافت و پاکدامنی کا ذریعہ ہے۔ عامۃً تاجر اور کسان طبقہ تو ڈاڑھی رکھتا ہے، زیادہ تر ملازم طبقہ بے ریش رہتا ہے۔ اور جب ملازمت سے رٹائر ہو جاتا ہے تو اکثر طبقہ پھر رکھ لیتا ہے۔ کیا ڈاڑھی رکھنے سے ان کی جان کو خطرہ ہے؟

تو پھر بہت سے علماء اور تبلیغی وہ حضرات جو مکمل علماء کی ہیئت میں رہتے ہیں ان کو تو کوئی خطرہ نہیں کیا ملازمت سے نکالنے کا خطرہ ہے؟ تو ملازمت میں بھی کچھ پابند شرع لوگ نہ صرف معمولی عہدوں پر بلکہ بڑے عہدوں پر ڈاڑھی کے ساتھ ملازمت کرتے ہیں ان کو کوئی خطرہ نہیں صرف آپ کو کیوں ہے؟ یہ صرف ایمانی کمزوری ہے اور نفس وشیطان کا فریب ہے۔ آپ حکمتوں سے ان کو سمجھا کر صحیح راہ پر لائیں۔ اختصاراً تفصیل سے اجتناب کیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان تمام درجات میں حکمت وتدبیر، خلوص و ہمدردی اور فکر صحیح اور طلب

صادق سے محنت جاری رہی اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی کی جاتیں رہیں اور فرداً فرداً ان کو نکالنے پر آپ ڈٹے رہیں تو ان شاء اللہ دھیرے دھیرے لوگ ان دلدلوں سے نکل آئیں گے اگر چہ کچھ مہینے لگ جائیں۔کسی بھی کام میں کامیابی کے لیے کچھ وقت تو لگتا ہی ہے، صرف کام شروع کر دینے سے کامیابی حاصل نہیں ہوتی اگر ایسا ہوتا تو ہر شخص کام کرنے لگ جاتا۔آپ ان عام برائیوں کو دیکھ کر نہ گھبرا جائیں نہ نا امید ہو جائیں۔جو باتیں شروع میں پڑھ کر آئے ہیں انہیں دوبارہ پڑھ لیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تن تنہا پورے معاشرے کو کیسے بدلا۔نیز آپ کو صرف اس کے ظاہری اسباب اختیار کرنے ہیں کام میں تبدیلی لانا اس میں کامیابی دینا اللہ کا کام ہے آپ اپنا کام کریں گے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا کام کریں گے۔

نیز ظاہری اسباب اختیار کرنے میں بھی آپ تنہا نہیں ہیں، مختلف جہتوں سے چاروں طرف کام کرنے والے آپ کے ساتھ ہیں ۔مثلا دعوت وتبلیغ ۔۔۔ خانقاہ ۔۔۔ مدارس ومکاتب۔۔۔تصنیف وتالیف۔۔۔اور دیگر تنظیموں سے، جن کے کام کرنے والے آپ کے رفیق ہیں۔اللہ تعالیٰ آپ اور ہم سب کی بھرپور مدد فرمائیں کہ ہم کمزور ہیں۔ان درجات میں جو جو منکرات بتائے ہیں ان کو ایک ساتھ لے کر چلنا نہیں ہے بل کہ فرداً فرداً لے کر چلنا ہے۔جب ایک پر تھوڑا کام ہوتا ہوا نظر آئے اور اس میں کامیابی کی امید ہو تو دوسرے کو شامل کرنا شروع کر دیں۔پھر دوسرے میں کامیابی کی امید ہو تو تیسرے کو جوڑ دیں اس طرح حکمت سے کام لیں۔

چھٹا درجہ

اس درجہ کے کام بھی پانچویں درجہ کے کام کی طرح مشکل ہیں اور وہ ان ہی کی طرح ان ہی کے ہم مثل ہیں لیکن ان کو الگ درجہ میں بیان کر کے کام میں سہولت پیدا کی گئی ہے۔اوپر

کے درجات میں کامیابی کا حاصل ہونا ان شاء اللہ اس درجہ کے منکرات کی کمر توڑ دے گا یعنی پانچوے درجہ تک پہنچنا ہی خود بخود چھٹے درجہ کی محنت میں قوت وہمت پیدا کر دے گا۔

پہلی مثال : مسلمانوں کو غیر شرعی طریقوں اور رسومات سے بچانا، چاہے وہ زندگی کے جس شعبہ سے متعلق ہوں۔ خصوصًا خواتین کو فیشن پرستی اور شادی بیاہ وغیرہ میں غیر اسلامی رسومات سے خوب بچانا، جو اسلامی طور طریقوں کو چھوڑ کر غیر اسلامی تہذیب کو اختیار کرتی ہیں۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر ذرا تفصیل ملاحظہ ہو۔

کن چیزوں میں : مثلاً دلہا ودلہن کے معاملات میں ۔۔۔ دلہن کی رخصتی میں ۔۔۔ شگون بد کے معاملہ میں ۔۔۔ بیجا اخراجات میں ۔۔۔ بے پردگی اور باریک اور چست لباس میں ۔۔۔ ولیمہ میں ۔۔۔ اسی طرح منگنی کرنے میں ۔۔۔ بچہ کی ولادت میں ۔۔۔ اس کی ختنہ کرنے میں ۔۔۔ اور عقیقہ کرنے وغیرہ میں۔ انہیں سمجھائیں کہ یہ اسلامی طریقے نہیں ہیں اور انہیں فیشن پرستی سے نکالنے اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر لانے کے لیے ذیل وغیرہ کے انداز سے سمجھائیں۔

(۱) نکاح وشادی سے پہلے دونوں خاندان کے لوگوں جمع کر کے ذہن سازی کی جائے۔

(۲) خود دلہا اور دلہن کو بھی علیحدہ علیحدہ طور پر بیٹھ کر سمجھایا جائے۔

(۳) فکری بیانوں میں شریک کیا جائے۔

(۴) پڑھنے کے لیے فکری کتابوں کو مہیا کیا جائے اور پڑھنے کا جائزہ بھی لیا جائے۔

(۵) سنتوں کی عظمت ان کی برکتوں اور نورانیت کو خوب واضح کیا جائے۔

(۶) غیر اسلامی تہذیب کی نحوست اور اس پر کی جانے والی لعنتوں کو سمجھایا جائے۔

(۷)اس کے لیے دعائیں کی جائیں۔

قرآن وحدیث میں جابجا مسلمانوں کو دوسری قوموں کے افعال اختیار کرنے سے سختی سے منع فرمایا گیا ہے۔ کیوں کہ جب تک دوسری قوموں کے افعال وکردار سے اپنوں کو دور نہیں رکھا جائے گا اسلام کی افضلیت وبرتری کیسے واضح ہوگی؟ مخلوط کردار کے ساتھ اسلامی امتیاز اور اس کی خصوصیت کبھی نمایاں نہیں ہوگی۔ افعال وکردار میں غیروں کی مخالفت کرنا اسلام کو تقویت دینا ہے اور اس کی سچی ہمدردی کرنا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے امت کو دس بیس جگہ نہیں سینکڑوں جگہ دوسرے مذاہب کی پیروی کرنے سے اور ان کی اداؤں کو اختیار کرنے سے سختی سے روکا ہے۔ مثلاً۔

صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مثالیں

(۱) نماز کی جماعت کے لیے لوگوں کو جمع کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا تو آگ روشن کرنے ۔۔ ناقوس بجانے ۔۔۔ قرن بجانے وغیرہ کی رایوں کو یہ کہہ کر رد کردیا کہ یہ یہودی ونصاریٰ اور مجوس کا طریقہ ہے (مشکوٰۃ شریف ۶۳)۔

(۲) آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ''خَالِفُوْا الْمشْرِكِیْنَ اَوْفِرُوْا اللُّحٰی وَاحْفُوْا الشَّوَارِبَ'' (۸۰)۔

(۳) آپ نے فرمایا ''خَالِفُوْا الْیَهُوْدَ فَاِنَّهُمْ لَا یُصَلُّوْنَ فِیْ نِعَالِهِمْ وَلَا خِفَافِهِمْ (مشکوٰۃ شریف ۷۳)۔ یہود کی مخالفت کرو یعنی موزوں میں اور جوتوں میں نماز پڑھو کیوں کہ وہ ان میں نماز نہیں پڑھتے۔

(۴) ہمیں سحری کھانے کا حکم دیا کیوں کہ اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کے روزوں اور ہمارے روزوں کے درمیان سحری کھانے کا فرق ہے کہ وہ بغیر سحری روزہ رکھتے ہیں (۱۷۵)۔

(۵) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب جنازہ کے ساتھ جاتے تو جب تک اس کو زمین پر نہ رکھ دیتے آپ نہ بیٹھتے، جب یہودی عالم نے بتایا کہ ہم بھی ایسا ہی کرتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی مخالفت میں بیٹھنا شروع کردیا اور فرمایا خَالِفُوْهُمْ (۱۴۷)۔

(۶) مرض الموت میں فرمایا: ''لَعَنَ اللهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى'' (۶۹) کہ یہودی ونصاریٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا پھر آپ نے ان پر لعنت بھیجی اور اپنی امت کو فرمایا تم ایسا نہ کرنا۔

(۷) فرمایا ''نَظِّفُوْا اَفْنِيَتَكُمْ وَلَا تَشَبَّهُوْا بِالْيَهُوْدِ'' (مشکوٰۃ شریف ۳۸۵)۔ اپنے گھر کے آنگن کو صاف رکھو اور یہودیوں کی مشابہت اختیار نہ کرو۔

(۸) آپ جب استنجاء کے لیے بیٹھے تو مشرکین اور یہود نے مذاق اڑایا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی مخالفت کا حکم دیا (مشکوٰۃ عن سلمان وعن عبدالرحمن ۴۴)۔

(۹) یہود حائض عورتوں سے بالکل منقطع رہتے تھے ان کے ساتھ نہ نشست وبرخاست رکھتے نہ ان کے ساتھ لیٹتے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی مخالفت میں ہمیں سب چیزوں کی اجازت دی سوا جماع کے (مشکوٰۃ ۵۶)۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں ہم نے صرف نمونہ پیش کیا ہے۔

لہٰذا عبادتوں، کھانے پینے، نشست وبرخاست، بول چال اور شب وروز کے تمام کاموں میں اسلامی ہدایات ہی پر لوگوں کو چلایا جائے غیر قوموں کے افعال سے دور رکھا جائے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث ہے جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ تین صحابہ آپ کی عبادت کا حال معلوم کرنے کے لیے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے پاس آئے، ان کو بتایا گیا کہ آپ رات بھر صرف عبادت نہیں کرتے بل کہ سوتے بھی ہیں۔ اور دن میں کبھی، روزہ کبھی افطار

کرتے ہیں اور آپ نے شادیاں بھی کر رکھیں ہیں، تو ان صحابہ کرام میں سے ایک نے رات بھر عبادت کرنے، دوسرے نے دن کو ہمیشہ روزہ رکھنے اور تیسرے نے شادی نہ کرنے کی ٹھان لی۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو جب علم ہوا تو ان کو ان کاموں سے سختی سے روکا۔

اس حدیث شریف کی تشریح تو بڑی طویل ہے۔ یہاں موقع کی مناسبت سے جو بات قابل ذکر ہے وہ یہ کہ **حضرت شاہ اسحاق دہلوی** رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس حدیث شریف سے علماء نے ہر ایسے کام کی مخالفت ونکیر ثابت کی ہے جو بدعت حسنہ رائج کرنے کو کار ثواب سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ ان تینوں صحابہ ؓ نے جن اعمال کو اپنے اوپر لازم کرنے کا ارادہ کیا تھا وہ از قسم عبادت تھے عام دنیوی اعمال نہ تھے وہ از قسم عبادت ہونے کے باوجود محض اس وجہ سے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو ناپسند تھے کہ وہ سنت نبوی ؐ سے زائد تھے۔ (مظاہر حق ۱/۲۰۸)۔ اس سے سوچئے کہ جو کام از قسم عبادت نہ ہوں اور وہ مخالف سنت ہوں اور کسی رسم ورواج یا غیر اقوام کے طور وطریق پر ہوں تو آپ ان سے کتنے ناراض ہوں گے۔

دوسری مثال : ماں باپ کی نافرمانی سے اور رشتہ داروں اور ہم سایہ لوگوں کے ساتھ قطع تعلق سے بچانا ہے۔ اب ہم بجائے اختصار صرف اشارۃً پیش کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ اکثر طبیعتیں اختصار پسند ہیں۔ لہٰذا اب اختصار کی بھی گنجائش نہیں۔

ساتواں درجہ

معروفات کے آخری درجہ کی طرح منکرات کا یہ درجہ بھی سب سے اہم ہے۔ جس میں قطعی محرمات ہیں۔ مثلاً، چوری، شراب نوشی، رشوت، سود، جوا، زنا، ناحق ظلم وقتل اور کسی کی ملکیت پر ناحق قبضہ وغیرہ سے لوگوں کو بچانا۔ ان سب کو فرداً فرداً لے کر ان کے نقصانات اور ان

سے بچنے کے فوائد سمجھا کر حکمتوں اور تدبیروں سے آگے بڑھتے رہیں۔ یہ چند دنوں کا کام ہے نہ چند مہینوں کا آپ اوقات پر سے نظر ہٹا کر صرف محنت وکوشش کرتے رہیں اور اس کے اسباب اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہیں کہ اے اللہ کیا کروں؟ کس طرح کروں؟ کس کو کہوں؟ کیا کہوں؟ ان شاء اللہ اللہ تعالیٰ اسباب وتدبیریں سب ہی کچھ اپنے لایزال خزانوں سے عطا فرمائیں گے۔ بس نظر صرف اللہ تعالیٰ پر مرکوز کرلیجیے کام بن جائے گا۔

مزید طریقۂ کار اور کام کی تدابیر

آپ نے معروفات ومنکرات کے درجات میں خصوصی وجزئی تدابیر کو ملاحظہ فرمایا ہے۔ یہاں چند عمومی وکلی ضروری تدابیر اور طریقۂ کار کو بیان کیا جاتا ہے اس راہ نمائی سے آپ اپنے اصلاحی کام کو انجام دے سکتے ہیں۔

تشخیص: جو بھی مسلمان مذہب کا احساس وشعور رکھتا ہے، یا جو بھی مسلمان دین کا اچھا خاصا پابند ہے ان میں سے کوئی بھی خلاف شرع جو بھی کام کرتا ہے، وہ نہ قصداً کرتا ہے اور نہ ہی خلاف شرع کا جذبہ رکھتا ہے، بل کہ جذبہ تو بہرحال اچھا ہی رکھتا ہے، لیکن جو بے دینی اختیار کرتا ہے وہ نتیجہ ہوتا ہے ''بوجہ ضعفِ ایمان'' بے فکری۔۔۔غفلت۔۔۔عادت۔۔۔حب جاہ۔۔۔حب مال۔۔۔ ریاکاری وغیرہ کا۔ لہٰذا جو ائمہ حضرات اس کو سمجھ لیں ان کے لیے ان کی اصلاح آسان ہوجاتی ہے۔ کیوں کہ مرض کی تشخیص کرلی ہوتی ہے لہٰذا ان کا علاج ایمانی شعور لانا بے فکری غفلت اور عادت کو دور کرنا ہوگا۔ کام کی تدابیر سے پہلے ذیل کی نہایت ہی اہم صفات ملحوظ رکھیں۔

اصلاح سے قبل ضروری صفات

● اگر آپ فی الحقیقت مسلمانوں میں اصلاح کے خواہش مند ہیں تو سب سے پہلے ایک عہد ضرور فرمائیں۔ وہ یہ کہ آپ لوگوں کے مال ومتاع ''وَمَا عِنْدَهُمْ '' سے بالکل مستغنی ہوجائیں۔ ان سے ایسا استغناء اختیار کریں جیسے بکری کے مالک کا مری بکری سے اور جیسے مالدار کا غرباء سے۔

● اصلاح ناس کے لیے مصلح میں بہت سی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ جس کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہے علم وفکر۔ مصلح میں علم وفکر کی صفات تمام صفات پر غالب ہونی چاہئیں، یعنی مصلح مفکر ہو اور خوب علم سے لیس بھی۔ لہٰذا مطالعہ کا ذوق بڑھائیں، حتی کہ مروجہ عبادات میں مصلح کی اگر زیادہ جدوجہد نہ بھی رہی تو وہ مخل فی الاصلاح نہیں۔ ہاں عبادت وعبدیت اعلیٰ درجہ کی ضرور مطلوب ہے۔ آپ عبادت مقررہ معروفہ اور عبادت بمعنی عبدیت وطاعت میں فرق کو سمجھیں، معلوم نہ ہو تو پوچھ لیں ورنہ خبط ہوجائے گا۔

● اپنے تقویٰ وعبادت کا معیار چاہے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو لیکن اس کا طرز وانداز ایسا نہ ہو کہ جس سے عوام آپ کو اپنے سے ممتاز خیال کرلیں۔ ایسا ہوا تو اصلاح کا دروازہ بند ہوجائے گا، کیوں کہ وہ یہ سمجھیں گے پابند شرع ہونا اور خوب عبادت میں لگنا بڑے لوگوں کا کام ہے۔ ہر ایک کا نہیں اور یہ سمجھ کر اپنی چھٹی کرلیں گے۔ سیرت میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اب آپ کو اصلاح کرنے کا کام شروع کرنا[۱] ہے۔

---

[۱] آپ کا عظیم منصب اپنی جگہ بہت بڑا ہے لیکن آپ کو چاہیے کہ مدارس کے مشائخ، مفتیان، ارباب اہتمام، اہل تصوف اور اہل تبلیغ کے اکابرین اور دیگر علمائے کرام کے مناصب ومقام کا بھی خوب پاس ولحاظ رکھیں، آپ ان سے قریب رہیں ان کی خدمت سے فائدہ اٹھائیں اور اس کام کے لیے دعا کی درخواست کریں اور ان سے مشورہ بھی لیں۔

اصل طریقۂ کار

[۱] مذکورہ درجات کی چیزوں پر ترغیب سے پہلے لوگوں کو اچھائیوں اور خرابیوں کا احساس اور اچھائیوں سے متصف ہونے اور برائیوں سے دور رہنے کی ضرورت کا احساس اس طرح دلائیں جس طرح کوئی شخص میلے کپڑوں کو دھونے اور بے غسل پسینہ سے تربتر شخص غسل کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

[۲] معروفات ومنکرات کے درجات سے کام شروع کرنے سے پہلے (جیسا کہ نمبر ۱ پر مذکور ہے) ایک دو ایک دو روز چھوڑ کر آپ سلام پھیر کر قبل الدعا مصلّی پر کھڑے ہو جائیں اور سب ہی کو متوجہ کر کے اس دن جو کام خلاف شرع کسی سے دیکھا ہو اس سے عام اور حسین اسلوب میں روکیں۔ ان شاء اللہ ضرور فائدہ ہوگا۔

یہ آپ کا ذمہ بھی ہے آپ کا حق بھی۔ لوہا گرم ہو اور پٹائی ہو تو کام بن جاتا ہے۔ لیکن آپ کھڑے ہو کر کیا کہیں گے۔ وہ علمی غذا کا متقاضی ہے۔ سیرت وغیرہ کا مطالعہ بھی رکھیں۔ کچھ مواد تنظیمی پروگراموں میں اشارۃً پیش کیا جائے گا۔

اصلاح کا طریقہ صرف یہ نہیں کہ وعظ وبیان میں تنبیہ کی جائے، بل کہ اس کا اچھا اور ثابت شدہ طریقہ یہ ہے کہ نماز کے بعد فوراً کھڑے ہو کر اصلاح کی جائے جیسا کہ روایتوں سے ثابت ہے۔ جن کا بیان شروع کتاب میں گذر چکا ہے۔

(۱) ان مذکورہ درجات پر لانے کے لیے طریقہ یہ ہے کہ پنج وقتہ نمازوں میں سے جس نماز کے اندر نمازی زیادہ ہوں اور وہ دس پندرہ منٹ وقت فارغ کر سکتے ہوں اس نماز کے بعد آپ کھڑے ہو کر بالترتیب موضوع (درجہ) سے متعلق ترغیب دیں اور ایسا ہفتے میں صرف دو مرتبہ

کریں۔ مثلاً اتواراور جمعرات۔ اگر دلچسپی نظر آئے تو ایک دن اور بڑھادیں۔[۱]

(۲) مذکورہ تمام درجات میں سے آپ ایک ایک درجہ بالتدریج لے کراٹھیں۔ درجات کی تعیین اس لیے ہے تاکہ آپ کے سامنے اپنے کام کی ایک حداور سطح متعین ہوتو آپ شعوری طور پر ایک درجہ کے کام کو پورا کرکے دوسرے درجہ کے کام کو بسہولت شروع کرسکیں۔

(۳) کام کے دوران آپ کی مسجد میں کسی مدرسہ کے شیخ الحدیث صاحب کوئی بڑے عالم ومفتی اور مہتمم صاحبان تشریف لائیں اور کچھ وقت بھی ہوتو آپ ان کے سامنے اس نہج کا تذکرہ کریں، اور انہیں یہ کتاب بتائیں۔ لیکن ساری کتاب پڑھنے کا وقت حضرت کے پاس نہ ہوگا صرف معروفات ومنکرات کے یہ درجات اور طریقۂ کاراور کام کی تدابیر بتائیں اور کہیں کہ ''الحمدللہ اس نہج پر کام ہورہا ہے پھر فرمائش کریں کہ اس بارے میں حضرت والا کے ارشادات مقتدیوں کے سامنے آئیں تو بہتر ہو۔ ان شاءاللہ ان بڑے حضرات کے چند کلمات آپ کے لیے بہت ہی معاون ثابت ہوں گے۔

(۴) ائمہ حضرات یہ بھی حکمت عملی اختیار کریں کہ وہ اپنے منصب امامت کے دوران مقامی قابل علماء کوتقریر وبیان اور نماز پڑھانے میں موقع دیا کریں۔ اس لیے کہ اس میں

(الف) عوام کا دینی فائدہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ مختلف افراد سے مختلف فکروں سے ضروری باتیں سامنے آتی ہیں۔

---

[۱] اس وقت کتاب ہذا کی تالیف کا سبب بھی بندے کی اس طرح کی امامت سے دل کا داعیہ ہے۔ ۱۹۸۶ء میں فراغت کے بعد چندسال امامت کے دوران روزانہ ۱۵ منٹ دینی دلچسپی پر علمی، حکمتی، نکاتی گفتگو کرتا۔ پھر دھیرے دھیرے شریعت ''معروفات ومنکرات'' پرلاتا، ہر چیز پر اہتمام سے قرآن وحدیث، سیرت اور اسلاف کے حالات پیش کرتا، لوگوں میں اس قدر رغبت پیدا ہوئی کہ بازاروں سے آنے والا طبقہ مزید ۱۵ منٹ رک جاتا، بل کہ دوسری مساجد کے نمازی بھی وہاں آتے جس کا مثبت اثر خواتین پر بھی ہوتا۔ وللہ الحمد۔

(ب) اس سے خود ائمہ حضرات کی عزت لوگوں میں بڑھ جاتی ہے۔ کیوں کہ ائمہ کی قوم کے حق میں دینی ومذہبی ہمدردی ظاہر ہوتی ہے۔

(ج) بڑا فائدہ یہ کہ جب آپ اپنے اصلاحی کام میں ان سے تعاون حاصل کرنا چاہیں گے تو وہ دل وجان سے تعاون کریں گے۔لہٰذا ایسے مخلص علماء کو بھی کبھی موقع فراہم کریں۔

راقم الحروف تو عوام الناس کے عمومی فائدے کے پیش نظر دعوتی جماعتوں کی آمد پر سنجیدہ خطاب کرنے والے تبلیغی حضرات کو بھی جمعہ کے دن خطاب کا موقع دیتا تھا۔

(۵) کسی قصبہ میں اگر چند مساجد ہیں تو جامع مسجد کے امام صاحب بقیہ مساجد کے ائمہ سے مل کر ایک ہی جہت سے اور ایک ہی درجہ سے متفقہ طور پر کام انجام دیں تا کہ کام کو اجتماعیت کی قوت حاصل ہو۔ جب سب ہی شریک کار بنکر ایک ہی نہج سے کام کریں گے تو اس سے کام میں سہولت بھی ہوگی اور اس میں ترقی بھی۔

(٦) آپ کا یہ کام اور طریقہ اس طرح کا نہیں جیسے (تعلیم بالغان کا) بعض مساجد کے ائمہ کا ہے کہ مکتب کے بچوں کے علاوہ بڑی عمر کے حضرات کو قرآن شریف سکھانے اور نماز کا طریقہ سکھانے کے لیے کچھ وقت فارغ کر کے ان پر محنت کرتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ الحمد اللہ بہت اچھا کام ہے۔لیکن یہ کام ایک تو تمام نمازیوں بل کہ پوری آبادی کے لیے ہے اور دوسرے صرف قرآن پڑھنے سکھانے کے لیے نہیں بل کہ پورے دین کو زندہ کرنے اور اس کو پوری زندگی میں لانے کے لیے ہے۔لہٰذا کام کو اچھی طرح سمجھ کر حکمت وفکر سے انجام دیں۔

لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ یہ صرف سننے سنانے کا عمل بن کے نہ رہ جائے جواب تک ہر جگہ ہوتا رہا ہے۔بل کہ اسے عملی جامہ پہنانے،لوگوں میں فکر وعمل کو جگانے اور ان کی زندگیوں

کو بدلنے کے ارادے سے انجام دیں۔ یہ چند دنوں کا کام نہیں بل کہ چند مہینوں کا بھی نہیں، آپ اوقات پر سے نظر ہٹالیں آپ کی آخری منزل یہ ہے کہ لوگ ان درجات پر عملاً آجائیں۔

(۷) اس کام کی مثال ایسی ہی سمجھئے جیسے مکتب کا مدرس۔ جس طرح مکتب کا مدرس ایک بالکل ابتدائی تعلیم بچہ کو الف با یعنی حروف شناسی (تختی) سے۔۔۔ ترکیب حروف وحرکات وسکنات (قاعدۂ بغدادی ونورانی) پر۔۔۔ پھر بذریعہ طویل جملے اور آیتوں کے ٹکڑے روانی (پارۂ عم) پر۔۔۔ پھر پنج پارہ۔۔۔ اور ختم قرآن تک پہونچا تا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں تعلیم مقصود ہے اور یہاں تعمیل کہ بالتدریج لوگوں کو تمام دینی امور پر عملاً قائم کرنا ہے۔

(۸) آپ اس مبارک عمل میں اپنی کامیابی کے لیے ایک کام یہ کریں کہ ابتدائی دو درجات میں کامیابی حاصل ہونے کے بعد خود ان لوگوں کو جو آپ کی بتائی باتوں کو بجالائیں اپنے کام میں شریک کرلیں اس سے آپ کی کمر اور مضبوط ہوگی، یعنی انہیں اپنی فکروں اور کام کی سطحوں سے آگاہ کریں۔

(۹) کام کی کچھ سطح بلند ہونے اور کام کی شکل بننے کے بعد آپ جن نمازیوں سے مخاطب ہوتے ہیں اور آپ کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں ان کو یہ بھی بتادیں کہ ان چیزوں کا تذکرہ اپنے گھروں اور اپنی مجالس میں کیا کریں اور ان میں حتی الوسع ان کو زندہ کریں۔ یہ عمل ایک طرف مخاطبین کو عامل بناتا ہے تو دوسری طرف ان کو داعی بھی بناتا ہے اور یہ دعوت کام کا مزید میدان ہموار کرے گی۔

(۱۰) اس کا تذکرہ (ترغیبی مضامین کا) ابھی جمعہ کے خطاب میں نہ کریں۔

اولاً اس لیے کہ عامۃً جمعہ وغیرہ کا خطاب لوگوں کے یہاں صرف سننے سنانے کا عمل بن کے رہ گیا ہے اس سے بڑھ کر فکر وعمل کی حیثیت دینے سے لوگ کتراتے ہیں۔

اب اگر اس کو بھی اس میں شامل کیا جائے گا۔تو یہ بھی اپنی حقیقت کھو بیٹھے گا لہٰذا ضروری ہے کہ کوئی ایسی تدبیر اور کوئی ایسا جدید طرز اختیار کیا جائے جو لوگوں کی نظر میں وقعت پیدا کر کے ان میں فکر و عمل کے ناتے انقلاب لا سکے۔جس کے لیے وہی طریقہ ہے جو ہم نے ابھی بتایا۔

ہاں ایک عرصہ کے بعد کچھ درجات میں کامیابی حاصل ہو جائے اور لوگوں میں فکر و عمل محسوس کریں تو وقتاً فوقتاً جمعہ کے خطاب میں اس کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

چناں چہ آپ اس تجربہ سے متفق ہوں گے کہ جب کوئی کافر ایمان لے آئے اور کوئی فاسق و گنہگار اپنی سابقہ زندگی سے تائب ہو جائے تو اس کی موجودہ زندگی کا حال عام مسلمانوں کی زندگی کے حال سے بالکل جداگانہ ہوتا ہے کیوں کہ عام مسلمان وہی بے حسی و بے فکری اور روایتی زندگی گزارنے کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں جب کہ وہ دونوں ایک فکری اور شعوری زندگی گزارنا شروع کرتے ہیں۔بس یہاں بھی اسی طرح جدید طرز سے انہیں روایتی زندگی سے نکال کر شعوری وفکری زندگی پر کھڑا کرنا ہے۔

ثانیاً اس لیے کہ کسی بھی کام کی ابتدا افراد سے ہوتی ہے مجمع عام سے نہیں۔لہٰذا وقتیہ نمازیوں سے ابتدا مناسب ہوگی کہ یہ بیک وقت افراد و مجمع دونوں سے ابتدا کے قائم مقام ہے۔ نیز جب کچھ لوگ اچھائی سے متصف ہوں گے تو سبقاً سبقاً دوسروں کے لیے عبرت کا سامان ہوگا اور ان کے لیے بھی اس سے متصف ہونا آسان ہوگا اور پھر پورا معاشرہ اس پر قائم ہوگا کیوں کہ معاشرہ افراد ہی کے مجموعہ کا نام ہے۔

(۱۱) جن حکمتوں کا ذکر ماقبل میں ہوا ہے ان پر نظر رکھیں اس سے آپ کے سامنے مزید تدبیریں اور راہیں کھلیں گی۔

(۱۲) مزید تقویت اس وقت حاصل ہوگی جب مسجد میں تعلیمی حلقے قائم کرنے کا وقت آپہنچے گا اور آپ حلقے قائم کریں گے۔ جس کا بیان حصہ چہارم میں ہوگا۔

(۱۳) اگر ضرورت شدیدہ پیش آجائے تو باعتبار اپنے مقام ومنصب حسب موقع کچھ سختی آپ کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ ہر جگہ نرمی کام نہیں دیتی بل کہ سختی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ ''اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَن'' والا حکم بالکل عام نہیں ہے بل کہ مخاطب کے سلیم الطبع ہونے کے ساتھ مقید ہے۔ پس جس جگہ طبیعت نہایت کج ہو اس کا علاج نشتر ہے کیوں کہ یہ بھی ایک علاج ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ نے مخلوق کی اصلاح کے لیے جہاں چار کتابیں نازل فرمائیں ہیں وہاں پانچویں چیز آہنی سلاخ بھی نازل کی ہے چناں چہ ارشاد ہے ''وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ''۔ (حدید ۲۵)۔ (خطبات حکیم الامت ۴۲۹)۔ جیسے ہم نے منکرات کے درجہ میں ایک دو جگہ اس طرح کی سختی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

چناں چہ مختلف زمانوں کے بادشاہوں نے بھی (قطع نظر از شریعت) اپنے اپنے طور پر مختلف حکمتوں کے پیش نظر اہل جرائم کے لیے مختلف سزائیں وضع کر رکھی تھیں۔

علامہ شعبی رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب کوئی گنہگار لایا جاتا تو لوگوں کے سامنے کھڑا کر کے بطور سزا صرف اس کے سر سے عمامہ اتار لیا جاتا۔ اور زیاد کے دور میں گنہ گاروں کو کوڑوں سے سزا دی جاتی، اور مصعب بن زبیر کے دور میں ڈاڑھی مونڈ دی جاتی اور بشیر بن مروان کے زمانہ میں گنہ گار کی آنکھ پھوڑ دی جاتی اور جب حجاج بن یوسف ثقفی ظالم کا دور آیا تو کہنے لگے یہ تو سب کھیل تھا سزا تو یہ ہے کہ اس کو قتل کیا جائے۔

چناں چہ قتل شروع کر دیا۔(فتح الباری ۱۶/۷/۱۲۔عمدۃ القاری ۲۴/۱۸۵)۔

(۱۴) کبھی کبھار حکمت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جو کرنا چاہتے ہیں اسے وقتی طور پر کرنا چھوڑ دیں۔ کیوں کہ اس وقت اس کو کرنا ہی خلاف حکمت ہوتا ہے۔ بلفظ دیگر کبھی مسئلہ کا حل یہی ہوتا ہے کہ اسے حل نہ کیا جائے اور اسے مسئلہ ہی نہ سمجھا جائے۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے شورش کے زمانہ میں اہل مدارس دیوبند کو لکھا کہ اب تک تو آپ حضرات تدابیر میں رہے، اب ترک تدابیر کر کے بھی دیکھ لیں یہ نسخہ بھی بڑا مجرب ہے۔ اور اس ترک تدابیر میں اگر کوئی نقصان ہوا بھی تو اتنا نہ ہوگا جتنا تدابیر میں ہوا ہے مگر اکثر لوگ تدابیرات میں ہی لگے رہتے ہیں [۱]۔ (العلم والعلماء ۸۷)۔

ائمہ حضرات اور کام کی صلاحیت

جن ائمہ حضرات کے لیے یہ اصلاحی تدبیریں پیش کی جارہی ہیں ان ائمہ کی اس کام کی صلاحیت کے ناتے تین قسمیں ہوسکتی ہیں۔

الف۔ ان امور کو بحسن خوبی انجام دینے کی خداداد صلاحیت سے خوب مالا مال ہوں۔ اور وہ ابتک اصلاحی کام انجام دیتے بھی رہے ہوں۔ لیکن ابتک کوئی مرتب شکل اور مرتب کورس نہ ہونے کی وجہ سے کیف ما اتفق کام کرنے سے دقت کا سامنا کر رہے تھے اور نتیجہ بھی نہیں پا رہے تھے تو ان شاء اللہ اب ان کے لیے سمت متعین ہونے اور کورس معلوم ہونے سے سہولت ہو جائے گی۔ لہٰذا وہ حضرات تو ابتدائی و درمیانی درجہ سے کام شروع کر کے نصابی درجہ تک پہنچ کر اسے شروع کر دیں۔

[۱] ہم نے معروفات و منکرات کے درجات اور ان کی مثالیں اپنی صواب دید کے اعتبار سے مرتب کی ہیں۔ لیکن بعض علاقوں اور مختلف قوموں اور جماعتوں کے لحاظ سے فرق پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا اگر یہی صورت کسی کو پیش آجائے تو وہ اپنے یہاں کے لحاظ سے ان کی مثالیں خود طے کر کے اس پر کام کی توجہ صرف کرے۔

ب : کم وبیش صلاحیت کے حامل ہوں لیکن اس کے عامل نہ ہوں کیوں کہ یا تو ان کے سامنے کوئی چلنے کی سمت متعین نہ تھی یا تو وہ اصلاح کی اہمیت فراموش کیے ہوئے تھے۔ تو ایسے ائمہ بھی اب از سرِ نو کام کو شروع کر دیں۔

ج : اس کی صلاحیت سے محروم ہوں۔ چاہے عالمیت نہ کرنے کی وجہ سے یا واقعتہ اس سے محروم ہونے کی وجہ سے۔ ان کے لیے ایک خاص ہدایت یہ ہے۔

اگر آپ میں اصلاح ناس کی طلب وتڑپ ہے تو آپ اس کے اجر وثواب کے ضرور مستحق ہوں گے کیوں کہ مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بہتر اور بڑھ کر ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی جتنا ممکن ہو آپ بھی اس کو انجام دیتے رہیں۔ اگر آپ نا اہل ہیں تو کوئی فکر کی بات نہیں آپ اس کے لیے دو کام کریں اور کام کو لے کر اٹھیں ان شاء اللہ تعالیٰ، اللہ تعالیٰ آپ میں اہلیت پیدا فرما دیں گے۔

ایک یہ کہ کسی ذی بصیرت دیندار شخص کو اپنے ساتھ رکھیں اگر دو چار افراد کو شامل کر لیں گے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ ان کو اس کتاب کے اصلاحی طریق سے باخبر کریں پھر ان سے تعاون کی درخواست کریں، ان سے آپ کو کافی کام کی راہ نمائی حاصل ہوگی۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ سے اس کی اہلیت مانگیں۔ اللہ تعالیٰ عظیم قدرتوں کا مالک ہے۔ ان شاء اللہ آپ میں ہمت بھی پیدا ہوگی اور اہلیت بھی۔

ویسے یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ بالکل صلاحیت سے محروم ہوں۔ کیوں کہ حدیث شریف میں ہر شخص میں کم وبیش صلاحیت ہونے کی خبر موجود ہے ارشاد ہے۔ ’’ اَلنَّاسُ مَعَادِنُ کَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ ‘‘(مشکوٰۃ ۳۲)

مذہب اسلام میں کام کے لیے صلاحیت وقابلیت سے زیادہ صلاح وقبولیت مطلوب

ہے۔ بہت سے قابل اور حامل صلاحیت انسان دربار الٰہی میں محروم ومردود ہیں۔ آں حضرت ﷺ۔نعوذ باللہ۔غیروں کی نظر میں کم عقل ہی نہیں مجنون تھے لیکن تھے امام الانبیاء بلکہ نبی الانبیاءعلیہم السلام۔لہٰذا بس کام کی فکر اوڑھ لیں اور دعا کا خوب اہتمام کریں۔

ایک بات پلے باندھ لیں کہ جب کوئی شخص بغیر صلاحیت ومہارت کے کسی کام کی فکر لیکر اس میں مصروف ہوجاتا ہے اور ہمہ تن لگا رہتا ہے تو یہ مصروفیت خود مہارت پیدا کر دیتی ہے۔

جو لوگ بھی جس جس میدان میں آج شہسوار نظر آتے ہیں وہ ابتدائی مرحلے میں ایسے نہیں تھے یہ مصروفیت کا کمال ہے جس نے انہیں آج شہسوار بنادیا ہے۔ گجراتی میں کہاوت ہے : ''دھندھو، دھندھا نے سکھواڈے چھے'' اس کا وہی مطلب ہے جو ہم نے بتایا۔ صلاحیت پر مزید تفصیل حصہ اول میں بھی مذکور ہے۔

ائمہ حضرات کے کام کا جائزہ

آپ اگر ٹھان لیں تو کیا ایک سال میں اپنے معاشرے سے ۵ / ۷ گناہ کم نہیں کرا سکتے ، ۵ / ۷ نیک اعمال معاشرہ میں زندہ نہیں کرا سکتے ، دس سنتیں رائج نہیں کرا سکتے ، ھکذا۔ پھر دس سال کی امامت کا حساب لگائیں ۔۔۔ اور بیس سال کی امامت کا ۔۔۔ آپ سوچیں آخرت کی کتنی بڑی پونجی کے آپ مالک بن سکتے ہیں۔ اور جو معاشرے میں اصلاح وسدھار آئے وہ علیٰحدہ۔

یہ تو ایک امام صاحب کے کام کا نتیجہ ہوا ۔۔۔ پورے ضلع کے ائمہ حضرات کا نتیجہ کیا ہوگا ۔۔۔ اور پورے صوبہ کے ائمہ حضرات کے کام سے ۔۔۔ کتنا انقلاب آئے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ائمہ حضرات کی پوری جماعت طے کرلے کہ ان شاء اللہ آج سے ہم ضرور کام کے لیے''

صرف رضاء الٰہی اور ذمہ داری کو ادا کرنے کی نیت سے'' اٹھ نے تیار ہیں تو ان شاء اللہ چند سالوں میں صوبہ گجرات کا اور مجموعاً تمام جگہوں کا نظارہ الگ ہوگا۔(وماتوفیقی الا باللہ)۔

آج ہر کام اور ہر شعبہ میں ۵/۱۰ سال میں کام اتنی ترقی کرجاتا ہے کہ ماضی کا حال بھول جایا کرتے ہیں۔ائمہ حضرات اس طرح پچھلے ۱۰/۲۰ سال کی امامت میں ترقی، برابری یا انحطاط کا حساب تو کیا کریں! ایسا نہ ہو کہ آپ انحطاط کی طرف جارہے ہو!!

اصلاح خواتین کی ضرورت پر ارشادات

ہمارے مدیر جامعہ حسینیہ راندیر حضرت مولانا محمود شبیر صاحب دامت فیوضہم نے فرمایا : اصلاح خواتین کی طرف ائمہ حضرات کو توجہ دینے کی شدید ضرورت ہے، ان کا دینی ذہن دینی مزاج بنانا ائمہ حضرات کی اہم ذمے داری ہے۔اگر خواتین کا ذہن نہیں بنایا گیا تو چاہے شوہر مفتی صاحب ہوں کہ امام صاحب، شادی بیاہ وغیرہ کے موقع پر خواتین کہدیں گی ''تم خاموش رہو، تم کو معلوم نہیں شادیوں میں یہ تو کرنا ہی پڑتا ہے '' یہ کہہ کر پیٹ بھر کر غیر اسلامی طریقوں کو اپنائیں گی اور سنت واسلام کا جنازہ نکالیں گی اور مفتی صاحب اور امام صاحب کچھ کہہ نہ پائیں گے۔

ہم لوگ ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہوئی ہے، سمجھ کر انہیں اہمیت نہیں دیتے حالاں کہ مردوں سے زیادہ مجاہدہ کرتی ہیں، اور شعور وذہن کے لحاظ سے بھی بعض خاندان کی خواتین بعض مردوں سے بڑھی ہوئی ہوتی ہیں اور ان کی وجہ سے شادی کے بعد معاشرے میں خاوند کے گھر کی قدر قیمت بڑھ جاتی ہے، [1]

---

[1] بندہ جب ائمہ مساجد کے لیے تنظیم کا خیال والتماس نامہ لے کر (یکم جمادی الثانیہ ۱۴۳۸ھ) حضرت کے پاس پہنچا تب آپ نے فرمایا تھا : کہ بہت اچھا لکھا ہے اور اچھی سوچ ہے بس ہونا چاہتا ہے، ائمہ کے تربیتی جوڑ ہونے چاہئیں، اور ائمہ کو مردوں کی اصلاح کے ساتھ خواتین کی اصلاح کی طرف بھی خصوصی توجہ کرنی چاہیے پھر مذکورہ بالا باتیں ارشاد فرمائیں۔

فقیہ عصر مفتی زماں حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت فیوضہم نے فرمایا: گجرات میں کس چیز کی کمی ہے؟ مکاتب ومدارس ہیں اور بڑے بڑے ہیں، اہل تصوف بڑی شخصیتیں ہیں، اکابرین تبلیغ بھی ہیں۔ ہم کیا کہیں؟ لیکن ایک بات ضرور کہنے کو دل چاہتا ہے کہ اتنی ساری دینی محنتوں کے باوجود لوگوں کا خیال یہ ہے کہ دین کا تعلق صرف نمازوں اور مسجدوں تک ہے نماز میں کوئی غلطی ہوتی ہے تو لوگ فوراً عالم صاحب اور مفتی صاحب سے مسئلہ دریافت کر لیتے ہیں کہ ہماری نماز ہوئی یا نہیں، سجدہ سہو واجب ہے یا نہیں؟

لیکن جب پڑوسیوں اور زوجین کے درمیان معاملات بگڑتے ہیں تو یہاں کوئی عالم صاحب یا مفتی صاحب سے مسئلہ نہیں پوچھتا کہ شریعت کیا کہتی ہے اسلام کیا کہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم مسجد سے خارج معاملات ومعاشرت میں دین ومذہب کو نہیں مانتے گویا یہ کہتے ہیں کہ یہاں سماج کو دیکھا جائے گا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا، اس کے لیے کورٹ میں جایا جائے گا، نہ کہ علماء ومفتیان اور شرعی پنچایت میں۔

حضرت نے فرمایا: ہمارا مسئلہ کیسا ٹیڑھا ہے، ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ میرا نکاح کوئی بڑے مولانا پڑھائیں، لیکن نکاح کے بعد اسی زوجین میں کوئی جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے تو چاہیے کہ انہی مولانا کو (یا انہی جیسے عالم صاحب کو) مقدمہ کا فیصل مان لیں۔ اور جھگڑا ختم کر دیں لیکن ان کا فیصلہ کوئی منظور نہیں رکھتا اور مقدمہ کورٹ میں لے جاتے ہیں، حالاں کہ جس طرح وہ نکاح پڑھانے میں بڑے ہیں اور امام ہیں تو رفع تنازعات میں بھی ان کو بڑا اور اپنا امام ماننا چاہیے۔

کورٹ کا حال سب ہی کو معلوم ہے کہ وہ تو ’’ختم عدت کے بعد بھی‘‘ بیوی کے لیے شوہر پر نفقہ لازم کرتی ہے جو قطعاً خلاف شرع ہے خواتین طلاق کے بعد اپنے خاندان والوں

کے ساتھ کورٹ کے سامنے یہ مطالبہ رکھتی ہیں کہ زندگی بھر کے لیے ہمارا نفقہ اس پر لازم کیا جائے حالاں کہ اسلام میں عدت ختم ہوتے ہی ایک دوسرے کے تعلق بالکلیہ ختم ہوجاتے ہیں اور ایک دوسرے کے حق میں اجنبی ہوجاتے ہیں یہ نفقہ اس مطلقہ عورت کو لینا قطعاً حرام ہے۔

حضرت نے فرمایا: تمہیں کوئی اجنبی شخص کہے کہ ''لو یہ ۲۵ ہزار روپے میں تمہاری بہن کو دیتا ہوں اس کو دیدینا'' کیا تمہاری غیرت برداشت کرے گی؟ ایک اجنبی شخص ہماری بہن کو کیوں ۲۵ ہزار دے گا؟ تو یہاں بھی اب طلاق وعدت کے بعد شوہر بیوی کے حق میں اجنبی ہے اس کے روپے کیسے کھائے جارہے ہیں؟۔ یا دو آدمیوں میں لڑائی جھگڑا ہوگیا کیا اس کے بعد ایک شخص دوسرے کو پانچ روپے بھی لینے اور دینے سے خوش ہوگا؟ ہرگز نہیں تو زوجین میں جب اتنا بڑا تعلق ٹوٹا ہوا ہے وہاں کیوں زبردستی لینے پر خوش ہیں؟

ایک چھوٹے مسلم جج نے اس بڑے جج سے پوچھا جس نے مسلم زوجین کے مقدمے میں عدت کے بعد شوہر پر نفقہ کا فیصلہ کردیا تھا کہ آپ نے خلاف قانون (شریعت) نفقہ کیسے لازم کردیا تو اس بڑے جج نے کہا: تمہیں (مسلموں کو) مقدمہ کورٹ میں لانے کو کس نے کہا تھا؟ تمہیں اگر اپنی شریعت عزیز ہے تمہیں اپنا دین ومذہب محبوب ہے تو تم اپنے مقدمات یہاں کیوں لاتے ہو خود سے حل کیوں نہیں کرتے؟ اس لیے خواتین کو دینی شعور دینے کی شدید ضرورت ہے [1]

[1] حضرت نے یہ خطاب ۳ مئی ۲۰۱۷ء بدھ کے بعد کی رات کو تقریباً ۱۱ بجے (اِکلرا) گاؤں میں جناب حافظ مناف صاحب پٹیل کے وسیع مکان میں دعوت طعام کے بعد علماء وعوام کی جم غفیر تقریباً ۷۰/۸۰ افراد کے درمیان کیا تھا جب کہ حضرت والا، جامعۃ القرأت کفلیتہ از جانب حضرت مولانا قاری محمد اسماعیل صاحب دامت برکاتہم مدرسہ کے سالانہ اجلاس میں مدعو تھے۔ اس وقت بندہ برائے ''نہج الائمۃ فی اصلاح الامۃ'' حضرت کی تقریظ کے لیے بوقت مغرب ایرپوٹ سے رات کو ایک بجے تک ساتھ رہا اور حضرت نے کتاب کو ملاحظہ فرماکر تقریظ عطا کی۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

طریقہ کار برائے اصلاحِ خواتین

جزئی اصلاحِ خواتین کا ذکر تو معروفات ومنکرات کے مرتب درجات کے تحت ہوا ہے تاہم مستقل اصلاحِ خواتین کا طریقہ کار کیا ہو اس کو یہاں مختصراً پیش کیا جاتا ہے۔ ویسے بھی خواتین مردوں کے تابع ہیں ان کی اصلاح عورتوں کی اصلاح کا ضامن ہے۔ پھر بھی چند اصلاحی مفید تدابیر پیش خدمت ہیں۔

جب مسجدوں میں مردوں کی اصلاح کا ایک عرصہ گذر جائے تو اب خواتین اسلام میں بھی اصلاح کا کام شروع کرلیا جائے، کیوں کہ مردوں کی بنسبت خواتین زیادہ مستحقِ اصلاح ہیں، کیوں کہ معاشرے کو بگاڑنے اور سنوارنے میں خواتین کا کردار زیادہ ہوتا ہے۔ اور کم قسمتی سے عامۃً اب خاوند لوگ بھی اپنی بیگمات کی چنگلوں میں آچکے ہیں، لہٰذا جب تک خواتین کو اصلاح کے لیے آمادہ نہیں کرلیا جاتا مردوں میں بھی خاطر خواہ اصلاح ممکن نہیں۔

حضرت مفتی زین العابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ اگر تم سارے مرد حضرت حسن بصریؒ کی طرح بھی بن جاؤ پھر بھی دین زندہ نہیں ہوگا جب تک عورتوں کے اندر دین زندہ نہ ہو۔ اور عورتیں ساری رابعہ بصریہؒ کی طرح بن جائیں پھر بھی دین زندہ نہیں ہوگا جب تک بچوں میں دین زندہ نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو محنت فرمائی اس سے مردوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے، عورتوں میں ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، بچوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، اور غلاموں میں سیدنا حضرت بلال رضی اللہ عنہ۔ جب ان چاروں طبقوں میں ہماری طرف سے محنت ہوگی تو دین تمام شعبوں میں زندہ ہوگا۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم مساجد کو اس طرح آباد کریں کہ اس کا اثر محلہ کی اسکولوں بازاروں، کھیتوں اور آفسوں تک بھی پہنچے۔

لیکن یہ بھی یادرکھنا چاہیے کہ خواتین نرم دل، رقیق طبیعت ہوتی ہیں۔وہ جس طرح باطل اور برائیوں کی طرف مائل ہوکر معاشرے کو جلد خراب کرتی ہیں، اس طرح وہ حق وبھلائیوں کی طرف مائل ہوکر معاشرے کو جلد اچھا بھی بناتی ہیں۔لہٰذا ان پر تھوڑی سی توجہ اگر حکمت سے ہوئی تو ان شاء اللہ بہت بڑی اصلاح کا سبب وذریعہ ہوگی۔

طریقۂ اصلاح کا آغاز

خواتین کی مجلس کا اعلان ایک ہفتہ پہلے کیا جائے۔اور یہ بھی اعلان کیا جائے کہ معاشرتی ضرورت کی وجہ سے یہ ایسی عام مجلس منعقد کرنی ہے کہ ساری خواتین شریک مجلس ہوں۔ لیکن بعض اعذار مثلاً مرض، سفر یا گھریلوں ضرورت کی وجہ سے ساری خواتین ایک ہی مجلس میں شریک نہیں ہوسکتیں اس لیے اسی غرض سے وہ مجلس دوسرے ہفتے بھی ہوگی۔یہ مجلس دو ہفتے ہو، اور دو جگہ ہو مکان کا تعین بھی ہو۔

پہلی مجلس : اس مجلس میں ذیل کے امور کی رعایت ہو۔

ا : اصلاح معاشرہ کی خوب اہمیت کو سمجھائیں۔اصلاح نہ کرنے کے دینی ودنیوی نقصانات کو ان کی مثالوں سے سمجھائیں۔اور اصلاح کے دینی ودنیوی فوائد ان کی مثالوں سے سمجھائیں۔

ب : ان سے اصلاح کا عزم کرائیں، بل کہ عہد لیں۔اور یہ بتائیں کہ خواتین کا اصلاح میں بڑا کردار ہوتا ہے۔ایک خاتون پورے معاشرے کو بدل سکتی ہے۔اور پاک باز، دیندار عورت مادرزاد ولی کو جنم دے سکتی ہے۔

سیرت طیبہ واسلاف کے نمونہ سے سمجھائیں۔حضور ﷺ نے متعدد ونکاح (گیارہ) اسی اصلاح خواتین اور تبلیغ دین کے خاطر فرمائے تھے۔لکھا ہے کہ حضرت عائشہ رضی

رضی اللہ عنہا سے ایک ثلث شریعت ثابت ومنقول ہے حالاں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بہت کم عرصہ (تقریباً نو دس سال) پایا ہے۔ (نبراس ۲۹۳)۔

ج : کتنی خواتین جمع ہوئیں اس کا حساب طلب کیا جائے۔ ختم مجلس پر حساب لگا کر وہ آپ کو بذریعہ پرچہ مطلع کریں۔

د : آپ دو باتیں اخیر میں اہتمام سے کہیں۔ ایک یہ کہ ہر خاتون اصلاح معاشرہ کی دعا ضرور کرے۔ اور دوسری بات یہ کہ اصلاح کی فکر ہر خاتون اوڑھے۔ کوئی بھی ان دو کاموں سے غفلت نہ برتے۔ یہ دو کام اگر خواتین کرتی ہیں تو مجھے اور آپ کو یقین کرنا چاہیے کہ ان شاء اللہ کام ہوگیا۔ کیوں کہ ان دو کاموں کی قوت سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔

ھ : اسی مجلس میں اب دوسری مجلس کا اعلان کرنا ہے جو اگلی دو مجلسوں کے ۱۵ روز بعد ہوگی، وہاں تک صرف دعا اور فکر کرنا ہے۔

دوسری مجلس : کے امور ذیل میں مرقوم ہیں۔

ا : مختصر اصلاح معاشرہ کی فکر پر مشتمل خطاب ہو۔ اس خطاب کے لیے آپ خود پہلے دو رکعت پڑھیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں کہ کام تو اس سے بنتا ہے۔ اور خطاب کے مضامین کی بھی خوب تیاری فرمالیں، بڑے کام کے لیے بات بھی بڑی ہونی چاہیے۔ صرف دو چار واقعات سے کام نہ چلائیں۔ فکری خطاب ہو۔

ب : گذشتہ مجلس میں دعا اور فکر کرنے کو کہا تھا تو ہمت افزائی کے لیے خود خواتین سے تفقد کرائیں کہ کس نے دعا اور فکر کی تھی۔ اور تفقد (بذریعہ پرچہ) کے بعد دونوں کی ہمت افزائی کے لیے ۵/۱۰ منٹ اور فکری خطاب کریں۔

ج : اصلاح کے لیے ذمہ دار خواتین (تعداد خواتین کے تناسب سے) کا انتخاب کریں۔لیکن ایسی خواتین جو اپنے گھر سے اصلاح کا نمونہ پیش کرنے کا عزم کریں۔خواتین ان کا نام لکھ کر آپ کو پہنچا دیں آپ ان کے ناموں کا اعلان بھی کر دیں۔اور دعائیں بھی دیں۔

د : اصلاح کس چیز کی کرنی ہے؟ آپ ابھی ان کو یہ بتا دیں اس کی راہ نمائی اس کے بعد کی تیسری مجلس میں کی جائے گی۔

ھ : دعا پر مجلس کو برخواست کر دیں۔

(۱) پھر آپ مسجد میں آ کر ذمہ دار خواتین کے محرموں کو جمع کریں اور ان کو ان کے معاوین بننے کے لیے آمادہ کریں بل کہ اس کی تاکید کریں کہ وہ ان خواتین کی اس کوشش کو سراہیں اور ان کی ہمت افزائی کریں۔

پھر تمام نمازیوں کے سامنے مثلاً خطاب جمعہ میں اس اقدام کا تذکرہ کر کے اس پر تعاون کے لیے سب ہی کو آمادہ کریں۔

(۲) اب خواتین کی مشہور برائیوں کا جائزہ لیں۔اور آپ مردوں میں جو اصلاحی کام اس سے پہلے کر چکے ہیں لیکن خواتین کی وجہ سے مکمل اصلاح نہیں ہوسکی ہے ان کاموں کا بھی جائزہ لیں۔دونوں کا جائزہ لے کر اور نوٹ کر کے خواتین کی تیسری مجلس میں اس کا اعلان کریں، اس طرح اپنی صواب دید سے ایک ایک منکر کے قلع قمع کرنے پر اتحادی قوت کو بروئے کار لائیں۔اللہ تعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ ضرور کامیابی عطا فرمائیں گے۔

اس طرح پھر تیسری مجلس۔۔۔هَلُمَّ جَرًّا۔۔۔۔

(۳) اب جب بھی آپ کسی مجمع میں مراہق لڑکوں اور لڑکیوں کو خلاف شرع رہن

سہن پر دیکھیں مثلاً: لڑکی کا دوپٹہ سر پر نہ ہو، یا باریک ہو، غیر شرعی بال کٹے ہوئے ہوں، کھڑے ہو کر پانی پیتا ہو، قبلہ کی طرف تھوکتا ہو، اور مسجدوں میں غیر مناسب حرکت کرتا ہو وغیرہ وغیرہ۔

تو آپ ان کو مختلف مؤثر حکمتوں سے روکیں، بڑوں کے سامنے چھوٹوں کی اصلاح سے دو فائدے حاصل ہوں گے۔

ایک خود ان لڑکوں اور لڑکیوں کی اصلاح کا فائدہ۔

دوسرا ان کے والدین وغیرہ بڑوں کی اصلاح کا فائدہ۔

کیوں کہ جب آپ نے چھوٹوں کو نہیں بخشا تو بڑے لوگ یہ سوچیں گے کہ اگر ہم سے بھی خلاف دین وشریعت بات امام صاحب دیکھیں گے تو ہمیں بھی سب کے سامنے کہیں گے۔ لیکن بڑوں کو ہر وقت ہر کسی کو نہ ٹوکیں۔ بعض دفعہ ٹوکیں، بعض دفعہ درگذر کریں۔ بعض کو کہیں بعض کو ''ابھی'' نہ کہیں۔ حکمت سے کام لیں۔

چناں چہ مفسر قرآن حضرت **مفتی محمد شفیع** صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''اصلاح امت کا طریقہ'' کا عنوان قائم کر کے (جس طرح ہم نے سطور بالا میں ائمہ حضرات کے لیے بیان کیا ہے اسی طرح) امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اہمیت کو بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام کے قرون اولیٰ میں اور قرون مابعد میں جب تک اس پر عمل رہا۔ مسلمانوں کی پوری جماعت علم وعمل، اخلاق وکردار کے اعتبار سے پوری دنیا میں سربلند رہی۔۔۔ (معارف القرآن ۲/۱۸۷) لہٰذا اس طرح کام کی خوب ضرورت ہے۔

ضروری نوٹیں

نوٹ (۱) : اصلاحِ خواتین میں مردوں میں سے ان کے خاوندوں کو بھی ذریعہ

بنائیں۔ وہ اس طرح کہ وہ خواتین سے یہ کہیں کہ جب تک تم اصلاح میں ساتھ نہیں دیتی (اور یہ رسم نہیں چھوڑتی) ہم ناشتہ نہیں لیں گے۔

نوٹ (۲) جو بھی خواتین کی مجلس ہو، خطاب سے پہلے ان میں ۱۵ منٹ فضائل اعمال وصدقات حضرت شیخ زکریاؒ کی تعلیم کا بھی (دعوتی جدوجہد کی طرح) اہتمام ہو۔ احادیث کے نور سے اصلاح میں معاونت حاصل ہوگی۔

نیز اس تعلیم کے لیے ان نوجوان لڑکیوں کا انتخاب ہو جو اصلاح میں رکاوٹ بنتی ہیں اور فیشن پرست ہیں، کیوں کہ یہ تعلیم ان شاءاللہ ان کی اصلاح کا ذریعہ بنے گی۔ حضرت ابو محذورہؓ نے کلمات اذان صرف نقل اتارنے کے ارادے سے کہے لیکن ان کی ہدایت کا ذریعہ بن گیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرانی آیات سنیں اور ان کی ہدایت کا ذریعہ بن گئیں۔

نوٹ (۳) خواتین کے اس کام میں دعوت کے ان ساتھیوں کو ضرور ساتھ رکھیں جو خواتین کے ساتھ وقت لگا کر کام کر چکے ہیں۔ کیوں کہ خواتین میں کام فتنہ کا باعث بن سکتا ہے۔ اور دعوتی جدوجہد میں بڑے عمدہ اصول کے ساتھ کام ہوتا ہے جس سے فائدہ بھی ہوتا ہے اور فتنہ سے حفاظت بھی۔ اور ہمارا مقصود کام کرنا ہے۔ کسی چھوٹے کو ساتھ رکھنے سے ہماری وقعت مجروح ہونے کا خیال نہ آئے، بل کہ کام کا خیال ہو، لہٰذا ان کو ساتھ رکھ کر کام کریں۔

نوٹ (۴) خواتین میں خطابی ضرورت خود ائمہ ہی پوری کریں گے۔ ہاں اگر اہل تنظیم کی وہاں آمد ہوئی تو ہنگامی خطاب وہ کر سکتے ہیں۔ خواتین میں خطاب ان کی ہمت افزائی اور اعمال وعبادات اور دعا وفکر دلانے پر مشتمل ہو۔ کیوں کہ دعاؤں سے ہی کام بنے گا نہ کہ اپنی جدوجہد سے۔

✪ دینی فضا کا ایک اور کورس ✪ : نصابی درجات کے کچھ عرصہ بعد دینی فضا میں ترقی کے لیے ائمہ کو چاہیے کہ وہ ذہن سازی کے بعد مساجد میں دو درس جاری کریں۔ایک درس قرآن۔دوسرا درس حدیث۔کیوں کہ مسجد نبوی ﷺ میں بھی ایسی مجالس منعقد ہوتی تھیں یعنی یہ بھی آپ ﷺ کا انداز تربیت ہے۔

(۱) درس قرآن : شیخ الاسلام حضرت **مفتی تقی عثمانی** صاحب دامت برکاتہم کا ''آسان ترجمہ قرآن'' پڑھا جائے جونہایت ہی آسان اور جامع ہے۔ایک ایک آیت کا ترجمہ دھیرے دھیرے دو دو مرتبہ پڑھ کر سنایا جائے۔قرآن سے منسلک ہونے کے لیے بس اتنا کرلینا کافی ہے دوسری تفاسیر سے مضامین بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اس میں صرف معلومات جمع کرنے کی جہت رہ جاتی ہے اصلاح وعبرت حاصل نہیں ہوتی۔

(۲) درس حدیث : حضرت مولانا **محمد منظور نعمانی** رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ''معارف الحدیث'' کا۔لیکن وہ حصہ جو آداب معاشرت،حقوق واخلاق اور معاملات پر مشتمل ہو۔صرف پڑھ کر سنادیں لیکن صاف پڑھنا صاف ہو اور دھیرے سے ہو۔

طریقہ : ۱۵ منٹ کا درس ہو،جس نماز کے بعد نمازی وقت فارغ کرسکیں۔ایک ہفتہ درس قرآن،دوسرے ہفتے درس حدیث۔

جب اس کی بھی فضا بن جائے تو آپ کی صواب دید کے مطابق ذیل کی ترتیب بھی اختیار کریں۔

- قرآنی حلقے : صحت وتجوید کے حلقے۔
- مسائل کی تعلیم : پہلے نماز کے طہارت کے مسائل پھر موقع کے مثلاً قربانی،زکوٰۃ،

حج ، روزے اور معاملات کے۔ نماز کے لیے مولانا رفعت قاسمی صاحب کی کتاب ''مسائل امامت '' بھی۔

پانچ منٹ کا مدرسہ : روزانہ کا ایک درس۔ جو تاریخ وار ہے۔ اسے پڑھا جائے۔

اجتماعی ومعاشرتی امور میں اصلاحی فکر

ائمہ حضرات امور مذکورہ کی طرح اجتماعی ومعاشرتی ان امور میں بھی اصلاح کی فکر فرمائیں جن کا پورے معاشرے پر اثر پڑتا ہے، ان کی اصلاح سے پورے معاشرہ میں اصلاحی اثرات واقع ہوتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی بڑی جد وجہد کی ضرورت نہیں بل کہ تھوڑی سی توجہ اور فکر سے ان شاء اللہ معاشرہ دینی راستہ پر آجائے گا، آپ صرف حکمت سے لوگوں کو توجہ دلائیں لوگ آپ کی باتیں بخوشی قبول کرتے رہیں گے۔ جب لوگ بغیر محنت کے برائیوں کی طرف گئے ہیں تو یہ کیسے ناممکن ہوگا کہ محنت سے بھی اچھائیوں کی طرف نہ آئیں۔ اس لیے آپ دعا کے ساتھ محنت کرتے رہیں۔ وہ امور درج ذیل ہیں۔

(۱) نماز جمعہ وعیدین کی حاضری : بستی میں کوئی شخص ان دونوں سے باقی نہ رہ جائے کیوں کہ اجتماعیت سے اس کے دین وایمان کی حفاظت ہوگی ورنہ شیطان اس کے ایمان پر حملہ آور ہوگا۔ نیز یہ دونوں عبادتیں (گھر میں) انفرادی درست بھی نہیں۔

(۲) ماہ رمضان کے روزوں اور تراویح کی عام فضا قائم کرنا۔ کیوں کہ روزوں اور حج (اور نماز) کا ایک وقت متعین کر کے شریعت نے عبادت کے ماحول کو سازگار بنایا ہے۔

(۳) زکوۃ کی ادائیگی : تا کہ قوم میں مساوات پیدا ہو کر اجتماعیت کی شکل قائم ہو۔

(۴) حج کی ادائیگی : اس سے معاشرے پر اسلامی تہذیب کا مثبت اثر واقع ہوگا۔

(۵) نکاح وموت میں اسلامی ہدایات کی تعمیل : کیوں کہ یہ کام بھی اجتماعیت کی شکل میں ادا

کیے جاتے ہیں اوران میں ہرقوم مذہبی رسوم کا اہتمام کرتی ہے تو اہل اسلام تو بطریق اولیٰ پابند ہونے چاہیے کہ ان کو اسلامی طریقوں کے مطابق ادا کریں۔

(٦) شرعی لباس کی ترغیب : کیوں کہ وہ قوم وملت کا تعارف ہے۔

(٧) ذبیحہ اسلامی طریقہ پر ذبح کرنے کی ترغیب۔ چاہے عید کا ذبیحہ ہو یا عام دنوں میں مسلمانوں کے کھانے کے لیے ہو۔اس کا دو تین موقع پر تذکرہ کرکے اس سے واقف کرنا۔

(٨) بچوں کی ولادت پر ان کے اسلامی نام رکھنے کی طرف توجہ۔ کیوں کہ لوگ جہالت سے غیر اسلامی نام رکھ لیا کرتے ہیں۔

(٩) قطع تعلق کو ختم کرکے صلہ رحمی پیدا کرنا۔اس سے قوم میں اتحاد کی بنیادیں مضبوط ہوں گی۔

(١٠) والدین کی خدمت ان کے ساتھ حسن سلوک پر آمادہ کرنا کہ ہر اولاد ان کی رعایت کرے۔

(١١) اطراف میں غیر مسلم بستیوں میں ایک دو گھر مسلمان کے ہوں (جہاں نہ مسجد ہو نہ مدرسہ) وہاں کے مسلمان افراد کے انتقال پر نماز جنازہ کی اور ان کے بچوں کی دینی تعلیم اور بالغ مردوں اور عورتوں کی ادائیگئ نماز اور روزے وغیرہ کی فکر کرنا۔

خاتمۂ کتاب

● آپ قوم کے امام ہیں، امام وہ ہوتا ہے جو اپنے ماتحت افراد کو مجتمع رکھے اور ان کو اختلاف سے بچائے رکھے۔

● آپ قوم کے مقتدا ہیں، مقتدا وہ ہوتا ہے جو قوم کو (نمازوں میں) اپنی اقتدا سے (خارج نماز میں بھی) خدا اور رسول کی طاعت واتباع پر ڈالے۔ان کو ہر قسم کی نافرمانی وانحراف سے بچائے رکھے۔

● آپ معلّم ہیں، معلم کا کام یہ ہے کہ قوم کو جہالت کی تاریکیوں سے علم ومعرفت کی روشنیوں کی طرف لائے۔

● آپ مبلغ بھی ہیں، مبلغ کو چاہیے کہ مسلمانوں کے ایمان ویقین میں نکھار لائے۔

● آپ حاکم وقاضی اور حکیم ہیں، آپ کو چاہیے کہ قوم کے احوال پر نظر رکھیں، ان میں پیش آمدہ مسائل کا حکمت وفراست سے علاج کر کے مساوات کی فضا برقرار رکھیں۔ انہیں آپس میں ٹکرانے اور عداوت ونفرت سے بچائے رکھیں۔

● آپ عابد ہیں تو اپنی قوم کو اپنی شان عبدیت کا نمونہ پیش کر کے ان پر عبدیت کا رنگ چڑھائیں۔

● آپ تو مصلح ہیں، معاشرے کا صلاح وسدھار آپ کا خصوصی ذمہ ہے جسے فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

● آپ کو یاد ہونا چاہیے کہ آپ قوم کے حق میں ہادی ہیں، ہادی کا کام ہے کہ قوم کو ان کے (دینی ودنیوی) دونوں مفید کاموں سے آگاہ کریں۔ ان سارے امور کو زندہ کرنے کا نام منصب امامت ہے۔

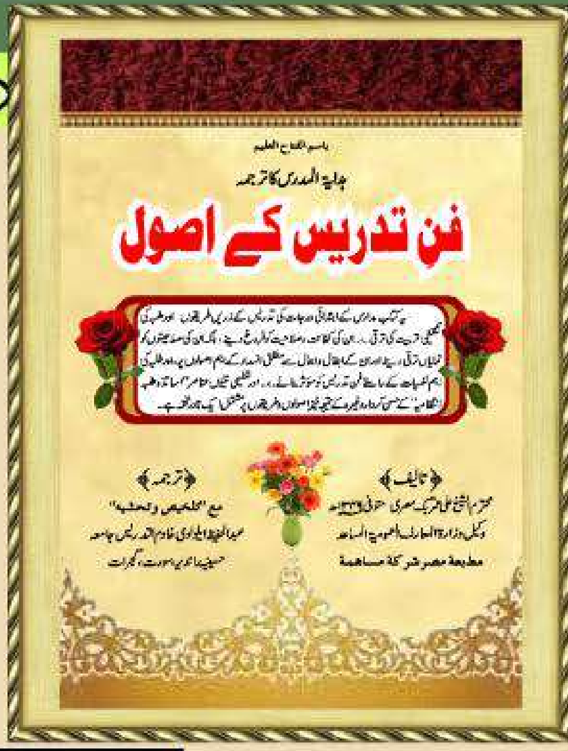
یہ وہ امور ہیں جنہیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں مسجد کی بنیاد ڈال کر اپنی ذات سے انجام دیا اور آپ کے بعد آپ کے خلفائے راشدین نے بھی ''منصب امامت سے'' انہیں انجام دیا۔

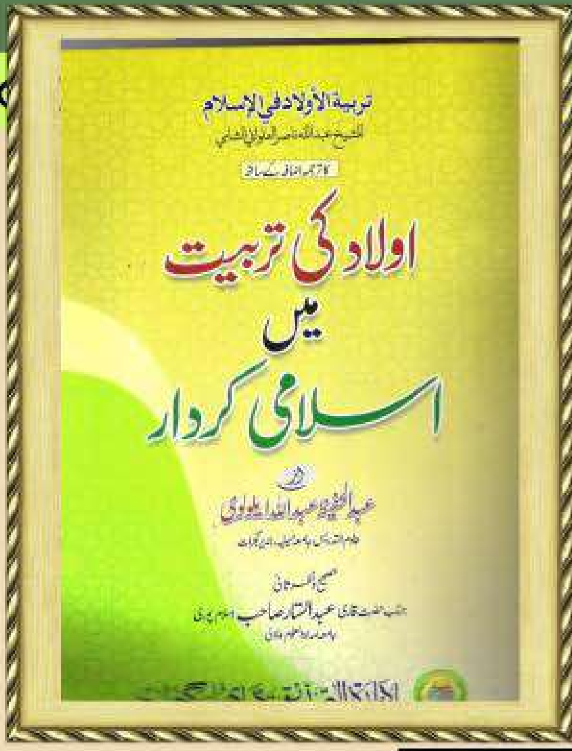
اکسیر نسخہ: ان امور کی انجام دہی کے لیے جامع العلوم کامل الصفات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو طریقہ اختیار فرمایا وہ ہے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مضبوط ربط وتعلق، آپ ان سے ایسا مضبوط تعلق قائم رکھتے کہ نہ یہودیت، عیسایت کو طمع کرنے کا موقع ملتا نہ مجوسیت ومنافقت وغیرہ کو، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے ہر وقت جلیس وہم نشین نظر آتے، آپ سے فراق ان کے لیے بار گراں ہوتا۔

لہٰذا آپ ائمہ حضرات بھی اپنے مقتدیوں سے مضبوط تعلق باندھ لیں، بالفرض اگر آپ کی امامت سے مذکورہ بالا امور میں سے کچھ حاصل نہ بھی ہوں تب بھی آج کفر والحاد اور طاغوتی طاقتوں سے بچائے رکھنا بھی اتنا بڑا فائدہ ہے کہ شاید وہ آپ کی کامیاب امامت کی دلیل ہو۔ لیکن یہ تعلق، اپنی ذات کے لیے نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ آسان فرمائیں۔ آمین

تمت بحمد اللہ تعالیٰ

مؤلف کی دیگر کتابیں





طلب کے ٹھکانے :

مکتبہ احمدیّہ راندیر، سورت	99746 04855
مکتبہ احمدیّہ ایلول، سابر کانٹھا	99742 72192
کتب خانہ رشیدیہ چھاپی ہایوے بناس کانٹھا	99041 11938
مفتی رمضانی صاحب، گودھرا، پنچ محل، گجرات	85112 86164
جمعیت علماء دریاپور، احمد آباد	079-22169200
مولانا حمزہ صاحب، دیوا، دارالعلوم، انکلیشور	94284 42151
مولانا شعیب صاحب ایلولوی بھاؤنگر	73833 13951
مدرسہ الیاسیہ منگرول پیر واشم (مہاراشٹر)	89755 14144
مولانا محبوب صاحب، ایلولوی، میگنگر (ایم، پی)	88190 56252
مولانا خالد سیف اللہ پالیہ مسجد (بنگلور ۲۱)	96119 38995

نَهجُ الأَئِمَّة
فِي
اِصلَاحِ الأُمَّة

(ائمہ کی صفات کے بیان میں)

حصہ سوم

ائمہ مساجد کے لیے : علمی | فکری | تربیتی | اصلاحی | بیش بہا تحفہ

از : عبدالحفیظ ایلولوی (گجرات)

ناشر : مکتبہ احمدیّہ
جامعہ حسینیہ راندیر
مورا بھاگل، راندیر، سورت، گجرات، انڈیا

باسم الفتاح العلیم ۔ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا

ائمہ مساجد کے لیے : علمی | فکری | تربیتی | اصلاحی | بیش بہا تحفہ

نَہجُ الْاَئِمَّۃ فِیْ اِصْلَاحِ الْاُمَّۃ

حصہ سوم

(ائمہ کی صفات کے بیان میں)

از : عبدالحفیظ ایلولوی (گجرات)

99746 04855

تفصیلات

نام کتاب : نَهْجُ الْاَئِمَّةِ فِيْ اِصْلَاحِ الْاُمَّةِ

جامع و مرتب : مولانا قاری عبدالحفیظ صاحب ایلولوی

(خادم الحدیث والفقہ جامعہ حسینیہ راندیر، سورت)

تصحیح : (۱) جناب حضرت مولانا خالد صاحب

(استاذ الحدیث جامعہ حسینیہ راندیر، سورت)

(۲) برادر جناب امداد اللہ صاحب احمد آبادی

کمپوزنگ : مولانا ضیاء الرحیم رحیمی (ہدایت آرٹ، سگرام پورہ، سورت)

صفحات : ۱۷۶

اول ایڈیشن : رجب المرجب ۱۴۳۹ھ بمطابق اپریل ۲۰۱۸ء

ناشر : مکتبہ احمدیہ،

جامعہ حسینیہ راندیر
مورا بھاگل، راندیر، سورت، گجرات، انڈیا۔

ایلول نزد نور مسجد، ہمت نگر، سابر کانٹھا، گجرات

75750 90455

مختصر فہرست (حصہ سوم)

پیش لفظ

فقیہ عصر جناب حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم

مسجدیں اللہ کا گھر ہیں، اس لیے اللہ کے بھیجے ہوئے دین شریعت سے متعلق تمام کاموں کا مرکز بھی یہی مسجدیں ہیں، نماز باجماعت اور اعتکاف تو ایسا عمل ہے جس کو مسجد ہی میں انجام دینا واجب ہے، لیکن مسجد کا کردار ان دو اعمال تک محدود نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں مسجدیں درسگاہ بھی تھیں، یہیں تذکیہ واحسان کی بزم بھی آراستہ کی جاتی تھیں، اسی میں مسلمانوں کے باہمی مقدمات فیصل کئے جاتے تھے، یہیں سے فتاویٰ صادر کئے جاتے تھے اور مسائل شرعیہ کی رہنمائی ہوتی تھی، یہیں مجاہدین اسلام کے لشکر مرتب کئے جاتے تھے، یہیں سے احکام سلطنت جاری کئے جاتے تھے، اور اسی جگہ بیرونی سفراء اور وفود سے ملاقاتیں ہوتی تھیں، غرض کے مسجد مسلمانوں کا ہمہ جہت مرکز تھی، اور مسجد کا امام زندگی کے تمام مسائل میں مسلمانوں کا قائد اور رہنما ہوتا تھا۔

افسوس کہ جیسے زندگی کے دوسرے شعبوں میں اضمحلال آ گیا اور مسلمانوں کا عمل قرن اول سے ہٹ گیا، اسی طرح لوگوں نے مسجد کو نماز واعتکاف تک محدود کر دیا، اور ائمہ صرف پانچ وقتہ نماز کے امام سمجھے جانے لگے، نہ لوگوں میں یہ جذبہ باقی رہا کہ وہ زندگی کے تمام مسائل میں امام کو اپنا قائد ورہنما سمجھیں اور نہ ائمہ میں اپنے درجہ ومرتبہ اور مقام کا احساس باقی رہا کہ وہ صرف نمازوں کے امام نہیں ہیں، بلکہ مسلم معاشرہ کی پوری زندگی کے امام ہیں، آج مسلمان جس

بے دینی، بے راہ روی اور معاملات اور سماجی زندگی میں شریعت سے غفلت کا شکار ہیں، اس کا علاج اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ وہ مسجد کو زندگی کے تمام مسائل میں مرکز ہدایت بنالیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بات کو بار بار کہنے اور لکھنے کی ضرورت ہے، مقام مسرت ہے کہ محبی فی اللہ جناب مولانا عبدالحفیظ ایلولوی صاحب نے اس مسئلہ کی ضرورت واہمیت کو محسوس کرتے ہوئے تفصیل سے قلم اٹھایا ہے، نیز قرآن وحدیث اور سلف صالحین کی تعلیمات سے استفادہ کرتے ہوئے اس موضوع پر ایک مفصل کتاب مرتب کی ہے، جس میں مساجد اور ائمہ مساجد کے مقام اور ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور ائمہ کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ معاشرہ میں مساجد کے کردار کو بحال کریں اور اپنی ذمہ داریوں کو پوری فعالیت اور بصیرت کے ساتھ انجام دیں، یہ ایک مفید کتاب ہے، مصنف نے مناسب سمجھا کہ تدریج پر عمل کرتے ہوئے اس کے تھوڑے تھوڑے حصے شائع کئے جائیں، اسی لیے ابھی اس کا پہلا حصہ جس میں مساجد کی اہمیت اور منصب امامت کے تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی ہے شائع کر رہے ہیں۔

یہ حقیر ابھی سفر میں ہے، اس نے مختلف مقامات سے مطالعہ کی سعادت حاصل کی، امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب کتاب ہوں گی، موصوف نے نظام مساجد کی اصلاح کا ایک نظام بھی مرتب کیا ہے، اگر واقعی وہ عمل کے سانچہ میں ڈھل جائے تو یہ ایک بڑا کام ہوگا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس کوشش کو قبول فرمائے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

خالد سیف اللہ رحمانی

نزیل : جامعۃ القرأت، کفلیۃ، گجرات

۷ شعبان ۱۴۳۸ھ

۳ مئی ۲۰۱۷ء

مولانا محمد اسرار الحق قاسمی (ایم پی)
Mohammad Asrarul Haque
Member of Parliament
(Lok Sabha)

सत्यमेव जयते

16, South Avenue, New Delhi-110011
Ph.: 011-23795046 Telefax: 011-23795314
E-mail: mahaqqasmi@gmail.com

Ref. No. ....

Date...... 21/10/2017

تأثرات

(مفکر ملت حضرت مولانا محمد اسرار الحق صاحب قاسمی دامت برکاتہم)

شریعت اسلام میں ائمہ کی اہمیت وبرتری اور فضیلت ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ ایک موقع پر اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ ''امام اس لیے بنائے گئے ہیں کہ ان کی اقتدا کی جائے''۔ اس کا ایک ظاہری مطلب یہ ہے کہ نماز کے دوران اماموں کی اقتدا کرنی چاہیے اور ان کے عمل کے مطابق عمل کیا جائے تاکہ ہماری نماز درست اور مکمل ہو سکے۔ لیکن ایک مطلب اس کا یہ بھی ہے کہ معاشرے میں امام کے منصب کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے اچھے اور اعلیٰ اخلاق وکردار کو اپنایا جائے اور اس سلسلے میں بھی انہیں اپنا راہنما بنایا جائے۔ نبی اکرم ﷺ پوری زندگی مسجد نبوی کے امام وخطیب رہے اور مسلمانوں کو دی جانے والی تمام تر تعلیمات مسجدوں کے ذریعے ہی پایۂ تکمیل کو پہنچی تھیں۔ چاہے معاشرتی مسائل ہوں یا اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے نکلنے کی تدبیریں، چاہے تعلیم وتعلم ہو یا دیگر امور سب امام یعنی نبی پاک ﷺ کے ذریعے ہی لوگوں تک پہنچتے تھے۔ اسی طرح لوگوں کو نماز کے اوقات کی خبر دینا اور انہیں دن کے پانچ وقت کامیابی اور خیر کی طرف بلانا بھی نہایت ہی شرف اور فضیلت والا عمل ہے اور نبی پاک ﷺ نے امام کے ساتھ ساتھ مؤذنین کے لیے بھی بڑے اجر وثواب کی بشارت دی ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے دریافت کیا کہ اللہ کے رسول! مجھے کوئی کام بتائیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا ''اپنی قوم کے امام بن جاؤ'' تو انھوں نے کہا ''اگر یہ ممکن نہ ہو تو؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا ''پھر مؤذن بن جاؤ''۔ (شرح العمدہ) اس حدیث پاک سے سیدھے طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی نگاہ میں امامت اور مؤذنی ایک اعلیٰ اور شرف والا عمل تھا اسی وجہ سے آپ ﷺ نے ایک صحابی کو اس کی تلقین فرمائی۔ ایک دوسری حدیث جسے امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے، اس میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا ''تین قسم کے لوگ قیامت کے دن مشک کے ڈھیر پر ہوں گے: ایک وہ جس نے اللہ کے اور اپنے غلاموں کے حقوق ادا کیے ہوں گے، دوسرا وہ شخص جس نے لوگوں کی امامت کی اور اس کے مقتدی اس سے خوش رہے اور تیسرا وہ شخص جس نے روزانہ پانچ وقت لوگوں کو نماز کی دعوت دی''۔ یعنی جو اذان دیا کرتا تھا، اس حدیثِ پاک سے تو اور بھی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ امامت اور مؤذنی اللہ کے نزدیک موقر عمل ہے اور دونوں قسم کے لوگوں کے لیے اللہ کی خاص رحمت ومہربانی مقدر ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ ''محشر کے دن مؤذنین کی گردنیں سب سے لمبی ہوں گی''۔ یعنی وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں نمایاں ہوں گے اور بآسانی پہچانے جاسکیں گے۔ ایک موقع پر فرمایا گیا کہ ''محشر کے دن مؤذنین کی گردنیں سب سے لمبی ہوں گی''۔ یعنی وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں نمایاں ہوں گے اور بآسانی پہچانے جاسکیں گے۔ ایک موقع پر فرمایا گیا کہ ''اگر لوگوں کو پہلی صف میں نماز پڑھنے اور اذان دینے کی فضیلت کا علم ہو جائے تو قرعہ اندازی کی نوبت آجائے گی''۔ اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے خاص طور پر امام اور مؤذن کے لیے رشد ومغفرت کی دعا فرمائی ہے۔ (سنن ابوداؤد)

ان فضائل کے ساتھ ساتھ امام ومؤذن کی اپنے مقتدیوں اور عام مسلمانوں کے تعلق سے مختلف ذمہ داریاں بھی ہیں جنہیں کما حقہ ادا کرنا ضروری ہے، تبھی وہ اس اجر وثواب کے حقدار ہو سکیں گے جن کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ محترم مولانا عبدالحفیظ ایلولوی نے ائمہ مساجد کی علمی، فکری، تربیتی موضوعات پر ائمہ کی رہنمائی کے لئے ایک قیمتی کتاب مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں بڑی جان فشانی کے ساتھ قرآن وحدیث اور اکابر امت کی تحریروں وافادات کی روشنی میں ائمہ کرام کی رہنمائی کے لئے نہایت قیمتی باتیں تحریر کی گئی ہیں۔ یہ کتاب ہر مسجد کے امام کے پاس ہونی چاہئے تاکہ وہ اس سے استفادہ کر کے اپنی مسجد میں مقتدیوں کی دینی وفکری رہنمائی میں اس سے مدد لے سکیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولیتِ تامہ دعامہ عطا فرمائے اور مرتب کے لئے دونوں جہاں کی سعادتوں کا ذریعہ بنائے۔ (آمین)

دعا گو

(حضرت مولانا) محمد اسرار الحق قاسمی
ممبر آف پارلیمنٹ وصدر آل انڈیا تعلیمی وملی فاؤنڈیشن

تقریظ

جامع الشریعت والطریقت

حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم العالیہ

(شیخ الحدیث وسابق صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نحمده ونصلي علی رسوله الکریم ۔

زیرِ نظر کتاب کے نام سے ظاہر ہے یہ ائمہ مساجد کی وساطت سے امت کی اصلاح کے لیے تالیف کی گئی ہے۔

کتاب کے مطالعہ کا موقع تو احقر کو نہیں مل سکا، لیکن کتاب کی ضخامت اور ابواب کی تقسیم پر سرسری نظر ڈالنے سے ترتیب وانداز قابلِ تعریف نظر آیا، کتاب کے اکثر مضامین حضرات اسلاف واکابر کی کتابوں سے ماخوذ ہیں، مضامین کے مآخذ وحوالہ جات اندر موجود ہیں، اس لیے امید کی جاسکتی ہے یہ کتاب اصلاحی کام انجام دینے والے حضرات کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی انشاء اللہ۔ دل سے دعا کرتا ہوں کہ: مؤلف نے اصلاحِ امت اور اصلاحِ معاشرہ کا جو بیڑا اٹھایا ہے، اور اس سلسلے میں ایک مستقل فکری تنظیم وجود میں لانے کا جو پروگرام طے کیا ہے ، اللہ تعالیٰ ان دونوں نیک مقاصد میں مؤلف کی بے حد مدد فرمائے، شرفِ قبولیت عطا فرمائے، اور اس لائن کی ساری رکاوٹیں دور فرمائے، اپنے خزانۂ غیب سے اسباب ووسائل مہیا فرمائے۔

اس پُر آشوب دور میں موصوف کی اس پیش کش پر انھیں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں، امید ہے کہ ائمہ مساجد اور دیگر اصلاحی تنظیموں میں اس امید آور اصلاحی کام کو سراہا جائے گا اور عملی جامہ پہنایا جائے گا۔

اُملاہ : العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۲۱ جمادی الثانیہ ۱۴۳۸ھ

تقریظ

حضرت اقدس مفتی اسماعیل صاحب کچھولوی دامت برکاتہم العالیہ

(صدر مفتی وشیخ الحدیث جامعہ حسینیہ راندیر)

محترمی ومکرمی مجی حضرت مولانا قاری عبدالحفیظ صاحب دامت برکاتہم بعد سلام مسنون آپ کا گرامی نامہ اور آپ کی تصنیف ''نہج الائمۃ فی اصلاح الامۃ'' موصول ہوئی۔ فللہ الحمد والمنّہ، آپ نے جس بے پناہ محنت ومشقت سے یہ مواد جمع کیا اور ترتیب دیا ہے اس پر بہت ہی مسرت کا اظہار کرتا ہوں۔

منصب امامت اور نظام مساجد کو خیر القرون کے نہج پر لانے کے لیے تالیف کردہ مسودہ ''نہج الائمہ فی اصلاح الامہ'' ایک گراں قدر جدوجہد ہے۔ ایسے نایاب موضوع پر مؤلف کی نگاہ کا اٹھنا یہ بھی بفضل خدا ہے۔

اگرچہ اس موضوع پر ''تحفۃ الائمہ'' بھی ہے جو نہایت ہی عمدۃ کتاب ہے لیکن منصب امامت ونظام مساجد کو مذکورہ بالا طریقہ پر لانے میں اور معروفات ومنکرات کے درجات سے اصلاح امت اور اصلاح معاشرہ میں یہ کتاب منفرد ہے۔ سو یہ کاوش نہایت ہی قابل تحسین ہے اور اس جانب اقدام قابل تعریف ہے۔

اپنے فرائض منصبی کی مصروفیات کی وجہ سے کتاب کو نہ دیکھ سکا تاہم جستہ جستہ مقامات پر نظر سے اندازہ ہوا کہ اصلاح امت اور اصلاح معاشرہ کے لیے امت سے حسن ظن رکھتے ہوئے اور خدائی مدد پر اعتماد کرتے ہوئے جو مضامین پیش کیے گئے ہیں نہایت ہی اہم ہیں جو ان شاء اللہ ضرور کارآمد ہوں گے۔

میں علماء حضرات سے اور بطور خاص ائمہ حضرات سے گذارش کرتا ہوں کہ اس کتاب کو اپنی اور اپنے ماتحت مقتدیوں کی اصلاح کے لیے ضرور پڑھیں، اور منصب امامت اور نظام مساجد کو خیر القرون کے نہج پر لانے کی کوشش ضرور کریں۔ ''مَالَا یُدرك كُلُّهٗ لَا یُترَكُ كُلُّهٗ'' کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

کتاب مذکور کی افادیت کے پیش نظر آپ نے ایک باعمل تنظیم کا بھی ارادہ کیا ہے، اس سے آپ کی فکری پرواز کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔'' اللہ کرے وہ وجود میں آکر ''سونے پر سہاگہ'' کا مصداق بنے، یہ بہت ہی عمدہ فکر ہے کیوں کہ اس میں کتاب و رجال کی دو قوتیں جمع ہوں گی۔ تاہم خاکسار اپنی مصروفیات کی وجہ سے آپ کی سرپرستی کی امید کو پوری نہیں کرسکتا، جس کا افسوس اور ندامت ہے۔ ہاں دعا ضرور کروں گا اور ارادہ رکھتا ہوں کہ دوسرے حضرات اس کو قبول کرکے تنظیم کو قوت بہم پہنچائیں۔ آمین

کتبہ العبد اسماعیل کچھولوی عفی عنہ

۱۶ جمادی الثانیہ ۱۴۳۸ھ

۱۷۔۳۔۱۶

تقریظ

جناب حضرت مولانا قاری عبدالستار صاحب اسلام پوری

(خادم القرآن والحدیث جامعہ امدادالعلوم وڈالی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔

نماز کی امامت کو امامت صغریٰ کہتے ہیں، جب کہ خلیفۃ المسلمین وحاکم وقت کی امامت کو امامت کبریٰ کہتے ہیں۔نماز کی امامت کی عظمت واہمیت کا اندازہ اس سے ہو رہا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ ہی حضر وسفر میں امام رہے۔اگر آپ غزوہ کے لیے تشریف لے بھی جاتے تو مسجد نبوی میں امامت کے لیے کسی صحابی کو متعین فرماتے، صاحب رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی نماز کی امامت کا منصب خلیفہ وحاکم کے علاوہ کسی کے حوالہ نہ ہوتا یہاں تک کہ موقعۂ جہاد پر لشکر کا امیر ہی ''امام'' ہوتا۔

غزوۂ ذات السلاسل کے موقع پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا نماز ''میں'' پڑھاؤں گا کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر مجھے بنایا ہے۔صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرض الوفات میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو نماز کی امامت کے لیے منتخب فرمایا (جسے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خلافت کی تعیین سمجھا) اس سے بھی منصبِ امامت کی اہمیت کا پتہ لگتا ہے۔

اور جب اس امامت صغریٰ کی نسبت صلوٰۃ سے ہے جو افضل الاعمال ہے تو شارع علیہ السلام نے اس فریضۂ نماز کی ادائیگی کے لیے اور نظم جماعت کی اہمیت کے لیے جس طرح

اسے ادا کرنے کا حکم فرمایا اسی طرح اسے امام کے پیچھے باجماعت ادا کرنے کا بھی تاکیدی حکم فرمایا حتیٰ کہ بلا عذر ترک جماعت پر وعید بیان فرمائی۔اس کے لیے امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک طرف محلوں میں بناء مساجد کی ترغیب دی تو دوسری طرف منصب امامت کا زیادہ حق دار کون ہے اسے بھی واضح فرمایا۔اور امام کو اپنی ذمہ داری کا احساس رہے اس لیے فرمایا'' اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ '' اور ساتھ ہی ان ائمہ کے لیے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا بھی فرمائی۔'' اَللّٰھُمَّ اَرْشِدِ الْاَئِمَّۃَ ''۔

خیر القرون میں ملک وملت کے جملہ امور مسجد ومحراب اور'' امامت '' سے جوڑے ہوئے تھے اور مسجد وامامت کا مفہوم بھی بہت وسیع تھا۔اِس وقت صورت حال یہ ہے کہ امامت کے مفہوم میں صرف نماز پڑھانا رہ گیا ہے،حتیٰ کہ خود امام بھی اپنے آپ کو ایک ملازم کی طرح سمجھ کر منصب امامت پر فائز رہتا ہے!! جو اس منصب کے ساتھ حد درجہ ظلم وحق تلفی ہے۔لہٰذا ائمہ مساجد کو چاہیے کہ اس منصب کی عظمت ومقام کو سمجھیں اور ایسی کتب کا مطالعہ کریں جن میں منصب امامت کی عظمت واہمیت پر اور مساجد وائمہ کے مقام اور ان کی ذمے داریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے بل کہ بڑی شخصیات کی جانب سے ان پر جو تقریظات وتاثرات قلمبند کیے ہیں انہیں بھی بغور پڑھیں۔

تو لیجیے ! اس موضوع پر ایک مفصل کتاب ''نہج الائمہ فی اصلاح الامہ '' حاضر ہے۔ضخامت کے پیش نظر مؤلف نے اس کے پانچ حصے کیے ہیں جن میں سے دو تو منظر عام پر آہی چکے ہیں اور اب یہ تیسرا حصہ بھی آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں ائمہ کی صفات اور ان کی خوبیوں اور کمالات پر مؤثر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

قابل صد مبارک باد ہیں!! اس کے مؤلف کہ انہوں نے فکر امت میں اپنی پیہم سعی

سے ائمہ کی پوری جماعت کو اس اہم گوشہ کی طرف متوجہ فرمایا، اور ان کی جانب سے اور دیگر علماء کی جانب سے اہم فریضہ ادا کیا۔ وہ ہمارے ہی ضلع ''صابر کانٹھا، گجرات'' کے موقر عالم جامعہ حسینیہ راندیر کے استاذ حدیث عزیزم مولانا عبدالحفیظ صاحب زید مجدہ ہیں۔

موصوف نے نظام مساجد اور منصب امامت کے مضامین کو جمع کرنے کے لیے کس قدر جدوجہد کی ہے!! اس کا اندازہ مراجع ومصادر کی اس طویل فہرست سے ہوتا ہے جو حصہ اول کے ص ۱۱۸ پر موجود ہے۔ درسیات کی گراں قدر مصروفیات کے ساتھ اس قدر اہم موضوع پر قلم اٹھانا ملہم وھادی اللہ تعالیٰ کا انعام واحسان ہی ہے کہ عالم اسباب میں ان مضامین کو سہل فرمایا۔

دوران تالیف بارہا فون سے نیز ملاقات پر اس کا مذاکرہ کرتے رہے اور رائے ومشورہ لیتے رہے۔ مولانا کی فکر وکاوش صرف مضامین کو جمع کر کے کتابی شکل میں پیش کردینا نہیں ہے، بل کہ دوبارہ نظام مساجد اور منصب امامت کو خیر القرون کے نہج پر لانا ہے!!! اور اسے بروئے کار لانے کے لیے باقاعدہ ایک تنظیم قائم کرنے کا ارادہ کر کے اس کے لیے ذی علم حضرات سے ملاقاتیں بھی کر رہے ہیں اور ان سے صلاح ومشورہ اور تائید حاصل کر رہے ہیں باسط وغنی ''اللہ تعالیٰ'' مؤلف کی اس کتاب کو شرف قبولیت عطا فرماوے اور نیک عزائم میں ان کی نصرت فرماوے اور اس کی اشاعت میں ہاتھ بٹانے والوں اور شائع کرنے والوں کو اپنی نعمتوں سے خوب مالا مال فرماوے۔ آمین

احقر : عبدالستار اسلام پوری

خادم القرآن والحدیث جامعہ امداد العلوم وڈالی

۱۴ ربیع الاول ۱۴۳۹ھ

ائمہ حضرات کی صفات، ان سے وابستہ امور

آج پورا عالم جس کشمکش سے دوچار ہے اس کی واحد وجہ اللہ تعالیٰ کی وہ ناراضگی ہے جو مسلمانوں کی اپنے مذہب سے غفلت بل کہ اس سے بیزاری وانحراف کا نتیجہ ہے۔ ماضی میں بھی جب جب اسلام اور اہل اسلام کی ناکامی ہوئی اس کا سبب بھی یہی رہا۔لیکن یہ بھی یاد رہے کہ جب بھی اسلام کی ناکامی ہوئی وہ اسلام کی ناکامی نہیں تھی، وہ صورتِ اسلام کی ناکامی تھی، اسلام کبھی بھی ناکام نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ جب جب بھی مسلمانوں میں اسلام کی حقیقت ظاہر ہوئی ہے لوگوں کے تجربات ان کے اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں اور اسلام کو فتح وکامرانی حاصل ہوئی ہے۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی حقیقت نے بھی بڑی سے بڑی صورت پر فتح پائی ہے۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''اسلام کے ساتھ فتح وکامرانی کا لازوال تعلق ہے۔ اس راہ کی قربانیاں اور کوششیں اسلام کی وہ زکات ہیں جس کو'' صاحب نصاب'' مسلمان ہمیشہ خوشی سے ادا کرتے رہے۔ یہ زکات میدان جہاد سے تصنیف وتالیف کے حجروں، وعظ وخطاب کے منبروں اور انفرادی وشخصی کوششوں تک ہر میدان میں دی گئی'' (ہماری ملی ذمہ داریاں)۔لیکن آج جس زکات کی ادائیگی کی ضرورت ہے وہ مذہبی اور قرآنی اصطلاحات کو مسلمانوں میں حقیقت کے ساتھ پیدا کرنے کی اور قرآنی نقوش کو نفوس میں ڈھالنے کی ہے کہ یہی اسلام کی حفاظت اور اسلام کی حمایت ہے۔

مثلاً علم صحیح وعمل مستقیم۔۔۔ خشیت وتقویٰ۔۔۔ یقین وتوکل ۔۔۔اصلاح ومعرفت۔۔۔ صداقت وامانت ۔۔۔حق وعدل ۔۔۔عفو وایثار ۔۔۔صبر وشکر۔۔۔زہد وقناعت۔۔۔تواضع وانکساری۔۔۔عبدیت وطاعت۔۔۔تعلیم ودعوت۔۔۔اور فکر وغم وغیرہ۔

● اولاً بطور خاص ائمہ حضرات ان کی حقیقتوں کو اپنے اندر پیدا کریں۔

● ثانیاً (اپنا عملی نمونہ پیش کر کے) تمام مسلمانوں میں پیدا کریں۔

ہم نے قرآن وحدیث کی روشنی میں مذکور الصدر صفات اور ان کے علاوہ دیگر چند ایسی صفات جمع کر کے حضرات ائمہ کی راہ نمائی کی کوشش کی ہے، جن میں سے بعض کا اطلاق قرآن وحدیث میں مطلقاً (لفظ) ائمہ پر کیا گیا ہے۔ تاہم ان کو ہم نے مجازاً ائمہ نماز کے لیے پیش کیا ہے۔

کیوں کہ بتقاضۂ شرع جب یہ صفات عام مسلمانوں میں ہونا ضروری ہے تو قوم کے امام وہادی میں ہونا تو بطریق اولیٰ ضروری ہوگا۔ دیکھیے ذیل میں حضرت سائب رضی اللہ عنہ کی روایت۔ امید ہے کہ ائمہ حضرات اس کا "بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَیْنَا" کہہ کر خوشی سے استقبال کریں گے اور پوری طرح ان سے متصف ہونے کی بھر پور کوشش بھی کریں گے بل کہ دعا بھی، اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بنائی امت کو بنانے میں پوری طرح ہاتھ بٹائیں گے۔

حضرت سائب بن خلاد رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی قوم کا امام مقرر فرمایا، اس شخص کو کسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبلہ کی طرف تھوکتے ہوئے دیکھ لیا تو اس کو امامت سے معزول کر دیا اور فرمایا کہ اس نے اس طرح (خلاف شریعت) تھوکنے سے اللہ تعالیٰ کو اور اس کے رسول کو تکلیف پہنچائی ہے (مشکوۃ ۱۷)۔ غور فرمائیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک چھوٹے سے عمل کی وجہ سے اس کو لائق امامت نہیں سمجھا۔ تو بڑے اعمال اور بڑی صفات کا کیا حال ہوگا خود ہی سمجھ لیجئے۔ اس سے ہم ائمہ حضرات کو سمجھ لینا چاہیے کہ ایک امام کو کیسا ہونا چاہیے۔ مراجع کا بیان حصہ اول میں ہے۔

(۱) کسی قوم کا مقتداء وامام بننے کی دو صفات

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے " وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ " (سجدہ ۲۴)۔اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں سے کچھ لوگوں کو امام وپیشوا بنادیا جو (اپنے پیغمبروں کے نائب ہوکر) ہمارے حکم سے ہدایت کیا کرتے تھے جب کہ وہ صبر کیے رہے اور ہماری آیتوں پر یقین رکھنے والے تھے۔

مفسر قرآن حضرت **مفتی محمد شفیع صاحب** رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس آیت شریفہ میں علمائے بنی اسرائیل میں سے بعض کو امامت وپیشوائی کا درجہ عطا کرنے کے دو سبب (دو شرط) ذکر فرمائے ہیں۔اول صبر کرنا دوم آیات الٰہیہ پر یقین لانا۔

- پہلا سبب صبر ہے، جو تمام اعمال میں سب سے بڑا عملی کمال ہے۔
- دوسرا سبب آیات الٰہیہ پر یقین رکھنا ہے، جو تمام علوم میں سب سے بڑا علمی کمال ہے۔

گویا اس آیت میں دو کمالوں کا ذکر ہے ایک عملی کمال جو صبر ہے اور دوسرا علمی کمال جو یقین ہے۔خلاصہ یہ کہ امامت کے لائق اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہ لوگ ہیں جو عمل میں بھی کامل ہوں یعنی صبر وتحمل والے ہوں اور علم میں بھی کامل ہوں یعنی محکم یقین والے ہوں۔

خلاصۂ تفسیر میں لکھا ہے کہ اس آیت شریفہ میں مؤمنین کو تسلی ہے کہ اگر تم لوگ بھی یقین حاصل کرنے کے ساتھ صبر کرتے رہو گے تو ہم تم کو بھی ائمۂ دین بنادیں گے (معارف القرآن ۷/۴۷)۔

حضرت مفتی صاحب نے مذکورہ بالا تفصیل پیش کی ہے جس پر یہ عنوان قائم کیا ہے'' کس قوم کا مقتداء وامام بننے کے لیے دو شرطیں''ہم نے ان کو محل صفات میں بیان کیا ہے۔

مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ یہ دو صفات صبر ویقین ان ۳۰ صفات کا خلاصہ اور مجموعہ ہے جو سورۃ برأت ،مؤمنون واحزاب میں دس دس بیان ہوئی ہیں جو کامل مومن کی

صفات ہیں۔ بل کہ جن کلمات کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش ہوئی "وَاِذِ ابْتَلٰى اِبْرَاهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمَاتٍ" ان کلمات سے یہی ۳۰ صفات مراد ہیں، اوران ہی صفات کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بارگاہ الٰہی سے امامت وپیشوائی کا انعام "قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" ملا [۱] (معارف القرآن ۲۵۸/۲)۔ توجہ فرمائیں جو دوصفات "صبر ویقین" ان ۳۰ صفات کی جامع ہوں وہ کس قدر عظیم ہوں گی!!! گویا ان دوصفات کو حاصل کرلینا ۳۰ صفات کو حاصل کرلینا ہے۔!!

مفسّرِ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ "وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً۔۔۔ کی تفسیر میں بعض علماء کا قول نقل کیا ہے کہ صبر ویقین ہی کے ذریعہ کسی کو دین میں امامت کا درجہ مل سکتا ہے۔ "بِالصبرِ وَالیَقِیْنِ تُنَالُ الامامۃُ فِی الدِیْنِ۔۔۔ (تفسیر ابن کثیر ۱۰۴۹)۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ باب امامت کی حدیث "الامام ضامن الخ" کے بارے میں فیصلہ یہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ اپنوں میں سے افضل ترین اور دیندار کو امام بنائیں، اور افضل ترین وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کا علم ویقین رکھتے ہوں اوراس کی خشیت سے ان کا سینہ معمور ہو۔ "ومِنَ الحقِ الواجبِ علی المسلمینَ ان یُقدِّمُوا اَخیارَھم واھلَ الدینِ، والاَفضلُ مِنهم اهلُ العلمِ باللهِ تعالیٰ الذینَ یَخافُونَ اللهَ" (کتاب الصلوٰۃ ومایلزمھا از اسلام کا نظام مساجد ۱۱۲)۔

---

[۱] اگرچہ یہاں امامت سے نمازوں کی امامت مرادنہیں ہے جیسا ہم نے مقدمہ میں لکھا ہے بل کہ اس سے عام اور بڑی امامت وپیشوائی مراد ہے۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ اور دیگر نبیوں کی امامت وپیشوائی۔۔۔ اور ائمہ اربعہؒ۔۔۔ اور امام ابومنصورؒ اور ابوالحسنؒ ماتریدی واشعری کی پیشوائی۔ لیکن پھر بھی یہ صفات نمازوں میں امامت کرنے والے ائمہ میں بھی مطلوب ہیں۔ سوچیے کیا ان دوصفات کی جامعیت وکمالیت کا کوئی اندازہ کرسکتا ہے۔

حدیث شریف میں آں حضرت ﷺ نے سب سے زیادہ ضعف یقین کے خطرے سے آگاہ فرمایا ہے آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''اِنَّ اَخۡوَفَ اَخَافُ عَلٰی اُمَّتِیۡ ضُعۡفُ الۡیَقِیۡنِ'' کہ مجھے سب سے زیادہ اپنی امت پر جس کا خوف ہے وہ ضعف یقین ہے[۱] اور دوسری حدیث میں ہے'' مَنِ التَّکٰی بِغَیۡرِ اللّٰہِ فَقَدۡ ھَلَکَ '' (مفتاح العارفین ۴۹،۱۷) کہ جو غیر اللہ پر توکل کرے گا وہ ہلاک ہوجائے گا۔ مطلوبہ دوصفات کا اصل بیان یہاں ختم ہوا آگے عبرت کے لیے ان دوصفات پر مبنی واقعات کا ذکر ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بے پناہ صبر وتحمل

کسی بدنصیب نے غیض وغضب اور شدت بغض وعداوت میں آکر حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کو طمانچہ مار دیا، تو حضرت امام اعظمؒ نے حد درجہ تلطف وانکسار سے فرمایا:

(۱) بھائی میں بھی طمانچہ مار سکتا ہوں لیکن نہیں مارتا،

(۲) میں خلیفہ سے تمہاری شکایت کرسکتا ہوں لیکن نہیں کرتا،

(۳) سحر گاہی کے وقت تیرے ظلم کے خلاف خدا کے آگے فریاد کرسکتا ہوں نہیں کرتا،

(۴) اور قیامت کے روز تمہارے ساتھ خصومت اور مقدمہ کرکے انصاف طلب کرسکتا ہوں مگر یہ بھی نہیں کرتا۔

(۵) بل کہ اگر مجھے قیامت کے روز دستگاری حاصل ہوئی اور میری سفارش قبول ہوئی تو میں تیرے بغیر جنت میں قدم بھی نہ رکھوں گا (از حدائق الحنفیہ ،امام اعظم کے حیرت انگیز واقعات ۱۲۹)۔

---

[۱] حدیث کے الفاظ یہی نقل کئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اخوف کے بعد ما سہو کاتب سے رہ گیا ہو۔

امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے صبر وتحمل، بردباری اور فکر آخرت کا عالم یہ تھا کہ ایک موقع پر کسی خارجی نے امام صاحب کو برا بھلا کہا، غلیظ گالیاں دیں اور مبتدع اور زندیق تک کہا تو حضرتؒ نے جواب میں ارشاد فرمایا ”غَفَرَاللہُ لَکَ ھُوَ یَعلمُ مِنْ خِلَافِ ماتَقُوْلُ“۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں تو جو کچھ کہہ رہا ہے خدا تعالیٰ جانتے ہیں کہ وہ مجھ میں نہیں ہے۔ اس کے بعد امام اعظمؒ پر گریہ طاری ہوا اور فرمانے لگے، مجھے اللہ تعالیٰ کا عذاب رلاتا ہے۔ عذاب کے تصور سے گریہ بڑھ گیا اور روتے روتے غش کھا کر گر گئے جب افاقہ ہوا تو فرمانے لگے۔ بارالہا جس نے بھی مجھ پر ایسی بات کہی جو مجھ میں نہیں تھی اس کو معاف فرما (مناقب موفق ۲۴۹)۔ یہ تھی ہمارے اسلاف کی صفت۔

ہمیں اور مقتدیوں کو اپنے یقینوں اور صبر وتحمل کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ ہمارا یقین اور صبر وتحمل قرآن وحدیث کے تقاضوں سے کس قدر قریب ہے۔ مثلاً حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(۱) صدقہ دینا مال میں کمی نہیں کرتا،

(۲) جو شخص کسی کی خطا معاف کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت میں اضافہ کرتا ہے،

(۳) جو شخص محض خدا کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ بلند کرتا ہے (مشکوٰۃ ۱۶۷)۔

اس حدیث شریف میں گویا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین صفات پر تین ضمانتیں ارشاد فرمائی ہیں۔

(۱) صدقہ سے مال گھٹتا نہیں۔ حالاں کہ لوگ عام طور پر یہی سمجھتے ہیں کہ مال گھٹتا ہے۔

(۲) کسی مجرم کو معاف کرنے سے معاف کرنے والے کی عزت بڑھتی ہے۔ حالاں کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ عزت گھٹ جائے گی۔

(۳) عاجزی وتواضع سے اللہ تعالیٰ متواضع آدمی کو بلندی عطا کرتے ہیں۔ حالاں کہ بظاہر اس نے اپنے درجے کو نیچے گرایا ہے۔ ظاہر ہے یہ امور وہی انجام دے سکتا ہے جس کے اندر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کا پختہ یقین ہو۔

☜ **تَنَبُّہ:** صدقہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کوئی انسان اپنے مال سے قرب الٰہی کے حصول کے لیے نکال کر کسی کو دے۔ خواہ یہ صدقہ فرض ہو یا واجب یا نفل۔ اس کو صدقہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ صدقہ، دینے والے کے صدقِ ایمان پر دلالت کرتا ہے اور جنت کی نعمتوں کی سچی رغبت پر دلالت کرتا ہے (مرقات ۱۹۹/۴ باب فضل الصدقۃ)۔

عبدالرزاق بن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے امام اعظمؒ سے بڑھ کر کسی کو حلیم الطبع اور بردبار نہیں دیکھا۔ ہوا یہ کہ ایک مرتبہ امام صاحب مسجد خیف میں تشریف فرما تھے، تلامذہ اور معتقدین کا حلقہ قائم تھا اتفاق سے میں بھی اس محفل میں موجود تھا کہ بصرہ سے آئے ہوئے کسی صاحب نے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ امام صاحبؒ نے اس کا ان کو مفصل جواب دیا۔ سائل نے کہا اس مسئلہ میں امام حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ نے یوں کہا ہے اور ان کی یہ رائے ہے، امام صاحبؒ نے فرمایا اخطا الحسن امام حسن سے غلطی ہوئی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کا یہ کہنا تھا کہ اسی حلقہ سے ایک شخص کھڑا ہوا جس نے منہ کو ڈھانک رکھا تھا امام صاحب کو مخاطب ہو کر کہنے لگا ''یَاابْنَ الزَّانِیَۃِ'' اے بدکار عورت کے بچے آپ یہ کہتے ہیں کہ حسن نے غلطی کی ہے؟ لوگوں نے اس کی یہ شنیع حرکت دیکھی تو مشتعل ہوئے بہت سوں کے خون کھولنے لگے اور بہت سوں نے آستینیں چڑھالیں (عقود الجمان فی مناقب النعمان ۲۸۷)۔ واقعہ طویل ہے امام صاحب نے نہ صرف اس کو معاف کیا بل کہ دعائیں بھی دیں۔ ان واقعات سے امام صاحب رحمہ

اللہ تعالیٰ کے صبر وتحمل کا اندازہ ہوا کہ کس قدر اللہ تعالیٰ نے ان کو صبر وتحمل عطا فرمایا تھا۔

اگر ائمہ حضرات اپنے منصب امامت وقیادت سے دنیا وآخرت میں بلند مرتبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام کی پیروی کرتے ہوئے صبر سے کام لینا چاہیے۔ مقتدیوں کے دل خراش کاموں اور باتوں سے بھڑکنا نہیں چاہیے بل کہ ان پر اجر وثواب اور بلندی مرتبہ کی نیت سے صبر کرنا چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن حکیم رحمہ اللہ تعالی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالی کے نزدیک کوئی بردباری امام کی بردباری اور نرمی سے زیادہ محبوب نہیں اور اللہ تعالی کے نزدیک کوئی جہالت امام کی جہالت سے مبغوض نہیں "اَنَّهٗ لَا حِلْمَ اَحَبُّ إِلَى اللهِ مِنْ حِلْمِ اِمَامٍ وَرِفْقِهٖ وَلَا جَهْلَ اَبْغَضُ إِلَى اللهِ مِنْ جَهْلِ اِمَامٍ وَخُرْقِهٖ" (کتاب الزہد للامام احمدؒ ۲/۶۰۲)۔ کتابوں میں ہے کہ ہر عمل کا بدلہ محدود ہے لیکن صبر کا بدلہ غیر محدود ہے اور صبر سے ہر بند دروازہ کھل جاتا ہے اور ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے (تعلیق الصبیح ۱/۷۳)۔

آپ پڑھے ہوئے اس صبر کو یوں اختیار کریں کہ مثلا آپ کو کسی نے گالی دی یا کوئی جانی مالی آپ کو نقصان پہونچایا یا آپ کی عزت کرنے والوں کے درمیان آپ کی بے عزتی کی تو آپ قصداً صبر کریں اور کوئی بھی انتقامی کاروائی اختیار نہ کریں باوجودیکہ آپ انتقام لینے پر قادر ہوں۔ بل کہ آپ اسے دعا دیں کہ اللہ تعالی آپ کو ہدایت دے۔ یہ دعائیہ جملہ آخرت کا سرمایہ اور ذریعۂ ہدایت بن جائے گا اور جو اس نے آپ کی بے عزتی کی تھی یا گالی دی تھی نہ وہ بے عزتی باقی رہے گی نہ تو اس گالی کا آپ کو کوئی نقصان پہونچے گا۔

اور اگر آپ نے اس کو جواباً گالی دیدی یا اس کی بھی بے عزتی کی تو اس برائی کا گناہ جس طرح اس کو ہوگا اس طرح آپ کو بھی ہوگا۔ کیوں کہ شرعاً آپ کو صبر کا حکم تھا نہ کہ گالی دینے کا

لہٰذا اس حکم کے توڑنے کا گناہ آپ پر ہوگا۔ بل کہ اس کو دین سے دور کرنے کا جو گناہ ہوگا وہ مزید براں۔ کیا آپ نے ان دونوں طرز اور ان کے نتائج پر غور کیا؟ کیا غور کے بعد یہ جذبہ پیدا ہوا کہ ہمیں بھی صبر وتحمل سے کام لینا چاہیے تو اب ائمہ حضرات کو اپنی کسی کوتاہی پر متولی صاحب یا ممبران یا کوئی عالم صاحب یا کوئی مقتدی اصلاحی بات کہے تو بھڑکنا نہیں چاہیے بل کہ اسے اپنا اصلاحی سامان سمجھ کر قبول کرنا چاہیے۔

آدمی کو دوسروں سے اپنی بات منوانے کی قدرت نہیں ہوتی مگر خود کو تو دوسرے کی بات مان لینے کی اور اگر نہ مانے تو کم از کم نزاع سے بچنے کے لیے خاموشی اختیار کر لینے کی قدرت تو ہوتی ہے۔ آدمی خلاف طبع امور کو نظر انداز کر لینے کا فن سیکھ لے ایسا کہ اپنی رائے پر اتنا جماؤ اور اصرار نہ ہو کہ اس کو اگر قبول نہ کیا جائے تو لڑ پڑے اسی صفت کا دوسرا نام صبر ہے۔

تواضع اور عبدیت ایسی چیز ہے جس کا کوئی توڑ اور جواب ہی نہیں۔ مثلاً آپ سے کسی کے جان ومال کا کوئی نقصان ہو جائے تو اب دو حالتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ خود اس پر برسنے لگیں اس سے لڑ پڑیں۔ دوسری یہ کہ آپ عاجزی کرنے لگیں ارے بھائی مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف فرما دیجئے۔ اس نرمی کا کوئی توڑ ہی نہیں اس نرمی سے آدمی کو بڑی بڑی مصیبتوں سے نجات حاصل ہوتی ہے۔

اکبر مرحوم نے کیا خوب کہا ہے! شعر

قدرت کو ناپسند تھی سختی زبان میں	پیدا نہ کی اسی لیے ہڈی زبان میں

یعنی زبان میں اسی لیے ہڈی نہیں تا کہ آدمی نرم بات کہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آدمی تواضع اور بندگی سے لوگوں کے دل جیت لیتا ہے۔

تواضع کی حقیقت

حضرت حکیم الامت مجدد الملت علامہ تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تواضع یہ ہے کہ اپنے کو لاشئ سمجھے، اپنے کو رفعت (عزت وبلندی) کا اہل نہ سمجھے اور سچ مچ اپنے کو مٹانے کا قصد کرے۔

تواضع یہ ہے کہ اگر کوئی تم کو خاکسار سمجھ کر برا بھلا کہے اور حقیر وذلیل کرے تو تم میں انتقام کا جوش پیدا نہ ہو اور نفس کو یوں سمجھا لو کہ تو واقعی ایسا ہے پھر تو کیوں برا مانتا ہے۔ محققین کا قول ہے کہ تم یہ سمجھ کر تواضع اختیار کرو کہ حق تعالیٰ کی عظمت کا حق یہی ہے کہ ان کے سامنے ہر شخص پستی اور تواضع کو اپنی صفت بنائے اور اپنے کو لاشئ محض سمجھے اس پر حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ (العلم والعلماء ۱۷۷)۔

صحابہ رضی اللہ عنہم والا یقین

آپ نے آیت شریفہ سے ثابت شدہ صبر کو ملاحظہ فرمایا اب یقین کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا، اس کی قدرتوں وآیتوں کا اور غیب وتقدیر کا یقین اور ان پر توکل واعتماد، ایمان کے بڑے ثمرات ونتائج میں سے ہیں اور مومن کی عظیم وعمدہ صفات میں سے ہیں۔ انسان اکیلا اپنے ہاتھوں حالات وحوادثات سے ٹکرا نہیں سکتا کیوں کہ وہ فطری طور پر نہایت کمزور ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے رب پر اعتماد وتوکل کرلے اور اپنے معاملات اس کے سپرد کرلے تو پھر وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ کیوں کہ اس پر بھروسہ کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت ومدد کا مستحق بن جاتا ہے۔

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جب نمرودی خاکستر کرنے والی آگ میں ڈالا گیا اور فرشتے مدد کو پہنچے تو فرمایا اللہ مجھے کافی ہے۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کفار کے لشکروں سے جب ڈرایا گیا تو فرمایا اللہ ہمیں کافی ہے۔ ''حَسْبُنَا اللہُ'' تو اللہ تعالیٰ نے

حضرت ابراہیمؑ کی مدد کی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی مدد کی۔

موت وآخرت کا یقین

آیت مذکورہ میں آیتوں پر یقین کا ذکر ہے آیئے ہم صحابہؓ کے یقینوں کو روایتوں کی روشنی میں معلوم کرتے ہیں کہ ان کا ایمان ویقین کیسا تھا اور کتنا پختہ تھا تا کہ ہم بھی ان کے ایمان ویقین کی طرح اپنا یقین بنانے کی کوشش کریں۔ کیوں کہ آدمی اتنے ہی دین پر چلتا ہے جتنا اس میں ایمان ویقین ہوتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''تقویۃ ایمان'' کے تحت ایسی احادیث پیش کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی تقویت ایمان کی فکر فرمایا کرتے تھے۔ [1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ابن عساکر رحمہ اللہ تعالیٰ کی طویل تخریج کردہ روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارث بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ صبح کس حال میں کی؟ تو فرمایا '' عَزَفَتْ عَنِ الدُّنیاَ واَظْمأْتُ نَہارِی واَسْہَرْتُ لَیْلِیْ وکَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلی عَرْشِ رَبِّیْ، وَکَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلی اہلِ الْجَنَّۃِ فِیْہَا یَتَزَاوَرُوْنَ وَاِلی اَہْلِ النَّارِ یَتَعاوَوْن۔۔۔'' (حیاۃ الصحابہ عربی ۲/۲۲)۔ اس حال میں کہ میں دنیا سے منقطع ہو چکا ہوں، دن بھر روزے سے رہتا ہوں، رات بھر عبادت کرتا ہوں، اور گویا اپنے رب کے عرش کو دیکھ رہا ہوں، اور گویا اہل جنت کو آنکھوں سے اس طرح دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک دوسرے سے (خوشی سے) مل رہے ہیں اور جہنمی لوگوں کو اس طرح دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک دوسرے کو (مدد کے لیے) پکار رہے ہیں (یا ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑے ہیں)۔

---

[1] تقویت ایمان کے اسباب حصہ چہارم میں مذکور ہیں۔

اسی طرح حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو پوچھا اے معاذ تم نے کس حال میں صبح کی؟ تو انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ پر ایمان (یقین) کی حالت میں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہر بات کی ایک سچائی اور ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے تمہاری بات کی سچائی یعنی اس کی دلیل کیا ہے؟ تو حضرت معاذؓ نے فرمایا یا نبی اللہ میں جب صبح کرتا ہوں تو مجھے شام کا یقین نہیں ہوتا (کہ میں شام تک زندہ رہوں گا) اور جب شام کرتا ہوں تو صبح کا یقین نہیں ہوتا اور جب کوئی قدم (چلنے کے لیے) اٹھاتا ہوں تو اس کے بعد دوسرے قدم کو اٹھانے کا یقین نہیں ہوتا۔ (حیاۃ الصحابہ عربی ۲۵/۳)۔

"کَیْفَ اَصْبَحْتَ یَا معاذُ ؛ قال اَصبحتُ مومِناً باللہِ تعالیٰ قال اِنَّ لکلِ قولٍ مِصداقا ولکلِ حقٍ حقیقةٌ فما مصداقُ ماتقولُ ؛ قال یانبیَ اللہ مااصبحتُ صباحاً قطُ الا ظننتُ انی لااُمسِی، وما امسیتُ مساءًا قطُ الا ظننتُ اَنی لا اُصبحُ ولا خَطوتُ خَطوةً الا ظننتُ انی لا اَتبعُها اُخریٰ"۔

صداقت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یقین

حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی شہادت والا واقعہ مشہور ہے کہ ایک دیہاتی سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گھوڑا خریدا لیکن ابھی قیمت دینا باقی تھی کہ اتنے میں دوسرا خریدار زیادہ قیمت سے خریدنے کے لیے تیار ہو گیا تو وہ دیہاتی معاملہ سے مکرنے لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں خرید چکا ہوں اب تو دوسرے کو بیچ نہیں سکتا لیکن وہ بیچنے والا دیہاتی انکار کر رہا ہے اور پھر اس نے کہا کہ اگر تم نے خریدا ہے تو اس پر کوئی گواہ پیش کیجئے کہ میں نے تم کو یہ گھوڑا بیچا ہے۔ تو حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ نے (جو اس گفتگو کے وقت حاضر تھے) اس کی گواہی دی معاملہ تو طے ہو گیا۔ لیکن معاملہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خزیمہؓ سے پوچھا کہ (تم تو معاملہ کے وقت حاضر

نہیں تھے اور تم نے معاملہ کرتے مجھے دیکھا نہیں تھا پھر) تم نے گواہی کیسے دی؟

تو انہوں نے جواب میں فرمایا ''لِتَصدِیقِكَ یَا رَسُولَ اللهِ'' کہ آپ جب فرما رہے ہیں کہ میں نے خریدا ہے تو آپ کی سچائی کا مجھے پورا یقین ہے بالکل اسی طرح جس طرح آنکھوں سے دیکھنے سے۔ اس واقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خزیمہ تنہا شخص کی شہادت کو دو آدمیوں کی شہادت کے برابر قرار دیا۔ (حیاۃ الصحابہ ۶۲/۳)۔ کہ ہر کسی معاملہ میں صداقت کے لیے دو شخصوں کی شہادت معتبر ہے لیکن حضرت خزیمہ جب شہادت دیں تو ان کی تنہا ذات کی شہادت صداقت کے لیے کافی ہوگی۔، جیسا کہ فقہ اور اصول فقہ میں یہ واقعہ زیر بحث آتا ہے۔ غور کیجئے کہ حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا کتنا پختہ یقین تھا کہ بغیر دیکھے معاملہ کی گواہی صرف آپ کی بات کا یقین کرتے ہوئے دی۔

نبی کی صداقت پر شہادت جب شجر و حجر نے دی ہے تو حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت پر کیا تعجب۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ خود نبی کو صداقت کا اہتمام اس قدر تھا، کہ اہل سیر نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ۴۰ سال پر قوم کو اللہ کی طرف دعوت دینے کے لیے اٹھے اور پہاڑ پر چڑھ کر فرمایا۔ ''لَبِثْتُ فِیكُمْ عُمُرًا، هَلْ وَجَدْتُمُونِیْ صَادِقًا اَمْ كَاذِبًا، قَالُوا جَرَّبْنَاكَ غَیْرَ مَرَّةٍ مَا وَجَدْنَاكَ اِلَّا صِدْقًا. فَقَالَ قُولُوا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ تُفْلِحُوا''۔

رزق میں یقین

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فضائل صدقات میں ایک طویل حدیث شریف ذکر کی ہے خلاصہ یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اس چیز کی طلب میں لگ جائے جو اللہ تعالیٰ شانہ کے پاس ہے آسمان اس کا سایہ ہو زمین اس کا

بستر ہو۔ ایسا شخص بغیر کھیتی روٹی کھائے گا بغیر باغ لگائے پھل کھائے گا۔۔۔اللہ تعالیٰ ساتوں آسمان اور ساتوں زمین کو اس کی روزی کا ذمہ دار بنا دیتے ہیں۔۔۔(فضائل صدقات ۴۱۹)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) صحابہ رضی اللہ عنہم نے (یا اہل بیت رضی اللہ عنہم نے) ایک بکری ذبح کی (جب اس کا گوشت تقسیم ہو چکا تو) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس میں سے کیا باقی رہ گیا؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا بجز شانہ کے کچھ باقی نہیں رہا (یعنی اس کا سب گوشت تقسیم کر دیا ہے۔ صرف شانہ باقی رہ گیا ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بجز شانہ کے اور سب باقی ہے (مشکوۃ ۱۶۹)۔ اس میں قرآن شریف کی اس آیت شریفہ کی طرف اشارہ ہے۔ ''مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ'' (نحل ۹۶)۔

حدیث شریف کا مطلب واضح ہے کہ جو خدا کے نام دیا وہی گوشت اللہ تعالیٰ کے ہاں باقی ہے اور اس کا ثواب باقی ہے اور جس کو تم لوگ باقی کہتے ہو جو کھانے کے لیے رکھا ہے وہ باقی نہیں کیوں کہ ثواب کے لیے اس میں سے کچھ نہیں بچا۔ دیکھیے کس قدر یقین کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث شریف میں تو ہے کہ ہدیہ کا گوشت سائل سے بچا کر رکھا جب ضرورت کے وقت دیکھا تو وہ پتھر میں تبدیل ہو گیا ہے حالاں کہ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بچا کر رکھا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے سائل کو نہ دیا اس لیے پتھر بن گیا۔ مطلب خدا کی ذات پر یقین کرتے ہوئے جس قدر ہو سکے یقین کامل سے خرچ کرنا چاہیے کہ وہ ضرورت کے وقت عطا فرمائیں گے۔

حضرت جی مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ صرف یقین کی تبدیلی پر ہی اللہ پاک اس زمین و آسمان سے کئی گنا زیادہ بڑی جنت عطا فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ضابطے کو یاد رکھیے اس کا ضابطہ یہ ہے کہ جن جن چیزوں میں سے یقین نکل کر اللہ تعالیٰ کی ذات میں

آئے گا ان ساری چیزوں کو اللہ پاک مسخر فرمائیں گے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ ان ہی چیزوں سے ڈرائیں گے جن کا یقین دلوں میں ہوگا "سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَکُوْا" (ال عمران ۱۵۱)۔ اور حضرت جی فرماتے تھے کہ ایٹم سے ڈرنا ایسا ہے جیسا مشرکین کا اپنے پتھر کے بتوں سے ڈرنا۔ ایمان ویقین کے ساتھ فرماتے تھے کہ ایٹم اور ایٹم والوں کی گردنیں قدرت کے ہاتھوں میں ہیں، ایٹم سے وہ ہوگا جو خدا چاہے گا۔ فرعون بھی "وَھٰذِہِ الاَنْھَارُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ" کہا کرتا تھا مگر خدا نے اسی پانی کو اس کے غرق وبربادی کا سامان بنادیا۔ (تذکرہ حضرت جیؒ۔ ۵۰)

مرض سے شفا کا یقین

مظاہر حق میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ڈاڑھ میں درد ہوا تو بارگاہ حق میں فریاد کی تو حکم ہوا کہ فلاں گھاس استعمال کرلو۔ چناں چہ استعمال کے بعد آرام ہوگیا۔ کچھ مدت کے بعد پھر درد ہوا تو انہوں نے وہی گھاس استعمال کی تو بجائے درد کم ہونے کے اور بڑھ گیا۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور عرض کیا تو عقاب کے ساتھ جواب ملا کہ اُس وقت تم نے وہ گھاس ہمارے حکم سے استعمال کی تھی تو ہم نے شفادی تھی اور اس بار تمہارا یقین گھاس پر تھا اور ہماری طرف توجہ نہ کی تو ہم نے شفا کے بجائے درد بڑھادیا تاکہ تم کو یقین ہوجائے کہ شفا ہم دیتے ہیں۔ (مظاہر حق ۳/ ۱۴۰)۔

خلاصہ یہ کہ ہم ائمہ حضرات میں یہ دونوں صفات یعنی مصائب پر صبر اور اللہ تعالیٰ کی ذات کا کامل یقین اعلیٰ درجہ کی ہونی چاہئیں اور ان کے حصول کی طرف توجہ کرنی چاہیے اس کے بغیر وعدہ خداوندی کے ہم مستحق نہیں ہوسکتے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو صبر جمیل اور کامل یقین نصیب فرمائیں۔ آمین

(۲) اقتدار کا معیار وصفات

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مرتبے سے کون ناواقف ہوگا! انہوں نے خلافت کی ذمہ داری اٹھانے کے بعد پہلے خطبے میں ارشاد فرمایا: لوگو! میری خواہش یہ تھی کہ اس بوجھ کو کوئی دوسرا شخص اٹھاتا اور اگر تم مجھ سے اپنے پیغمبر کی اطاعت چاہو گے تو میں اس کا متحمل نہ ہوسکوں گا کیوں کہ وہ شیطان سے محفوظ و مامون تھے اور ان پر آسمان سے وحی نازل ہوتی تھی۔

اقتدار پر فائز ہونا بڑی خطرناک ذمے داری ہے۔ اس کی خواہش وطلب کرنے والا رب کی تائید واعانت سے محروم ہوجاتا ہے اور سارا بوجھ اسے اٹھانا پڑتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ہم اس شخص کو حاکم نہیں بناتے جو اس کا طالب ہو (بخاری شریف)۔

آج سب جگہ لوگ اپنی عزت کی چھاپ کھڑی کرنے کے لیے اندھے بن کر اقتدار کا ڈنڈا حاصل کرنے کے درپے ہیں، ذرا بھی بصیرت نہیں کل روز قیامت کو معلوم ہوگا کہ اقتدار نے ان کی عبادتوں کا کیا حال کر رکھا ہے۔ ہاں اگر مطلوبہ اوصاف کے ساتھ ہو تو مضائقہ نہیں۔ لوگوں پر اقتدار چاہے جس درجہ کا بھی ہو، ایک اہم منصب ومقام ہے، کیوں کہ اس سے اپنے ماتحتوں کی دینی ودنیوی خبر گیری مقصود ہوتی ہے۔ ایسے شخص کو اپنے مقام کے ناتے کن اہم اوصاف سے متصف ہونا چاہیے تاکہ اچھی طرح خبر گیری کرسکے تو اس بارے میں قرآن کریم کی اہم ہدایت یہ ہے۔

مفسر قرآن حضرت **مفتی محمد شفیع** صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ صاحب اقتدار میں دو چیزیں ''دو صفات'' پائی جانی ضروری ہیں۔

(۱) یہ کہ جس مقصد کے لیے کسی کو مقتدا بنایا جائے وہ اس مقصد سے اور اس کے طریق سے پوری طرح واقف ہو یعنی اسے اس کا مکمل علم ہو۔

(۲) چیز وہ اس راہ پر (اس علم کے مطابق) چل بھی رہا ہو (جس کو اہتداء کہتے ہیں) یعنی اس کا عمل اس علم وواقفیت کے مطابق ہو۔

یعنی دو چیزیں ضروری ہوئی ایک علم دوسرا عمل۔ علم سے مراد علم صحیح اور عمل سے مراد عمل مستقیم ہے۔ غرض کہ کسی کو مقتداء بنانے کے لیے ''علم صحیح'' اور ''عمل مستقیم'' کے معیار سے جانچنا ضروری ہے۔

لہٰذا باپ دادا ہونا، یا لیڈر ہو جانا، یا صاحب مال و دولت ہونا وغیرہ قرآن کی نظر میں معیار اقتدار نہیں۔ حضرت نے قرآن شریف کی جس آیت شریفہ کی تفسیر کے تحت یہ بات ارشاد فرمائی ہے وہ یہ ہے۔ '' أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُونَ '' (مائدہ ۱۰۴) بھلا اگر ان کے باپ دادا نہ کچھ علم رکھتے ہوں اور نہ راہ جانتے ہوں (تو بھی ایسا ہی کریں گے)۔ (معارف القرآن ۳/۲۵۰)۔

لہٰذا نہ تو نااہل کو مقتدا بنایا جاسکتا ہے نہ غلط اعمال کرنے والے کو، کیوں کہ جو شخص خود منزل مقصود کو نہ جانتا ہو، یا جاننے کے باوجود منزل کے خلاف سمت چل رہا ہو اس کے پیچھے چلنا ہر عقل مند کے نزدیک اپنی سعی و عمل کو ضائع کرنا ہے بل کہ ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔ گویا اس سے مروجہ طریقہ (باپ کے انتقال کے بعد بیٹے کو اور بیٹے کے انتقال کے بعد پوتے کو امام بنانے) کی قباحت ثابت ہوتی ہے جب کہ وہ اس معیار کے نہ ہوں۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک عنوان ''اقتدار کا معیار'' اور دوسرا ''نااہل کو مقتداء بنانا ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔'' قائم کر کے مذکورہ باتیں پیش کی ہیں۔ لہٰذا ائمہ اہلیت امامت کے حامل ہوں اور علم پر عمل کرنے والے بھی ہوں۔

حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص بے علم ہو اور لوگوں کی امامت کرے تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو سمندر کے پانی کا وزن کرتا ہے۔ کیوں کہ اسے پانی کی کمی زیادتی کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ بس اسی طرح بے علم امام کو نماز میں ہونے والی کمی بیشی (صحت و فساد، کمال و نقصان) کا علم نہیں ہوسکتا۔ ''مَثَلُ الذی یَؤُمُّ النّاسَ بِغَیرِ عِلمٍ مثلُ

الذی یَکِیۡلُ الماءَ فی البحرِ، لایَدرِی زِیادتَہ مِن نُقصانِہٖ"۔(النصیحۃ الموجزۃ ۶۰)۔خواجہ حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص (امام) علماء کی خدمت میں آمدورفت نہ رکھتا ہو اس کی اقتدا میں نماز نہ پڑھو" لاتُصَلُّوۡا خلفَ رَجُلٍ لایَختلفُ الی العلماءِ"۔ (النصیحۃ ۵۹)۔گویا آپ نے ایسے امام کو لائق امامت نہیں سمجھا کیوں کہ مسائل سے واقفیت نہ ہوگی۔یہاں ان دوصفات کا اصل بیان ختم ہوا۔اگر ذوق ہے تو آگے ملاحظہ فرمائیں۔

علم صحیح اور عمل مستقیم اور اہل السنۃ والجماعۃ

جس علم صحیح اور عمل مستقیم کا آیت بالا میں ذکر ہوا اس کی ضروری تفصیل پیش کی جاتی ہے۔چوں کہ استقامت عمل کا مدار علم صحیح پر ہے لہٰذا مناسب ہے کہ اس کو حدیث کی روشنی میں واضح کیا جائے۔

آیت شریفہ میں علم صحیح سے مراد عقیدہ کی صحت اور نظر وفکر کی صفائی ہے۔ترمذی شریف کی روایت حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت پر وہ زمانہ بھی آئے گا جو بنی اسرائیل پر گذرا ٹھیک اسی طرح جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے حتیٰ کہ ان میں سے کسی نے اپنی ماں (سوتیلی) سے بدفعلی کی تھی تو میری امت میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو اس کو اختیار کریں گے۔اور بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹے تھے تو میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹے گی۔وہ تمام فرقے جہنم میں ہوں گے سوائے ایک کے (کہ وہ جنتی ہوگا)۔صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کون ہیں یعنی فرقہ ناجیہ کون ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مَا اَنَا عَلَیۡہِ وَاَصۡحَابِیۡ" وہ لوگ ہیں جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر ہیں۔(مشکوٰۃ ۳۰،رواہ الترمذی)۔دوسری روایت میں ہے ایک (فرقہ) جنتی ہے اور وہ جماعت ہے۔

پہلے حدیث شریف کی مختصر ضروری وضاحت ذہن نشین فرمائیں۔ پھر اہل السنۃ والجماعۃ کی تشریح۔

(۱) یہاں افتراق وفرقہ بندی سے بنیادی عقائد میں افتراق مراد ہے فروعات کا افتراق مراد نہیں۔ وجہ یہ کہ ان فرقوں پر دوزخی ہونے کا حکم لگایا گیا ہے جو عقائد کی خرابی کو بتاتا ہے، یہ حکم فروعی اختلاف پر ممکن نہیں کیوں کہ وہ تو باعث رحمت وثواب ہے۔

(۲) میری امت کہنے میں امت اجابت مراد ہے نہ کہ امت دعوت۔ کیوں کہ امت دعوت کا بوجہ عدم اسلام جہنمی ہونا طے ہے جب کہ یہاں اسلامی فرقوں کا جہنمی ہونا مراد ہے۔

یہی بات علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالی نے فرمائی ''یُدْخِلُهُمُ النَّارَ مِنَ الافعالِ الرَّدِّيَةِ (مِنَ الْعَقَائِدِ) اَوْيُدْخِلُوْنَهَا بِذُنُوْبِهِمْ ثُمَّ يُخْرِجُ مِنْهَا مَنْ لَّمْ يُفْضِ بِهٖ بِدْعَتُهٗ اِلَى الْكُفْرِ بِرَحْمَتِهٖ''[1]۔ (طیبی ۱/۳۳۵)

(۳) ان فرقوں کی اجمالی اقسام تو ۷ یا ۸ ہیں جن سے یہ فرقے بنتے ہیں۔

(۴) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث شریف میں عملی انحطاط کا بھی اشارہ کیا ہے اور علمی انحطاط کا بھی۔

---

[1] اسلامی فرقوں کے جہنمی ہونے کا کیا مطلب ہے؟ حضرت حکیم الامت مجدد الملت علامہ تھانوی رحمہ اللہ تعالی نے اس کے متعلق جواب میں فرمایا ''یہ لوگ ابد کے لیے ''جہنم میں'' نہ جائیں گے بل کہ بعد سزا سب کی نجات ہوگی یعنی جن کو ایمان وتصدیق حاصل ہے ان کو نجات ہوگی، گو بہتر (۷۲) فرقے میں سے ہو۔ اور ان بہتر (۷۲) کی تخصیص اس اعتبار سے ہے کہ ان کو عقائد فاسدہ پر بھی عذاب ہوگا جس میں اہل السنۃ شریک نہیں اور اعمال پر سزا ہونے میں سب شریک ہیں۔ اور تصدیق کی قید اس لیے لگائی کہ اگر کسی مُبتدِع کو ایسا غلو ہو جائے کہ وہ حدِّ ایمان ہی سے خارج ہو جائے تو وہ اسلام ہی سے خارج ہے اس کی ابدیت ناریت میں کوئی اشکال نہیں'' (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۲/۶۱، ۶۲)۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا ''حدیث میں جو آیا ہے، امت تہتر (۷۳) فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی جن میں سے ایک جنت میں جائے گا۔ بہتر (۷۲) دوزخ میں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ بہتر فرقے مُخلّد فی النار ہوں گے، اور فرقۂ ناجیہ کے لیے بھی لازم نہیں کہ وہ دوزخ سے بالکل بری ہو بل کہ مراد یہ ہے کہ بہتر فرقوں کو عقائد واعمال دونوں پر عذاب ہوگا اور فرقۂ ناجیہ کو اعمال پر۔ خلود نار دونوں کے لیے نہیں'' (ملفوظات حکیم الامت ادارہ اشرفیہ ملتان۔ ج ۲۴/۱۹۹)۔

● عملی انحطاط یہ ہوگا کہ ماں سے بدفعلی کی جائے گی۔

● علمی انحطاط کا حال یہ ہوگا کہ بنی اسرائیل میں علمی انحطاط سے اگر ۷۲ فرقے ہوئے تھے تو میری امت میں ایک اور فرقہ کا اضافہ ہوجائے گا۔ ''وَزَادُوْا فِیْ ارْتِکَابِ الْبِدَعِ بِدَرَجَۃٍ'' (طیبی ۱/۴۳۷)۔

اس حدیث شریف میں صحت علم اور صحت عقیدہ کے معیار و میزان کا بیان ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ اس میزانِ کے بیان میں کوئی طویل تقریر نہیں کی بل کہ ''مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ'' کا مختصر جملہ پیش فرما کر تمام صحیح عقائد کی (چاہے وہ ذات خداوندی اور اس کی صفات سے متعلق ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، قبر وآخرت سے متعلق ہوں کہ کبائر وصغائر سے، مصادر شرعیہ سے متعلق ہوں کہ صحابہؓ سے) راہ نمائی فرما دی۔

امام الہند حضرت قاری طیب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ (علماء دیوبند۔ تعریب حضرت مولانا نور عالم خلیل الامینی دامت برکاتہم۔ میں) فرماتے ہیں کہ آپ نے امت کے ۷۳ فرقوں میں حق و باطل کی معرفت کے لیے دو امر کو معیار قرار دیا۔

۱۔ ''مَا'' ۲۔ ''اَنَا وَاَصْحَابِیْ''۔

(۱) ''مَا'' سے سیرت نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسوۂ نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اشارہ فرمایا جس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہؓ قائم تھے۔ اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ ''سنت'' بھی اسی کا نام ہے جن دونوں پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل فرمایا اور صحابہؓ نے اس کو اختیار فرمایا۔ تو کلمۂ ''مَا'' اس ''سنت'' کا عنوان ٹھہرا جو فرقۂ حقہ کے لقب کا ایک جز ہے۔

(۲) رہا کلمۂ ''اَنَا وَاَصْحَابِیْ'' تو بلاشبہ اس سے وہ قدسی شخصیات مراد ہیں جن میں سرفہرست

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہے پھر شخصیات صحابہؓ۔ پس ''اَنَا وَاَصحَابِیْ '' کا مطلب وہ جماعت ہوئی جو فرقہ حقہ کے لقب کا جز ثانی ہے۔جن دونوں کا مجموعہ ''اہل السنۃ والجماعۃ'' ہے۔

اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی روایت ''وواحدٌ فِی الجنّۃِ وَھِیَ الجماعۃُ'' میں اسی پہلی روایت میں ذکر کردہ ''انا واصحابی'' کو ''الجماعۃ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔مطلب اسی کا یہاں صراحتاً جماعت سے بیان ہوا ہے [1]۔(علمائے دیوبند عربی ۱۵۴،۱۵۵)۔

---

[1] کتاب میں اس مذکورہ بحث سے یہ ثابت ہوا کہ

(۱) ''اہل السنۃ والجماعۃ'' قدیم جماعت ہے، کوئی بعد میں پیدا ہونے والی نہیں۔اور یہی اصل جماعت ہے۔

(۲) جماعت حقہ کے لیے یہ لقب صحابہؓ کے مابین بھی معروف تھا (علمائے دیوبند ۱۵۲)۔

''اہل السنۃ والجماعۃ'' (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جس زمانہ میں ''انا واصحابی'' فرمایا گیا تھا اس سے ملحق زمانوں میں) اہل ''حق'' کا ایک ایسا رمز تھا جس کی تعبیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ''انا واصحابی'' سے ہوئی تھی۔جس کی بنا و وضع قرنِ اول میں تام ہو چکی تھی، جو قرونِ لاحقہ کی طرف سے ایجاد کا کوئی احتمال نہیں رکھتا۔(علمائے دیوبند عربی ۱۵۱)۔

اس جماعت ''اہل السنۃ والجماعۃ'' کا اس کے سوا کوئی دوسرا لقب اس زمانے میں نہیں تھا۔ورنہ ظاہر ہوتا۔ جیسا کہ مابعد کے زمانوں میں ''اہل القرآن، اہل الحدیث، اہل الفقہ، اہل الکلام، اہل التصوف، الجماعۃ الدینیۃ، الجماعۃ الایمانیۃ'' جیسے القاب مشہور ہوئے۔(۱۵۸)

ان روایات وواقعات اور ان بحثوں سے معلوم ہوا کہ ''اہل السنۃ والجماعۃ'' اصلی جماعت ہے۔جو اسم ورسم ---شکل وصورت---شریعت وطریقت ---فکر ووجدان ---علم وعمل --- ذوق ومذہب---علم ومعرفت--- استحسان و استخلاص--- دین وسیاست--- روایت ودرایت---ظاہر وباطن --- لون ورنگت---عقل ودین اور جہاد نفس ودشمن کے اعتبار سے قدیم ہے۔یہی جماعت اسلام کی مضبوط بنیاد ہے۔

اسلام اپنے اول دن سے اس جماعت کی شکل میں وجود میں آیا اور وہ جماعت پہلی صدی ہی سے وجود میں آئی، اسی میں اس کا لقب اور مذہبی نام ''اہل السنۃ والجماعۃ'' وضع ہوا جو اس کے قدیم اور اصل ہونے کی دلیل ہے ۔(علماء دیوبند عربی ۱۶۰)۔جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک اس کے اصل متبعین انہی مذکورہ خصوصیات وصفات پر بعینہ کسی کمی بیشی بغیر پائے جاتے رہے ہیں۔

آج ہر جماعت اپنے حق میں حق پرست اور اہل السنۃ والجماعۃ ہونے کا اور دوسروں کے بارے میں باطل پرست ہونے کا دعویٰ کرتی ہے تاہم اس کا فیصلہ آج تو نہیں کیا جا سکتا۔

صفحہ نمبر ۳۶ کا باقیہ حاشیہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اور علامہ طیبیؒ متوفی ۷۴۳ھ شرح مشکوٰۃ میں مذکورہ روایت کے تحت فرماتے ہیں کہ ''ما انا علیہ واصحابی'' سے مراد وہ حضرات ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی سنت پر قائم ہوں (طیبی ۱/۳۳۷)۔

اور ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ''اِتَّبِعُوْا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ'' (مشکوٰۃ ۳۰)۔ کے تحت ظاہری علامت بتاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ سواد اعظم یعنی بڑی (اور معتبر) جماعت (جن کی اتباع کا حکم ہے) وہ ہے جو عقائد واصول اور اقوال وافعال میں جس پر علماء وعام مسلمان ہوں۔ پس انہی کی اتباع کرو اس لیے کہ یہی حق ہے اس کے ماسوا باطل ہے۔ اور فروعات میں امام مالکؒ، شافعیؒ، ابوحنیفہؒ اور احمدؒ کے نقش قدم پر ہو۔ یہ فروعی اختلاف (جماعت حقہ میں ہونے سے) مضر نہیں۔ ''فَمَا عَلَيْهِ الْاَكْثَرُ مِنْ عُلَمَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ مِنَ الْاِعْتِقَادِ وَالْقَوْلِ وَالْفِعْلِ، فَاتَّبِعُوْهُمْ فِيْهِ فَاِنَّهُ هُوَ الْحَقُّ وَمَا عَدَاهُ بَاطِلٌ هٰذَا فِي الْاُصُوْلِ۔۔۔ وَاَمَّا الْفُرُوْعُ۔۔۔ كَمَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ وَاَبِيْ حَنِيْفَةَ وَاَحْمَدَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ يَجُوْزُ الْعَمَلُ بِهٖ'' (طیبی، ۱/۳۳۹)۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت جس میں خط کھینچ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''هٰذَا سَبِيْلُ اللّٰهِ'' کہ یہ اللہ کا راستہ ہے اور اس میں صراط مستقیم کا ذکر ہے (مشکوٰۃ ۳۰)۔

اس کے تحت فرماتے ہیں کہ اگر تو یوں پوچھے کہ تمہارے صراط مستقیم پر ہونے کی کیا دلیل ہے؟ کیوں کہ ہر فرقہ اس پر ہونے کا مدعی ہے۔ تو میں جواب دوں گا کہ صرف دعویٰ اور وہم وزعم کافی نہیں ہوتا۔ بل کہ اس کو اس کے ماہرین سے اور ان علماء حدیث سے نقل کی ضرورت ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امور، آپ کے احوال وافعال، آپ کی حرکات وسکنات میں صحیح احادیث جمع کی ہیں اور اسی طرح مہاجرو انصار صحابہؓ کے احوال کو جمع کیا ہے۔

مثلاً امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ، مسلم بن حجاج قشیریؒ وغیرہما وہ مشہور ثقات حضرات جن کی کتابوں میں بیان کردہ احادیث کی صحت پر اہل دنیا متفق ہیں۔ (طیبی ۱/۳۳۲)۔

اور ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ روایت الباب کے تحت لکھتے ہیں کہ فرقہ ناجیہ کے ظاہر کا نام شریعت ہے جس کو عام لوگوں کے لیے مشروع کیا گیا ہے، اور اس کے باطن کا نام طریقت ہے جو خواص کا منہج ہے، اور اس کے خلاصہ کا نام حقیقت ہے جو اخص الخواص کی معراج ہے۔ پس اول تو بدنی اعمال کا وظیفہ ہے، ثانی قلبی علم ومعرفت کا حصہ ہے اور ثالث روحانی مشاہدہ ورویت کا نصیبہ ہے۔ (مرقات ۱/۲۴۸)۔

کیوں کہ حق تعالیٰ نے فیصلے اور انصاف کے لیے قیامت کے دن کو مقرر کیا ہے جس دن ہر جماعت اپنے اپنے دلائل پیش کرے گی اور حق و باطل کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔

حضرت مولانا الطاف حسین نقشبندیؒ فرماتے ہیں: کہ ’’مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ ‘‘ کا مفہوم بدعتی اور گمراہ شخص ’’اپنے فاسد عقائد کو‘‘ اپنے زعم وخیال میں کتاب وسنت ہی سے ماخوذ ہونے کا مدعی ہے۔لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ کتاب وسنت کے وہی معانی ومفاہیم معتبر ہوں گے جو کتاب وسنت ہی سے ماخوذ ومستفاد ہوں جنہیں صحابہ کرامؓ نے سمجھا تھا۔جو شخص صحابہ کرامؓ کے مفہوم کے خلاف کتاب وسنت کا مفہوم بیان کرے بس یہی اس کے گمراہ ہونے کی دلیل ہے۔

جس طرح سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو طریقۂ خداوندی سے جدا نہیں کیا جاسکتا اسی طرح اسوۂ صحابہ کو اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔اللہ تعالیٰ کا دین ہم تک ان ہی دو واسطوں سے پہنچا ہے۔ان دو واسطوں کو مانے بغیر دین باقی نہیں رہ سکتا۔لہٰذا فرقۂ ناجیہ وہ ہوگا جو ان دو واسطوں کو مانتا ہو۔(رہبر علم حدیث ۱۷۰)۔

یاد رکھیے چاروں مسلک کے حضرات جن میں اہل دیوبند بھی ہیں اہل السنۃ والجماعۃ ہیں۔جن کی بنیاد کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع امت اور قیاس مجتہد پر ہے۔ان کا طریقہ ہر قسم کے افراط وتفریط سے منزہ ہوکر اعتدال وکمال پر مبنی ہے۔

اصول وکلیات کے لحاظ سے ان کا مسلک ائمہ حدیث (بخاریؒ، مسلمؒ، ترمذیؒ۔۔)۔۔۔ائمہ تفسیر (قاضی بیضاویؒ، صاحب جلالینؒ اور ابن کثیرؒ)۔۔۔اور ائمہ عقائد (رازیؒ، اشعریؒ، ماتریدیؒ، غزالیؒ، ابن عربیؒ)۔۔۔ائمہ فقہ (ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، احمدؒ، مالکؒ)۔۔۔ائمہ احسان تزکیہ (جنیدؒ، معروف کرخیؒ، بایزیدؒ، ابن تیمیہؒ اور چاروں سلسلے قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ، چشتیہ)

۔۔۔اور ائمہ اصول (فخر الاسلامؒ، علامہ دبوسیؒ)۔۔۔اور مشہور فقہی مصنفین (صاحب قدوریؒ، وہدایہ رحمہم اللہ تعالیٰ)۔۔۔اور علماء ہندوستان کے جبال العلم شاہ ولی اللہؒ، عبدالحقؒ، عبدالعزیزؒ وغیرہم کے مسلک ومشرب کے مطابق ہے۔

ان حضرات کے فروعی اور جزوی اختلافات سے قطع نظر اصول وکلیات اور بنیادی عقائد پر نظر ڈالیں گے تو آپ ان کو ان سابقین کا ہم مشرب ہی پائیں گے۔اس طرح کی عمدہ تفصیل صاحب مظاہر حق نے بھی پیش کی ہے وہاں مراجعت فرمائیں۔(مظاہر حق ۱/۲۳۴)۔

ہندوستان کے ماضی قریب کے مشائخ اور مشاہیر علماء (رشید احمد، قاسم، محمود الحسن، حسین احمد، انور کشمیری، اشرف علی، قاری طیب، الیاس کاندھلوی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم)۔اسی مسلک کے سپہ سالار اور قائد ہیں جن کی زندگیاں ڈنکے کی چوٹ (اسلاف کی مذکورہ نشاندہی کے مطابق) اہل السنۃ والجماعۃ ہونے کی اعلان کرتی ہیں، پھر بھی کوئی اس سے اپنی آنکھیں بند کرلے تو یہ اسکی کوتاہی ہوگی۔۔۔[1] شعر

ہوشیار کو ایک حرف نصیحت ہے کفایت	نادان کو کافی نہیں دفتر نہ رسالہ

(۳) عہدہ دیئے جانے سے پہلے قابل نظر اس کا کردار

آدمی کا کردار نہ صرف دینی عہدے کے لیے معیار سمجھا جاتا ہے بل کہ دنیوی مناصب کے لیے بھی۔لوگ اعلیٰ منصب کے لیے اسی کا انتخاب کرتے ہیں جس کے کردار اچھے ہوں۔قرآن کریم نے اس کے متعلق جن اہم کرداروں کی نشاندہی کی ہے وہ ہے عدل وحق پرستی اور

[1] ہم نے صحت عقیدہ کے تحت یہاں ''اہل دیوبند کے موقف کی'' بات اس لیے کی ہے کہ ہم حق کی وضاحت میں مجبور ہیں۔کیوں کہ بوجہ ضرورت اظہار حق فرض ہے بل کہ اس کی دعوت بھی فرض ہے۔

خواہشات کی اتباع سے پرہیز کرنا، چناں چہ قرآن کریم نے بطور خاص عدالت اور بطور عام کسی بھی منصب وعہدہ دیئے جانے والے میں ان دونوں کولازم قرار دیا ہے۔

اس بارے میں قرآن کریم نے حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ کو پیش کیا ہے۔ارشاد ہے ''یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ'' (ص۲۶)۔اے داؤد! ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے لہٰذا تم لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا اور نفسانی خواہشات کی پیروی مت کرنا(کیوں کہ) وہ خدا کی راہ سے تم کو بھٹکا دے گی۔اس میں صاف طور پر عدل وانصاف اور حق پرستی اور حق کی اتباع کا حکم ہے۔ظاہر ہے حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کے نبی وپیمبر ہیں ان سے زیادہ امانت دار کون ہوسکتا ہے پھر بھی انہیں اس سے متنبہ کیا جارہا ہے، معلوم ہوا کہ اس سے دوسروں کو اس کی تعلیم دینا مقصود ہے۔

نیز یہ ہدایت ویسے تو عدالت سے متعلق ہے کہ جو قاضی بنے اسے مقدمات ومخاصمات میں عدل کی رعایت کرتے ہوئے فیصلہ کرنا چاہیے۔کسی رشتہ، پہچان اور کسی کے مقام ومرتبہ کو سامنے رکھ کر انصاف کے خلاف فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ خواہشات کی پیروی راہ حق اور راہ ہدایت سے ہٹا دیتی ہے۔

مفسر قرآن حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر چہ حکم عدل تو عہدۂ عدالت وقضا سے متعلق ہے تاہم ضمنی طور پر'' ذمہ داری کا ہر چھوٹا بڑا عہدہ'' بھی اس میں شامل ہے۔ جس طرح حکم عدل بطور خاص تو حضرت داؤد علیہ السلام کو ہے لیکن مجازاً ہر عدالت کو شامل ہے۔(معارف القرآن ۷/ ۵۰۹)۔

لہٰذا ائمہ حضرات کو اپنے منصب امامت میں حق وعدل کا لحاظ ضرور کرنا چاہیے اور جس خواہشات نفسانی کو آیت میں ذریعۂ وضلالت وگمراہی بتایا ہے اس سے سخت اجتناب کرنا چاہیے۔عدل میں وہ تصفیہ بھی داخل ہے جو کوئی فیصل بن کر اختیار کرے، ''وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ '' (نساء،۵۸)۔جب تم لوگوں کے درمیان تصفیہ کرو تو انصاف کے ساتھ تصفیہ کیا کرو۔ چوں کہ ائمہ کو لوگ اپنے تنازعات میں فیصل بناتے ہیں اس لیے انہیں ان میں عدل سے کام لینا چاہیے۔

ائمہ حضرات کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش آئے تو اس میں اہل ثروت وغیر ثروت، صاحب عزت وغیر صاحب عزت، چھوٹے بڑے، صاحب مرتبہ وغیر صاحب مرتبہ اور اپنے اور پرائے میں تفریق ہرگز نہ کریں اپنے مفاد کو دوسرے کے مفاد پر ترجیح نہ دیں۔بل کہ تعلیمات شرعیہ کے پیش نظر عدل کی رعایت کریں۔عدل کے تین درجات ہیں تینوں کی رعایت کریں۔

عدل کے تین درجات

● **پہلا عدل:** حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ابن عربی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ عدل کا مفہوم مختلف نسبتوں سے مختلف ہو جاتا ہے۔مثلاً انسان اپنے نفس اور اپنے رب کے درمیان عدل کرے۔تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے حظ نفس پر اور اس کی رضا کو اپنی خواہشات پر مقدم جانے اور اس کے احکام کی تعمیل کرے اور اس کے محرمات سے اجتناب کرے۔

● **دوسرا عدل:** یہ ہے کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ عدل کرے وہ یہ ہے کہ

اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے بچائے جس میں اس کی جسمانی یا روحانی ہلاکت ہو۔

● **تیسرا عدل** : اپنے نفس اور تمام مخلوقات کے درمیان ہے وہ یہ کہ تمام مخلوقات کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرے اور ادنی معاملہ میں بھی کسی سے خیانت نہ کرے اور کسی انسان کو اپنے کسی قول وفعل سے ظاہراً و باطناً کوئی تکلیف نہ پہنچے اس کا خیال کرے۔

نیز عدل میں عقیدہ کا اعتدال ،،،، عمل کا اعتدال ،،،، اخلاق کا اعتدال سب شامل ہیں۔(معارف القرآن ۳۸۹/۵)

آیت شریفہ میں دوسری اہم چیز جس سے بچنے کا حکم ہے وہ ہے خواہشات کا اتباع۔ کیوں کہ وہ ضلالت و گمراہی کا ذریعہ ہے۔

(۱) وہ نہ صرف اہل حق کو دین پر قائم ہونے سے مانع ہوتی ہے۔

(۲) بل کہ کفار و مشرکین کو کفر و شرک سے نکل کر اسلام کی طرف آنے سے مانع بھی یہی چیز ہوتی ہے۔

یہ عملی طور پر بھی مانع ہوتی ہے اور علمی اور نظری طور پر بھی۔

اس خطیر گناہ کی طرف قرآن نے ان ہی دونوں طرح کے شکار طبقوں کی آنکھیں کھول دیں ہیں۔ عملی طور پر مانع ہونے کی مثال تو باسانی سمجھی جاسکتی ہے۔ نظری کی مثال ملاحظہ ہو، قرآن کا ارشاد ہے۔ " أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ " (فرقان ۴۳)۔ اے پیغمبر آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنا خدا خواہشات نفسانی کو بنا رکھا ہے۔ نظری خطا یہ ہے کہ خواہشات نفسانی کو الٰہ اور معبود سمجھا جائے جیسا کہ آیت شریفہ سے مفہوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائیں۔

بل کہ یہ (خواہشات کی اتباع) اتنی بڑی خرابی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی

اللہ عنہما تو اس کو بت پرستی کہتے تھے۔ کیوں کہ بت پرستی کا مطلب ہے غیر اللہ کی پرستش۔ چاہے پھر وہ بت کی ہو کہ خواہش کی۔ کیوں کہ بت پرستی میں اصل پرستش بت کی نہیں ہوتی بل کہ خواہش ہی!!! کی ہوتی ہے۔ (معارف القرآن ۲/۴۷۶) اللھم احفظنا من ذلک۔ یہ دو کردار عدل وحق پرستی اور خواہشات کی اتباع سے پرہیز وہ ہیں جو عہدہ دیے جانے والے میں دیکھنا ضروری ہے جیسا کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے یہی عنوان قائم کیا ہے ''عہدہ دیے جانے سے پہلے قابل نظر اس کے کردار'' (معارف القرآن ۷/۵۰۹) یہاں دو صفات کا اصل بیان ختم ہوا مزید اگر ملاحظہ کا ارادہ ہو تو ذیل میں کچھ تفصیل ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے عدل کا اثر

آدمی کے حق پرست اور عدل پرست ہونے کا اثر نہ صرف اپنے ماتحت افراد اور انسانوں کی طبیعت پر پڑتا ہے بل کہ جانوروں پر بھی ہوتا ہے۔ علامہ دمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''حیاۃ الحیوان'' میں عدل کے اثر کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کے عہد خلافت میں موسیٰ ابن اعین کرمان میں بکریاں چرایا کرتے تھے، ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ رات کے وقت ایک بھیڑیا آیا اور ایک بکری کو اٹھا کر لے گیا، یہ واقعہ دیکھ کر ہم کہنے لگے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرد صالح جن کی یہ برکت تھی شاید انتقال فرما گئے۔

چناں چہ ہم نے صبح اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کا انتقال ہو گیا ہے۔ جب ان سے کسی نے دریافت کیا کہ تم کو اس کا کیسے علم ہوا کہ یہ ان کی برکت تھی؟ تو چرواہوں نے جواب دیا کہ جب وہ مرد صالح خلیفہ ہوئے تھے (جن کا عدل معروف ہے) تب

سے ہماری بکریاں، شیر اور بھیڑیوں کے خطرے سے محفوظ تھیں اور عالم یہ تھا کہ بکریاں شیر اور بھیڑیے ایک ساتھ چرا کرتے تھے۔ (دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات ۲۳۰)۔

آیت شریفہ میں فریقین کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کرنے اور ان میں صلح واصلاح کرانے کا ذکر ہے۔ اسی مناسبت سے حضرت اقدس تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عمدہ بات تحریر کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب کوئی مخاصمہ میں فیصلہ کیا جائے اور اس میں صلح کرائی جائے تو حکم الٰہی کے موافق صلح کرائی جائے صاحب حق کو دبایا نہ جائے۔ ظاہر ہے صاحب حق کو دبانا (مجبور کرنا) حکم الٰہی کے خلاف ہے۔

پس صلح کرانے کا طریقہ یہ نہیں جو آج کل رائج ہے کہ دونوں فریق کو کچھ کچھ دبایا جاتا ہے یہاں تک کہ جس کا حق ہوتا ہے اس کو بھی دبایا جاتا ہے۔ بل کہ صلح کرانے کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ جو ناحق پر ہو اس کو تو دبایا جائے نہ کہ صاحب حق کو کیوں کہ اس کو دبانا اضرار (نقصان پہونچانا) ہے اور غیر صاحب حق کو دبانا اضرار نہیں۔ بل کہ اس میں تو خود اس کو اضرار سے روکنا ہے۔ مطلب یہ کہ صحیح بنیاد پر صلح کراؤ اور اگر اس پر راضی نہ ہو تو سب مل کر غلط بنیاد کو ڈھا دو (کمالات اشرفیہ ۱۸۱)

عدل اور شرعی احکام پر قادر شخص کے لیے طلب ولایت درست ہے

عنوان پر غور کریں، یہ بات قرآن کی روشنی میں کہی گئی ہے۔ اگر وقت کا حاکم یا اس کا ماتحت کوئی افسر لوگوں میں عدل قائم نہ رکھتا ہو یا شرعی احکام نافذ نہ کرتا ہو یا نہ کرسکتا ہو تو رعایا میں سے اگر کوئی شخص دنیوی غرض سے بچ کر عدل قائم کرنے اور احکام جاری کرنے پر قدرت رکھتا ہو تو قرآن شریف کی روشنی میں کہا جاسکتا کہ اس کے لیے اس عہدہ اور ولایت کو طلب کرنا درست ہے۔

جب سیدنا یوسف علیہ السلام قید خانہ سے باعزت رہا کئے گئے تو بادشاہ کی نگاہ میں

انہوں نے ایک بلند مرتبہ حاصل کرلیا۔لیکن ملکی خزانوں کا حال دیکھا کہ وہ ضائع ہورہے ہیں اوراس کے حقیقی مستحقین محروم کیے جارہے ہیں اور خزانوں کی حفاظت نہیں کی جارہی ہے۔تو شاہ مصر سے خود یوسف علیہ السلام نے ولایت کو طلب کیا۔ ”قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ“ (سورۃ یوسف ۵۵)۔انہوں نے کہا کہ مجھ کو ملک کے خزانوں پر مامور کردو میں ان کی حفاظت (بھی) رکھوں گا اور میں (آمدوخرچ وغیرہ کے مواقع سے) خوب واقف ہوں۔

اس میں غور کیجئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جہاں ولایت کو طلب کیا ہے، وہاں انہوں نے طلب ولایت کی شرعی وجہ بھی بیان کی ہے کہ میں ان خزانوں کی پوری طرح حفاظت کرسکتا ہوں اور کروں گا اور خرچ کے مواقع سے بھی پوری طرح واقف ہوں کہ کون مستحق ہے اور کون نہیں تاکہ مستحق پر خرچ ہو اور خرچ کی مقدار بھی میں جانتا ہوں۔

اس سے مفسرینؒ نے لکھا ہے جو شخص عدل قائم کرنے اور شرعی احکام نافذ کرنے کی قدرت اپنے اندر پائے تو اس کے لیے طلب ولایت جائز ہے،بل کہ بقول بعض،بعض حالات میں واجب ہے (معارف القرآن ۵/۸۸۔روح المعانی ۱۳/ ۹)۔

سوال یہ ہے کہ بہت سی روایات میں طلب ولایت کی مذمت وارد ہے پھر یوسف علیہ السلام کی یہ طلب کیسے درست ہوگی؟ تو مفسرین نے تمام روایتوں کو جمع کرنے کے بعد جواب دیا ہے کہ مذمت دنیوی غرض سے طلب کرنے میں ہے مثلاً: حب جاہ اور ولایت کا غیر شرعی استعمال۔اگر شرعی طریقہ پر ہو یعنی رضاء الٰہی اور شرعی احکام کے اجراء کے لیے ہو تو نہ صرف جائز ہے بل کہ مستحسن ہے۔

ائمہ حضرات اس مضمون پر توجہ فرمائیں کہ ایک غیر عہدے دار کو شریعت نے اس لیے طلب ولایت کی اجازت دی ہے تاکہ وہ عدل وغیرہ احکام لوگوں میں جاری ونافذ کرے

۔اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ عہدے دار اگر اس عہدے پر برقرار رہنا چاہے تو اسے عدل سے کام لینا ہوگا لہٰذا ائمہ حضرات کو چاہیے کہ آپس کے معاملات میں امیر وغریب، چھوٹے بڑے عزت دار غیر عزت دار میں امتیاز نہ برتیں بل کہ ان میں جو جو بھی شرعی احکام ہوں انہیں ان میں شرعی طور پر رائج کریں۔

معارف القرآن میں حضرت **مفتی محمد شفیع صاحب**ؒ نے لکھا ہے کہ انصاف قائم کرنا اور اس پر قائم رہنا صرف حکومت اور عدالت کا فریضہ نہیں بل کہ ہر انسان اس کا مکلف ہے کہ وہ خود بھی انصاف پر قائم رہے اور دوسروں کو بھی انصاف پر قائم رکھنے کی کوشش کرے۔ انصاف کا مطالبہ صرف دوسروں سے ہی نہ ہو بل کہ اپنے نفس سے بھی ہونا چاہیے، اپنے نفس کے خلاف کوئی بیان یا اظہار کرنا پڑے تو بھی حق وانصاف کے خلاف کچھ نہ بولے اگر چہ اس کا نقصان خود کی ذات پر پڑے ''وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ ''۔

مفتی صاحبؒ نے لکھا ہے کہ بعثت انبیاء اور تنزیل کتب سماویہ کا سارا نظام انصاف ہی کے لیے کھڑا کیا گیا ہے۔ دنیا میں انبیاء علیہم السلام کو بھیجنے اور آسمانی کتابوں کو اتارنے کا اصل مقصد عدل وانصاف قائم کرنا ہے ''لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ'' (سورۃ الحدید ۲۵)۔ (معارف القرآن ۲/۵۷۱)۔

سورۃ نساء کی آیت ''وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ'' کے تحت روح المعانی میں لکھا ہے کہ دو بچوں نے کاغذ پر کچھ تحریر کیا اور اس بات میں فیصلہ کے لیے کہ کس کی تحریر عمدہ ہے؟ انہوں نے حضرت حسن بن علیؓ کو حکم بنایا تو حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ سے فرمایا اے بیٹے تم فیصلہ میں برابر غور کر لو اس لیے کہ یہ ایسا فیصلہ ہوگا جس کے بارے میں روز قیامت میں تم سے اللہ تعالیٰ سوال کریں گے۔ اور مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی موقع

پر حضرت علیؓ سے (اس طرح کے مسئلہ میں) فرمایا دونوں فریق میں نظر و نگاہ کرنے میں اور کلام وگفتگو کرنے میں برابری قائم رکھنا۔ یعنی دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھنا اور دونوں سے کلام بھی یکساں درجہ کا کرنا فرق نہ کرنا (روح المعانی ۸۵/۵)۔

(۴) کسی بھی عہدہ کے لیے دستور العمل

قرآن کریم نے ''منصب نبوت پر فائز'' انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے جن اوصاف کا جابجا ذکر کیا ہے ان میں امانت داری اور خیر خواہی کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں اوصاف ان میں علی وجہ الکمال والاتم پائے جاتے تھے۔ مطلب یہ کہ وہ احکام خداوندی اور پیغامات الٰہی کے پہونچانے میں کامل طور پر امین وصادق اور ناصح ہوتے تھے ذرہ برابر خیانت نہیں کرتے تھے اور مخلوق خداوندی کے حق میں پورے طور پر وہ مشفق وخیر خواہ ہوتے تھے۔ لہٰذا دیگر عہدہ داروں میں بھی ان اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔ جس کی تفصیل آگے مذکور ہے۔

چناں چہ کتب عقائد میں بھی انبیاء علیہم السلام کی ان صفات کی اہمیت اور ان کی غرض کو بیان کیا گیا ہے تا کہ ان کے نائبین بھی ان اوصاف کے حامل ہوں۔ '' كُلُّهُمْ كَانُوْا مُخْبِرِيْنَ مُبَلِّغِيْنَ عَنِ اللهِ تَعَالٰى صَادِقِيْنَ نَاصِحِيْنَ لِلْخَلْقِ لِئَلَّا تَبْطُلُ فَائِدَةُ الْبَعْثَةِ وَالرِّسَالَةِ خُصُوْصًا فِيْمَا يَتَعَلَّقُ بِاَمْرِ الشَّرَائِعِ وَتَبْلِيْغِ الْاَحْكَامِ وَاِرْشَادِ الْاُمَّةِ (شرح عقائد ۱۰۲)۔

قرآن کا ارشاد ہے۔ ''أُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِيْنٌ '' (اعراف ۶۸) ۔ میں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہونچاتا ہوں اور میں تمہارے لیے خیر خواہ اور امانت دار ہوں ۔ اس طرح کے مختلف الفاظ بہت سے نبیوں کے واقعات میں مذکور ہیں۔ امام الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں ہے '' وَانتُمْ تُسْئَلُوْنَ عَنِّيْ فَمَا اَنتُمْ قَائِلونَ قَالُوْا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ

بلَّغتَ وَ اَدَّیتَ وَنَصَحْتَ" (مشکوۃ ۲۲۵) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ (قیامت کے روز) میرے متعلق تم سے پوچھا جائے گا کہ میں نے تم کو دین پہونچادیا؟ تو تم کیا جواب دو گے تو صحابہؓ نے فرمایا آپ نے دین (پورا پورا) پہونچادیا اور جو امانت تھی (دین کی شکل میں) وہ ادا کردی اور (دین پہونچانے میں) خیر خواہی بھی کی۔ اب آیئے معلوم کرتے ہیں کہ کسی بھی عہدے کے لیے دستور العمل کیا ہو؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "قَالَتْ إِحْدَاهُمَا يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ" (قصص ۲۶)۔ ان دونوں میں سے یعنی شعیب علیہ السلام کی دو بیٹیوں میں سے ایک بولی اے ابا جان اس کو یعنی موسیٰ علیہ السلام کو نوکر رکھ لیں بلاشبہ بہتر نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں وہ ہے جو طاقتور ہو امانت دار ہو۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ میں شعیب علیہ السلام کو ان کی صاحب زادی جو مشورہ دے رہی ہے اس کی دلیل یہ بیان کر رہی ہے کہ بہترین اجیر وہ ہے جو قوی ہو اور امین بھی۔

قوی سے مراد اس کام کی قوت وطاقت والا ہونا ہے جو اس کے سپرد کیا جائے یعنی وہ اس کا ماہر ہو۔ اور امین سے مراد یہ ہے کہ اس کی زندگی کے سابقہ حالات اس کی امانت داری اور دیانت داری پر شاہد ہوں۔ (معارف القرآن ۶/۱۰۷، ۶۳۰)۔

چوں کہ امامت بھی ذمے داری کا ایک اہم عہدہ اور اہم منصب ہے۔ اس لیے ائمہ کرام کو بھی آیت شریفہ کی تفسیر کے بموجب اپنی امامت میں ماہر و امانت دار ہونا چاہیے۔ یہ وہ صفات ہیں جن کا ہر عہدے دار میں پایا جانا شرط ہے۔ جیسا کہ معارف القرآن میں حضرت مفتی صاحبؒ نے یہ عنوان قائم کر کے (عہدہ سپرد کرنے کے لیے دو اہم شرطیں ہیں) ان کا ضروری

ہونا بتلایا ہے۔ اور صفحہ ۱۰۷ پر عنوان قائم کیا ہے ''کسی کو کوئی عہدہ اور ملازمت سپرد کرنے کے لیے بہترین دستور العمل''۔

ان مذکورہ دو صفات (قوت وامانت) کا دعوی تخت بلقیس کے لانے والے عفریت جنّ نے بھی کیا تھا'' قَالَ عِفْرِيتٌ مِنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ وَإِنِّي عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ أَمِينٌ ''(نمل ۳۹) جب حامل تخت (یعنی منبر کے لانے والے) میں طاقت وامانت کی صفات ضروری ہیں تو صاحب منبر (ائمہ حضرات) میں تو ان دونوں کا ہونا بطریق اولیٰ ضروری ہوا۔

امامت میں قوت مہارت اور امانت وخیر خواہی

آیت مذکورہ میں قوی ہونے یعنی مہارت کا ذکر ہے کیوں کہ کسی بھی شعبہ کے کاموں کو بکمالہ انجام دینے اور باحسن وجوہ پایہ تکمیل کو پہنچانے کے لیے اس شعبہ کے جملہ امور سے واقفیت اور اس کی مہارت ضروری ہوتی ہے۔ جتنا کام ضروری ہوتا ہے اتنی اس کی مہارت ضروری ہوتی ہے۔ جب کوئی کام مہارت سے کیا جاتا ہے تو وہ صحیح بھی ہوتا ہے اور موثر بھی اور مقدار میں زیادہ بھی۔

امام کے ماہر ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں کہ وہ جہری الصوت اچھے لہجہ والا اور مسائل سے واقف ہو۔ ماہر کا مطلب یہ ہے کہ اسے اپنے اور اپنے مقتدیوں کے احوال پر خوب توجہ حاصل ہو اور اس کی فکر حاصل ہو کیوں کہ بعض دفعہ توجہ نہ ہونے کی وجہ سے مسائل کے ماہر ائمہ سے بھی غلطیاں صادر ہوتی ہیں۔ لہٰذا ماہر وہ ہے جو خود کی بھی فکر رکھے اور مقتدیوں کی بھی فکر رکھے اپنی بھی اصلاح کرتا رہے اور مقتدیوں کی بھی گاہ گاہ اصلاح کرتا رہے بے فکر ماہر نہیں ہوتا۔

آج سے تقریباً ۴۰ سال پہلے جو ائمہ امامت کرتے ان کا حال یہ ہوتا کہ بستی کا امام مقتدیوں کے پورے دین وایمان، عقائد واعمال کی خبر رکھتا، وہ صرف نمازوں کا ہی امام نہ ہوتا بل کہ وہ اس کے ساتھ معلم ومبلغ بھی ہوتا اور قاضی وفیصل اور چودھری بھی۔ وہ آبادی کے دینی تمام کاموں میں پیشوا ہوتا آبادی پوری اس پر فدا ہوتی اس کی پوری طرح اطاعت کرتی، مقتدیوں کو بھی اپنے امام پر پورا اعتماد ہوتا، وہ اس کو اپنا حقیقی امام تسلیم کرتے۔ وہ زندگی کی پوری لگام امام کے ہاتھ میں دیدیتے حتی کہ اس کی ایک آواز پر قوم میں آنے والی برائی یا رسم رک جاتی یا نکل جاتی اور قوم یکسر اس برائی کو چھوڑ دیتی یہ ہے مہارت۔

امامت میں جس طرح مہارت ضروری ہے اسی طرح خیر خواہی اور امانت داری بھی ضروری ہے۔

قرآن شریف میں کئی جگہ اس مذکورہ خیر خواہی اور امانت داری کا ذکر مختلف نبیوں کی صفات بتاتے ہوئے کیا گیا ہے۔ جس کا ذکر قریب میں گذر چکا ہے۔

خلاصہ جس کا یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی دعوت وتبلیغ میں انتہائی ناصح بھی ہوتے ہیں اور امین بھی، اس میں ان کی کوئی ذاتی اور فاسد غرض نہیں ہوتی۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی خاص الخاص صفت ہے۔

لہٰذا وارثین انبیاء علماء وائمہ حضرات کو بھی اپنی تعلیم وتبلیغ میں اور پند ونصائح اور اصلاح وتربیت کرنے میں حقیقی معنی میں ناصح بھی ہونا چاہیے، اور حقیقی معنی میں امین بھی۔ کیوں کہ باطل بھی اچھائی ہی کے روپ میں آتا ہے، بل کہ ناصح وامین کے روپ میں بھی آتا ہے۔ ’’وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ ‘‘۔ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لیے خیر

خواہی کا روپ اختیار کر کے نصیحت کی تھی ''اِنِّیْ لَکُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ'' بل کہ برادران یوسف نے اپنے والد کو فریب میں ڈالنے کے لئے اسی خیر خواہی کا سہارا لیا تھا ''اِنَّا لَہٗ لَنٰصِحُوْنَ''۔ لیکن یہ خیر خواہی حقیقی نہیں تھی۔ آپ کو کیا بتاؤں موجودہ زمانے میں بھی لوگ اپنے دشمن سے بدلہ لینے کے لیے سہارا دشمنی کو نہیں بناتے کیوں کہ اس سے صحیح طور پر بدلہ نہیں لیا جاسکتا بل کہ (ظاہری) خیر خواہی کو سہارا بناتے ہیں۔

لہٰذا ائمہ حضرات یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ منصب امامت یہ اللہ ورسول کی جانب سے آپ کے پاس قوم کی امانت ہے لہٰذا قوم کی سچی خیر خواہی کے ساتھ صحیح صحیح راہ نمائی کرنا، درست طور پر امامت کرنا، مقتدیوں کی اذان، نماز، جماعت، قراءت قرآن اور وضوء وغیرہ میں ان کی کوتاہیوں سے حکمت سے باخبر کرنا اور ان کو آخرت کے خسارے سے بچانا یہ سب ہی اس امانت میں شامل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی راستوں سے اپنی ایک امت بنائی، ائمہ کو چاہیے کہ وہ ان راستوں سے امت بنائیں۔

امامت کبریٰ کے امام ''حاکم وقت'' کے لیے بھی حسب بیان کتب عقائد ان مذکورہ اوصاف کو ضروری قرار دیا گیا ہے جن کے بغیر وہ مستحق امامت نہیں ہوتا۔ مثلاً: اس کا امین وناصح ہونا، لوگوں کے اخلاق واعمال کی اصلاح کرنے والا اور اسلام کی نشر واشاعت کرنے والا ہونا وغیرہ۔

اور یہ بھی مذکور ہے کہ لوگوں پر ان اوصاف سے متصف امام کی ہی اتباع اور خیر خواہی لازم ہے ورنہ جو خائن ودھوکہ باز ہو اور خیر خواہ نہ ہو تو نہ اس کی اتباع ضروری نہ خیر خواہی۔

بس اس طرح امامت صغریٰ کے امام کے لیے بھی یہ اوصاف ضروری ہیں۔ کیوں کہ آخر یہ بھی اسی کی شاخ ہے، دونوں رشتۂ اخوت رکھتے ہے۔۔۔ ''وَالْمُسْلِمُوْنَ لَا بُدَّ لَھُمْ مِنْ اِمَامٍ ۔۔۔ کَانَ مُشْفِقًا عَلَی الْمُسْلِمِیْنَ ۔۔۔ وَھُوَ یُرِیْدُ اِعْلَاءَ کَلِمَۃِ الْاِسْلَامِ ۔۔۔ وَمَنْ لَّمْ یَکُنْ

کَذٰلِكَ فَهُوَ لَيْسَ بِاِمَامٍ حَقٍّ فَلَا يَجِبُ اِعَانَتُهٗ وَلَا نَاصِحَ لَهُمْ "۔ (نبراس شرح شرح عقائد ۵۱۳)۔

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دین نصیحت ہے یعنی دین نصیحت وخیر خواہی کا نام ہے۔ ہم نے پوچھا کس کی (نصیحت) ؟ تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی اور اس کی کتاب کی اور اس کے رسول کی اور مسلمانوں کے ائمہ (قائدین) کی اور عام مسلمان کی (مسلم شریف کتاب الایمان ۵۴)۔

مذکور حدیث گرامی کتنی اہم ہے اسے ملاحظہ فرمائیں۔ بقول بعض علماء یہ حدیث شریف چوتھائی دین پر اور بقول بعض کل دین پر مشتمل ہے۔ بل کہ امام نودی رحمہ اللہ تعالیٰ تو یوں فرماتے ہیں "بَلِ الْمَدَارُ عَلٰی هٰذَا وَحْدَهٗ"۔

حدیث گرامی کی ضروری تشریح۔ یہ ہے کہ اس میں گویا سلطان الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے جملہ طبقات کو تحفظ دین اور اس کی ترقی کی بنیاد سے آگاہ کیا ہے۔ کہ تحفظ دین اور اس کی ترقی کی بنا ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی کرنے اور ہر ایک کے ساتھ علی حسب المراتب حقوق ادا کرنے پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کے دل میں اگر دوسروں کی خیر خواہی ہے تو آپ کا دین محفوظ ہے۔

لفظ نصیحت ہر قسم کی دینی ودنیوی خیر خواہی اور بھلائی کو شامل ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ ہر قسم کی خیر وبھلائی اختیار کریں، ادنیٰ بھلائی کو بھی معمولی نہ سمجھیں۔

رہی بات کہ مسلمانوں کے ائمہ سے کون مراد ہیں؟ تو علمائے اسلام فرماتے ہیں کہ اس سے ائمہ دین مراد ہیں جو دو طرح کے اور دو قسم کے ہیں۔

ایک تو امام دنیوی (بادشاہ)۔ اور دوسرا امام دینی (امام صلوٰۃ) بتفصیل امامت کبریٰ وصغریٰ۔

علمائے اسلام فرماتے ہیں کہ دنیوی امور کا سربراہ چاہے وہ ملک کا سربراہ ہو جیسے بادشاہ وزیر یا ضلع وتحصیل اور گاؤں کا۔ ہرایک کی اطاعت اور خیر خواہی لازم ہے۔لیکن ان شرائط کے ساتھ جو عندالشرع ملحوظ ہیں۔تا کہ ملک وریاست اور شہر وقریہ دینی ودنیوی ترقی کرسکیں، ورنہ ترقی ممکن ہی نہیں۔ مذکورہ تفصیل سے جہاں یہ معلوم ہوگیا کہ دنیوی امام کی خیر خواہی واطاعت لازم ہے وہاں یہ بھی واضح ہوگیا کہ دینی امام کی بھی خیر خواہی واطاعت لازم ہے۔

دینی ائمہ کی نصیحت وخیر خواہی کا مطلب

علمائے اسلام (ائمہ مساجد بھی) انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہیں اس وجہ سے وہ بھی احیاء دین اور احیاء سنت وشریعت کی محنت کرتے ہوئے لوگوں کے پاس جاتے ہیں اور عقائد حقہ اور اوامر شرعیہ کی تبلیغ کرتے ہیں جو ان کا وظیفۂ حیات ہے تو ان کی خیر خواہی شرعاً لازم ہے۔ان کی خیر خواہی یہ ہے کہ ان کا کامل احترام کیا جائے ان کی تبلیغ کردہ دینی باتوں کو کما حقہ قبول کیا جائے اور اشاعت دین میں ان کا ہر لحاظ سے تعاون کرکے ان کا بازو ہُوا جائے۔

اور عام مسلمانوں کی نصیحت وخیر خواہی یہ ہے کہ دنیا وآخرت کے مفید کاموں اور باتوں میں ان کی راہ نمائی کی جائے اور جزبہ ترحم وشفقت کے ساتھ انہیں دین وشریعت پر جمایا جائے اور ہر قسم کی مضرتوں سے انہیں بچایا جائے۔کیوں کہ یہی وراثت نبوی ہے۔

عالم ایک چوہے کے بارے میں امانت دار نہیں

صفت امانت کا ذکر اوپر گزرا اس صفت کے متعلق ایک دلچسپ اور سبق آموز واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔اسے پڑھیے اور عبرت کا سامان حاصل کیجیے۔شیخ ابو یعقوب یوسف رازی رحمہ اللہ تعالی مشائخ صوفیہ میں سے ہیں، علم حدیث وتصوف دونوں کے جامع تھے۔تصوف

میں ذوالنون مصری رحمہ اللہ تعالیٰ کے اور علم حدیث میں امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے تربیت یافتہ اور تلمیذ تھے۔

ان کا بیان ہے کہ مجھے پتہ چلا کہ ذوالنون رحمہ اللہ تعالیٰ کو اسم اعظم معلوم ہے اسے حاصل کرنے میں ان کی خدمت میں پہونچا۔ میری ظاہری ہیئت کو دیکھ کر انہوں نے میری طرف کوئی توجہ نہ کی، میں چند دن ان کی بے توجہی کے باوجود ان کی خدمت میں رہا، اتفاق سے ایک دن ان کے یہاں علم کلام کا ایک ماہر عالم آ پہنچا اور ان سے فلسفیانہ انداز میں عقلی بحث کرنے لگا، جس میں ذوالنون رحمہ اللہ تعالیٰ کو ناکامی ہوئی وہ اس متکلم عالم کے سامنے معتبر دلائل پیش نہ کر سکے۔ یہ دیکھ کر میں نے اس عالم کو دعوت مناظرہ پیش کی چناں چہ میں نے اس کو مناظرہ میں لاجواب کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد ذوالنون رحمہ اللہ تعالیٰ کو میرا علمی رتبہ معلوم ہوا تو اٹھ کر مجھ سے معانقہ کیا اور ابتک کی بے توجہی پر معذرت کی بل کہ باوجود وہ بوڑھے اور میں جوان تھا میرے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد ایک سال تک ان کی صحبت میں اکتساب فیض حاصل کرتا رہا، تو میں نے ان سے اسم اعظم معلوم کرنا چاہا لیکن وہ خاموش ہی رہے۔ البتہ مجھے ان کے طرز سے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے بتائیں گے مگر اس کے بعد بھی ٦ ماہ تک ان کے پاس رہا لیکن اس کے متعلق کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

ایک دن گھر سے ایک طباق لائے جس پر رومال ڈالا ہوا تھا اور وہ بند تھا پھر مجھ سے پوچھا کہ فسطاط شہر میں ہمارے فلاں دوست ہیں کیا تم ان کو جانتے ہو؟ میں نے کہا جی ہاں جانتا ہوں۔ فرمایا یہ ہدیہ ان کو پہونچادو۔ میں اس طباق کو لے کر چلا اور راستہ بھر سوچتا رہا کہ اس میں کیا چیز ہوگی؟ آخر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے اسے کھولا تو ایک چوہا کود کر نکل بھاگا، یہ تماشا دیکھ کر مجھے ذوالنون رحمہ اللہ تعالیٰ پر سخت غصہ آیا کہ انہوں نے میرے ساتھ یہ کیا مذاق کیا! کہ

میرے ساتھ چوہا بھیجنا چاہامیں اسی حال میں واپس چلا آیا۔

ذوالنون رحمہ اللہ تعالیٰ میری صورت دیکھ کر ہی معاملہ سمجھ گئے اور فرمایا'' یا احمقُ اِنّما جرّبْنَاكَ.. '' اے ناسمجھ ہم نے تم کو آزمانا چاہا کہ کیا ہم تمہیں ایک چوہے کے بارے میں امانت دار پاسکتے ہیں؟ لیکن تم نے تو اس میں خیانت کی پھر ہم تم کو اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کے بارے میں کس طرح امانت دار سمجھیں؟ صاحب مقالہ قاضی اطہر مبارک پوریؒ فرماتے ہیں: کہ شیخ یوسف رازی حکمت وفلسفہ میں بازی مارنے کے باوجود ایک مرد کامل کی نظر میں اس قابل نہیں تھے کہ ایک چوہے کی امانت کو صحیح وسالم پہونچا سکیں۔ اس واقعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بسا اوقات علم میں پختگی اور کمال کے باوجود اخلاقی وروحانی کس قدر خامی ہوتی ہے (ماہنامہ البلاغ بمبئی جلد ۲۶ شمارہ ۱۰، ۱۹۷۶ء)۔

اس پوری تفصیل سے ہم ائمہ حضرات کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے مقتدیوں کو عقائد حقہ اور صراط مستقیم اور اعمال دینیہ کی راہ نمائی میں مکمل امانت داری سے کام لیں اس میں خیانت سے اپنے کو بچائیں۔ ورنہ روز قیامت میں سخت مواخذہ ہوگا اور نجات کی کوئی راہ نہ ہوگی۔ اب تک جو بھی خیال رہا ہو لیکن اس تفصیل کے بعد عقل سلیم اور طلب صادق سے علم صحیح حاصل کر کے خود سے اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے راستے پر چل کر مقتدیوں کو بھی اس کی راہ نمائی کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں۔ چوں کہ رزق کے بارے میں حلال کو چھوڑ کر غیر حلال کو اختیار کرنا اور تقویٰ کو چھوڑ کر مشتبہ کو اختیار کرنا خیانت کی قسم سے ہے اسی مناسبت سے اگلے عنوان کو غور سے پڑھیں۔

علماء اگر مشتبہ مال کھائیں تو۔۔۔

فقیہ ابواللیث سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ الغافلین میں لکھا ہے کہ کسی نے کیا عمدہ

بات کہی ہے: اگر علماء حلال مال کھائیں تو عوام مشتبہ مال کھانے لگیں گے۔ اور اگر علماء مشتبہ مال کھائیں تو عوام حرام مال کھانے لگیں گے۔ اور اگر خدانخواستہ علماء حرام مال کھانے لگیں تو عوام ایمان سے کفر کی طرف جانے لگیں گے۔ کیوں کہ وہ یہ سمجھنے لگیں گے یہ حلال ہے تب ہی تو علماء اسے کھا رہے ہیں اور حرام کو حلال سمجھنا کفر کی بات ہے۔ اور شاذ و نادر ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی بدنصیب علماء کے حرام مال کھانے سے ان سے بدظن ہوکر ایمان چھوڑ بیٹھے۔ (از روضۃ الصالحین ۳/ ۳۵)۔

حدیث شریف میں ہے "الحلالُ بیّنٌ وَالحرامُ بیّنٌ وَبَیْنَہُمَا مُشتبِہاتٌ۔ (مشکوۃ ۲۴۱)۔ حلال واضح ہے اور حرام (بھی) واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ (چیزیں) ہیں۔ یعنی کچھ چیزیں وہ ہیں جن کا حلال ہونا سب کو معلوم ہے کہ یہ یہ چیزیں حلال ہیں اسی طرح کچھ چیزیں وہ ہیں جن کا حرام ہونا بھی سب کو معلوم ہیں کیونکہ وہ سب نص قطعی سے ثابت ہیں۔ مثلا شراب، زنا، سود وغیرہ۔

لیکن کچھ چیزیں وہ ہیں جن کی حرمت وحلت کے دلائل معارض ہیں ایسی چیزوں کو مشتبہ کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ مجتہدین کے یہاں کوئی حکم واضح نہیں ہوتا بل کہ اس میں اشتباہ ہوتا ہے کہ یہ حرام ہو یا حلال۔ ایسی چیزوں کے بارے میں بقول راجح حکم یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ نہ وہ حلال ہیں نہ حرام نہ مباح۔ اس کو اس طرح سمجھیں مثلا کسی شخص کے پاس کچھ روپئے حلال کے ہیں لیکن اس کے پاس دوسرے کچھ روپئے حرام کے بھی ہیں اور وہ مخلوط ہیں تو ان مخلوط کو مشتبہ مال کہیں گے۔ لہٰذا ایسا شخص اگر ہدیہ دے یا دعوت دے تو بہتر یہ ہے کہ ان کے قبول کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

رزق کے متعلق بڑی دل چسپ بات شیخ علی متقی رحمہ اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ

حصول رزق کے متعلق احکام شرعیہ کی ترتیب اور اس کے درجات یہ ہیں۔

روزی حاصل کرنے کا اول درجہ لازم کا ہے۔۔۔ دوسرا درجہ مباح کا۔۔۔ تیسرا مکروہ کا۔۔۔ چوتھا حرام کا۔۔۔ اور پانچواں کفر کا۔

یعنی روزی کی اتنی مقدار حاصل کرنا جتنی ضرورت ہے لازم ضروری ہے اور ضرورت میں اپنی ذاتی ضرورت (کھانا پینا، کپڑے، مکان) اور بیوی بچوں کا نفقہ داخل ہے۔ ضرورت سے زائد کمانا مباح ہے جب کہ نیت اپنی شان وشوکت اور اپنے وقار کی حفاظت ہو۔ ضرورت سے زائد کمائے اور مال ودولت جمع کرنے سے نیت فخر وتکبر کا اظہار ہو تو یہ حرام ہے۔ اگرچہ حلال ذرائع سے کمائے۔

خیر یہاں شیخ علی متقی کی بات یہ بتانا ہے کہ جب بندہ ضرورت پر اکتفا کر لیتا ہے تو اس کی عزت باقی رہتی ہے اور ہر خطرے سے سالم رہتا ہے۔ مگر جب حد ضرورت سے گزرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ حد مباح میں داخل ہو جاتا ہے اور حد مباح پر بھی قناعت نہیں کرتا اور آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو حد مکروہات میں داخل ہو جاتا ہے یہاں تک کہ حرص وہوس حد مکروہات سے نکال کر محرمات کی حد میں داخل کر دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا اگلا قدم حد کفر میں پہنچ جاتا ہے!!۔ نعوذ باللہ من ذلك (مظاہر حق ۴/ ۴۴۳، ۴۴)۔

اس کے برخلاف رزق حلال کی اہمیت پر کتابوں میں لکھا ہے کہ دعا کے دو پر ہیں جن سے وہ پرواز کر کے قبولیت کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے ایک رزقِ حلال اور دوسرا صدقِ مقال۔۔۔

حضرت شیخ زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے لیے اس بات کی دعا کر دیں کہ حق تعالیٰ شانہ مجھے ''مستجاب الدُعا'' بنا دے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی روزی کو پاکیزہ بنالو مستجاب الدعا بن جاؤ گے!! (فضائل صدقات ۳۹۴)۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صاحب نور اللہ مرقدہ اور دیگر اکابر علماء دیوبند کے زمانے میں ایک صاحب تھے۔ غالباً ان کا نام بابا عبداللہ شاہ تھا اور وہ گھسیارے تھے، گھاس کاٹا کرتے تھے اور گھاس کاٹ کر بازار میں بیچا کرتے تھے۔ اور ان کا طریقہ یہ تھا کہ اتنی گھاس کاٹ لیا کرتے جس سے روزانہ ایک آنہ آمدنی ہوجایا کرے۔ اور انہوں نے پھر ایک آنہ کے حصے متعین کیے ہوئے تھے۔ ایک پیسہ اللہ کے راستے میں خرچ کردیتے تھے، ایک پیسہ جمع کرلیتے تھے اور دو پیسے اپنے اور اپنے گھر والوں پر خرچ کردیتے تھے۔ اور جو ایک پیسہ جمع کرلیتے تھے جمع کرنے کے بعد جب کچھ رقم جمع ہوجاتی تو بڑے علماء کو کھانے پہ بلالیا کرتے تھے۔ سیدھا سادہ کھانا بل کہ سادہ چاول پکا کے ان کو کھلا دیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمیں ان کی دعوت کا انتظار لگا رہتا تھا کہ کب وہ ہماری دعوت کریں۔ اور فرماتے تھے کہ جب ہم ان کا کھانا کھالیتے تھے تو چالیس دن تک ہمیں اپنی طبیعت میں اس کا اثر محسوس ہوتا تھا۔ اللہ جل شانہ کی عبادت کی طرف رغبت ہوتی تھی، نیکیوں کی طرف توجہ ہوتی تھی گناہ اور وساوس سے حفاظت رہتی تھی۔

اب بتایئے کہ گھاس بیچ کر پیسے کمائے گئے۔ اس سے علماء کی دعوت کی گئی مگر مقصد حلال رزق تھا، مقصد اللہ جل شانہٗ کی رضا تھی۔ اس لیے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جو کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نورہ اللہ مرقدہ کے بھی استاذ ہیں فرماتے ہیں، اس دعوت میں وہ نور تھا کہ چالس دن ہمارے اوپر انوار کی ایک عجیب کیفیت رہتی تھی (تحفۃ الائمہ ۱۹۱)

ایک خلیفہ کا سبق آموز واقعہ

شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں کہ

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ایک بڑے خلیفہ تھے جنہیں آپ نے خلافت عطا کر رکھی تھی۔ ایک مرتبہ اپنے بچے کے ساتھ حضرت کے پاس آئے۔ حضرت نے پوچھا ابھی آپ کاہے سے تشریف لائے؟ انہوں نے بتایا ریل سے، حضرت نے پوچھا اس بچہ کا ٹکٹ پورا لیا تھا یا آدھا؟ انہوں نے جواب دیا آدھا، حضرت نے پوچھا اس کی عمر کیا ہے؟ کہا کہ بچہ تو ویسے تیرہ سال کا ہے لیکن دیکھنے میں بارہ سال کا لگتا ہے اس لیے آدھا ٹکٹ لیا تھا۔ یہ سن کر حضرت کو سخت رنج ہوا اور ان سے خلافت واپس لے لی، اور فرمایا مجھ سے غلطی ہوگئی، تم اس لائق نہیں کہ تمہیں خلافت دی جائے اس لیے کہ تمہیں حلال وحرام کی فکر نہیں۔

حضرت مفتی صاحب اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ آپ اندازہ لگائیں کہ خانقاہ میں پیر صاحب اپنے مرید سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ بچے کا ٹکٹ پورا لیا تھا یا آدھا۔ جب کہ دوسری خانقاہوں میں یہ سوال کرنے کا تصور ہی نہیں کیوں کہ وہاں تو یہ سوال ہوتا ہے کہ معمولات (نفلی) پورے کیے تھے یا نہیں؟ تہجد کی نماز پڑھی تھی یا نہیں، اشراق کی نماز پڑھی تھی یا نہیں؟

حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے آکر کہتا کہ حضرت معمولات ترک ہوگئے ہیں تو حضرت فرماتے معمولات ترک ہوگئے ہیں تو استغفار کرو اور ہمت سے کام لو اور شروع کر دو آئندہ ترک نہ ہوں۔ معمولات ترک ہونے سے کبھی خلافت واپس نہیں لی، لیکن حلال وحرام کی فکر نہ کرنے پر خلافت واپس لے لی۔ حضرت علامہ تھانویؒ فرماتے لوگ خانقاہوں میں ذکر وشغل سیکھنے کے لیے جاتے ہیں اگر ذکر وشغل سیکھنا ہے تو دوسری بہت ساری خانقاہیں کھلی ہوئیں ہیں وہاں چلا جائے ہمارے یہاں تو آدمی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور شرعی احکام پر عمل پیرا ہونے کی فکر پیدا کی جاتی ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۱/۲۷۳)۔

(۵) خشیت الٰہی ائمہ (علماء) حضرات کا لازم وصف

آدمی جب کسی سے بالکل ناواقف ہوتو اس سے خوف کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔مثلاً آپ سانپ یا بجلی کا کھلا تار دیکھیں گے تو ڈر جائیں گے۔ کیوں کہ آپ سانپ اور بجلی کو جانتے ہیں ۔لیکن ناسمجھ بچہ اگر ان کو دیکھے گا تو وہ نہیں ڈرے گا، بل کہ بہت ممکن ہے کہ ان کو پکڑ لے کیوں کہ وہ ان کو نہیں جانتا۔

بس اسی طرح جو شخص (بذریعہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی، اس کی قدرتوں اور اس کی صفات) اللہ تعالیٰ سے واقف ہوگا وہ ضرور ڈرے گا۔ حتیٰ کہ جو جتنا زیادہ واقف ہوگا اتنا زیادہ ڈرے گا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی کبریائی وعظمت کا علم ہو اور اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرے ۔قرآن کریم نے یہی بات سمجھائی ہے۔ ’’اِنَّمَا یَخْشَی اللہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ‘‘ (فاطر ۲۸)۔ معلوم ہوا خوف وخشیت علم پر مرتب ہیں بغیر علم کے خشیت حاصل نہیں ہوسکتی۔

اشکال وجواب

اگر یہ سوال ہو کہ بہت سے ان پڑھ اور جاہلوں میں خدا کا خوف ہوتا ہے، اس کے برخلاف بعض علماء میں نہیں ہوتا جو آیت شریفہ کے خلاف ہے؟ (۱) جواب یہ ہے کہ آیت میں ’’انما‘‘ کے بارے میں دو قول ہیں۔

ایک یہ کہ وہ حصر کے لیے ہوتا ہے۔ تب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ سے صرف علماء ہی ڈرتے ہیں۔ یہ جمہور مفسرین کا قول ہے۔

دوسرا یہ کہ وہ خصوصیت کے لیے بھی ہوتا ہے اور یہاں اسی کے لیے ہے۔ یہ قول ائمہ تفسیر ابن عطیہ رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ کا ہے۔

تب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا علماء کا وصف خاص ہے۔تو ضروری نہیں کہ یہ وصف غیر عالم میں پایا ہی نہ جائے کیوں کہ خاصہ نہیں ہے نیز غیر سے نفی نہیں کی گئی ہے (معارف القرآن ۷/۷ ۳۳)۔ تو غیر علماء میں بھی خشیت پائی جاسکتی ہے۔

(۲) جواب یہ ہے کہ آیت شریفہ میں علماء سے مراد درس نظامی کی تکمیل کرنے والے علماء نہیں ہیں جس سے اعتراض قائم ہو۔بل کہ مطلق علم سے متصف علماء مراد ہیں جو سبب خشیت ہو۔کیوں کہ جب کبھی کسی کو خشیت حاصل ہوئی تو اس کی وجہ صرف علم ہی رہا ہے چاہے جس درجہ کا علم ہو۔مثلاً: ایک عام آدمی جھوٹ بولنا اور امانت میں خیانت کرنا وغیرہ چاہتا تھا لیکن اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کی سزا کا خیال آگیا اور وہ اس سے رک گیا تو اس کا اتنا علم اس کے لیے وجہ خشیت بن جائے گا۔اس معنی کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو کچھ خشیت ہے اس کی وجہ اپنا علم ہے چاہے وہ جس درجہ کا بھی ہو۔چاہے اب غیر علماء میں ہو اور چاہے عرفی عالم میں نہ ہو۔کیوں کہ لاعلمی اور جہل ہی بے خوفی کا سبب ہے۔

چناں چہ مفسر قرآن حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آیت شریفہ میں علماء سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ جل شانہ کی ذات وصفات کا کما حقہ علم رکھتے ہیں۔ صرف عربی زبان یا اس کے صرف ونحو جاننے والوں کو قرآن کی اصطلاح میں عالم نہیں کہا جاتا۔ اس کے بعد خشیت کے بارے میں بہت سے آثار نقل کئے ہیں۔ان میں سے چند یہ ہیں "لَیْسَ الْعِلْمُ بِکَثْرَۃِ الْحَدِیْثِ وَلٰکِنِ الْعِلْمَ عَنْ کَثْرَۃِ الْخَشْیَۃِ" ۔احمد بن صالح مصریؒ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی خشیت کو کثرت روایت اور کثرت معلومات سے نہیں پہچانا جاسکتا بل کہ اس کو کتاب وسنت کے اتباع سے پہچانا جاسکتا ہے۔حضرت ربیعؒ فرماتے ہیں "مَنْ لَّمْ یَخْشَ فَلَیْسَ بِعَالِمٍ" حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں۔"اِنَّمَا الْعَالِمُ مَنْ خَشِیَ اللہَ" حضرت سعیدؒ فرماتے

ہیں "أَتْقَاهُمْ لِرَبِّهٖ"۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فقیہ کی تعریف یہ کی ہے: کہ فقیہ مکمل فقیہ وہ ہے جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس بھی نہ کرے اور ان کو گناہوں کی چھوٹ بھی نہ دے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ان کو مطمئن بھی نہ کرے اور وہ قرآن کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی طرف رغبت نہ کرے اور بے علم عبادت میں کوئی خیر نہیں اور بے فقہ علم میں بھی کوئی خیر نہیں۔

مفتی صاحبؒ ان کو نقل فرمانے کے بعد لکھتے ہیں کہ مذکورہ تصریحات سے یہ شبہ ختم ہو گیا کہ بہت سے علماء کو دیکھا جاتا ہے کہ ان میں خدا کا خوف نہیں۔ کیوں کہ ان تصریحات سے معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف عربی جاننے کا نام علم نہیں اور ان کے جاننے والوں کا نام عالم نہیں جب کہ ان میں خشیت نہ ہو۔ (معارف القرآن ۳۳۸/۷)۔

دارمی کی روایت ہے حضرت عطا رحمہ اللہ تعالیٰ نقل کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا باری تعالیٰ تیرے بندوں میں سب سے اچھا اور درست فیصلہ کرنے والا آپ کے نزدیک کون ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ جو دوسروں کے حق میں ایسا ہی فیصلہ کرے جیسا اپنے حق میں۔

پھر پوچھا آپ کے بندوں میں سب سے زیادہ غنی کون ہے؟ تو فرمایا وہ جو میری تقسیم پر سب سے زیادہ راضی رہنے والا ہو۔

پھر پوچھا سب سے زیادہ آپ سے ڈرنے والا کون ہے؟ تو فرمایا وہ شخص جو مجھے سب سے زیادہ جاننے والا ہو۔ جیسے کہ روایت میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا "أَنَا أَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ"۔ (روح المعانی ۲۹۸/۲۲)۔

مجدد الملت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہماری حالت یہ ہے کہ علم حاصل

کرتے ہیں پھر پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہوجاتے ہیں اور اسی کو مقصود سمجھ لیتے ہیں اور تحصیل خشیت کا اہتمام نہیں کرتے۔ایسا علم جو خشیت سے خالی ہو علم ہی نہیں۔علم کو میراث انبیاء کہا گیا ہے اب دیکھ لو انبیاء کی میراث کون سا علم ہے۔کیا انبیاء کا علم نعوذ باللہ ایسا ہی تھا جس میں محض مسائل واصطلاحات کا تلقط ہو اور خشیت کا نام نہ ہو ہرگز نہیں۔وہاں تو حالت یہ تھی ’’اَنَا اَعْلَمُکُمْ بِاللّٰہِ وَاَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ‘‘۔اور ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عالم کہتے ہیں متبع سنت کو (اور مولوی کا بھی یہی مطلب ہے) کیوں کہ مولوی میں نسبت ہے مولیٰ کی طرف یعنی مولا والا،سو جب تک وہ اللہ والا ہے اس وقت تک مولوی بھی لائق اتباع ہے ورنہ قابل اتباع نہیں (العلم والعلماء ۳۸،۳۹)۔

جس خوف وخشیت کا ذکر ہوا اس کا تمام لوگوں سے بڑھ کر ائمہ کرام میں پایا جانا ضروری ہے۔قوم کے امام اور قوم کے مقتداء ہونے کا تقاضی یہی ہے کہ ان میں خوف خداوندی دوسروں سے غالب ہو۔

☜ **تَنَبُّه:** حضرت شیخ ابرار احمد دھلیوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مذہب اسلام نے ہر چیز میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔کیوں کہ اعتدال کے دونوں طرف افراط وتفریط مضر ومہلک ہیں۔لہٰذا خوف وخشیت میں بھی اعتدال کی رعایت ہونی چاہیے۔

حدیث شریف میں صلوٰۃ التسبیح کی دعا میں جو قبل السلام پڑھی جاتی ہے خوف کو بھی اللہ تعالیٰ سے حد اعتدال سے مانگا گیا ہے۔وہ جملہ ہے ’’اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مَخَافَةً تَحْجُزُنِیْ عَنْ مَعَاصِیْكَ‘‘ (مرقات ۲۱۷/۳) اے اللہ میں آپ سے اتنا خوف مانگتا ہوں جو مجھے آپ کی نافرمانی سے روک دے۔اسی طرح ایک اور دعا کے الفاظ ہیں ’’اَللّٰھُمَّ اَقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْیَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مَعَاصِیْكَ۔۔۔(مشکوٰۃ ۱۸۳)۔

مثلاً آدمی زنا کرنا یا چوری کرنا چاہتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کا خوف ان سے رکنے کا سبب

بن گیا تو یہ خوف حد اعتدال میں ہے۔ لیکن اگر یہ خوف حد اعتدال سے بڑھ جائے تو یہ ہلاکت کا سبب بن جائے گا کیوں کہ خوف کی زیادتی بعض دفعہ ناامیدی پیدا کر دیتی ہے اور ناامیدی کفر ہے۔ حالاں کہ ایمان نام ہے خوف و امید دونوں کا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اعتدالی خشیت کے زیور سے آراستہ فرمائیں۔ آمین۔

ائمہ، آں حضرت ﷺ کو دیئے گئے چند احکام بغور پڑھیں اور عمل میں لائیں

ابتداء اسلام میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے چند احکام کو اس غرض سے یہاں پیش کیا جاتا ہے، تاکہ ائمہ حضرات نائب ہونے کے ناتے ان کو پڑھ کر اپنے اندر پیدا کریں اور ان صفات سے اپنے کو آراستہ کریں۔

ان صفات کی اہمیت ایک تو بایں وجہ واضح ہوتی ہے کہ یہ صفات براہ راست آپ ہی کو عطا ہوئی ہیں اور دوسری وہ ابتداء اسلام میں عطا ہوئی ہیں۔ اگر چہ ان احکامات میں سے کچھ کا بیان متفرق طور پر قرآن شریف میں مستقلاً بھی ہوا ہے۔ لیکن شروع میں نازل ہونے والی دو سورتوں (مزمل و مدثر) میں یکجا طور پر بیان ہوئے ہیں تاکہ اختصاراً ذہن نشین کر کے عمل کرنا آسان ہو۔ اس لیے قرآنی اس طرز کی موافقت میں ہم انہیں یہاں پیش کرتے ہیں۔ تاکہ ہم حضرات علماء و ائمہ کے لیے ان پر عمل کرنا سہل ہو۔

ان احکامات میں سے سورۃ مزمل کے احکام تو ذاتی اصلاح سے متعلق ہیں اور سورۃ مدثر کے زیادہ تر دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ خلق سے۔ چوں کہ علمائے کرام اور ائمہ مساجد انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں (بوجہ وراثت تبعًا للنبی ﷺ) گویا وہ احکام انہیں بھی عطا کئے گئے ہیں، تاکہ وہ اپنے اندر ان سے کمال پیدا کریں۔

سورۃ المزمل کے احکام یہ ہیں۔

(۱) قُمِ الَّیْلَ۔ رات کو (نماز میں) کھڑے رہا کرو۔ نماز تہجد مراد ہے۔

(۲) وَرَتِّلِ الْقُراٰنَ تَرْتِیْلًا۔ قرآن (شریف) کو خوب صاف صاف پڑھو۔

اصل ترتیل یہ ہے کہ حروف والفاظ کو اچھی طرح ادا کیا جائے، اور پڑھنے والا اس کے معانی پر غور بھی کرے اور اس کا اثر لے۔ حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا گزر ایک قاری قرآن پر سے ہوا جو ایک ایک آیت پڑھ رہا تھا اور رو بھی رہا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنا ہے؟ (یعنی ترتیل سے پڑھنے کا) پھر فرمایا یہی ترتیل ہے (جو یہ شخص کر رہا ہے) (از قرطبی)۔

(۳) وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ۔ پڑھے جا نام اپنے رب کا۔ یعنی اللہ کا ذکر کر۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہ تصور ناممکن ہے کہ آپ ذکر اللہ سے غافل رہیں کہ آپ کو یہ حکم کیا جائے۔ لہٰذا مراد یہ ہے کہ آپ رات و دن ذکر اللہ پر مداومت رکھیں۔

(۴) وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا۔ اور سب سے تعلق قطع کر کے اسی (اللہ) کی طرف متوجہ رہو۔ قطع تعلق سے مراد یہ ہے کہ خالق کا تعلق مخلوقات کے تعلقات پر غالب رہے خواہ اعتقاداً ہو یا عملاً۔

(۵) لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَاتَّخِذْہُ وَکِیْلًا۔ اس کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں تو اسی کو اپنا کارساز بناؤ اور اپنے کام اسی کے سپرد کرو۔ یعنی توکل اور بھروسے کے قابل جس پر بھروسہ کرنے والا کبھی محروم نہیں رہ سکتا صرف وہی ذات ہے۔ جیسے قرآن شریف میں دوسری جگہ ہے وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ۔ جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے سب مہمات ومشکلات کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔

توکل کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توانائی اور قوت اور ظاہری اسباب کو اپنے مقاصد کے لیے عمل میں لایے اور نتیجہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے بے فکر ہوجائے۔ چناں چہ اسی مفہوم کو ذہن نشین کرانے کے لیے آیت بالا میں کارساز بنانے سے پہلے رَبُّ المشرِقِ والمغرِبِ فرمایا گیا ہے کہ جس کو تم نے وکیل بنایا ہے وہ مشرق ومغرب سب کا پروردگار ہے وہ سارے جہاں کی تمام ضروریات پوری کرنے کا کفیل ہے۔

(۶) وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا۔ اور یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو اور اچھے طریقے سے ان سے الگ ہوجاؤ۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ یہاں فرماتے ہیں کہ مقامات سلوک میں یہ سب سے اعلیٰ مقام ہے کہ دشمنوں کی جفا پر صبر کیا جائے حتیٰ کہ انتقام کا ارادہ بھی نہ کیا جائے۔ یہ وہ اعلیٰ مقام ہے جس کو اصطلاح تصوف میں فناء کامل کہتے ہیں جس کے بغیر وہ مقام نصیب نہیں ہوتا۔ اور اچھے طریقے سے جدا ہونا یہ ہے کہ علمۃً جس سے تعلق منقطع کیا جاتا ہے زبان سے اس کی شکایت ہو ہی جاتی ہے تو اس کی قید لگا کر بتلادیا کہ نہ کسی کے سامنے اس کی شکایت ہو نہ انتقام کا ارادہ۔

سورۃ المدثر کے احکام جو اصلاح خلق سے متعلق ہیں

(۱) قُمْ فَاَنْذِرْ۔ کھڑے ہوجایئے اور (لوگوں کو) ڈرایئے۔ انذار شفقت ومحبت سے ڈرانے کو کہتے ہیں جیسے باپ اپنے بچوں کو آگ اور سانپ سے ڈراتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ہمت سے خلق خدا کی اصلاح کی خدمت سنبھالیے۔ (جو منصب نبوت کا مقتضی ہے)۔ تبلیغ وانذار میں سب سے پہلے توحید کی تبلیغ ہے اس کے بعد ضروری عقائد کی پھر ضروری اعمال واخلاق کی تعلیم۔ جن پر خود بھی عامل رہنا چاہیے کیوں کہ تبلیغ کے ساتھ اپنی اصلاح

بھی ضروری ہے۔

(۲) وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ۔ ''صرف'' اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے۔ (قول سے بھی عمل سے بھی)۔

(۳) وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ۔ اپنے لباس کو پاک رکھیے۔ لباس کو پاک رکھنے سے کپڑے، دل اور نفس سب ہی کو پاک رکھنا مراد ہوسکتا ہے۔ بل کہ اعضاء و جوارح کو بھی۔

یعنی دل کو عقیدہ کی اور اعضاء کو اخلاق کی گندگی سے پاک رکھنا۔ جیسے حدیث شریف میں ہے ''رُبَّ كَاسِيَةٌ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٌ فِي الْاٰخِرَةِ'' (مشکوۃ ۱۰۹)۔ کہ دنیا میں بہت سی عورتیں کپڑا پہنے ہوئی آخرت میں برہنہ ہوں گی۔

اس حدیث کے کئی مطالب ہیں۔ ایک مطلب تو واقعی کپڑوں سے برہنہ ہونا مراد ہے۔ جیسے ایک دوسری مشہور روایت ہے کہ قیامت کے دن سب لوگ برہنہ اٹھائے جائیں گے۔ پھر پہلی روایت میں عورتوں کی تخصیص ان کو لباس کے باب میں تنبیہ کے لیے ہوگی۔ جب کہ اس حدیث (''الْمَيِّتُ يُبْعَثُ فِي ثِيَابِهِ الَّتِي يَمُوتُ فِيهَا'' (مشکوۃ ۱۴۴)۔ کہ میت کو روز قیامت میں اپنے کپڑوں سمیت اٹھایا جائے گا) سے اس پہلی حدیث کے خلاف مفہوم ثابت ہورہا ہے۔

کیوں کہ لباس کے ساتھ حشر معلوم ہورہا ہے تو علماء نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ یہاں ثوب (کپڑا) سے مراد اعمال ہیں۔ کیوں کہ محاورۂ عرب میں اعمال کو لباس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اعمال بھی بایں معنیٰ لباس ہیں کہ وہ کپڑوں کی طرح انسان کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں چاہے اعمال نیک ہوں کہ بد۔ تو عورتوں کی تخصیص، اعمال پر تنبیہ کے لیے ہوگی۔ معلوم ہوا بہر صورت ہمیں اپنے عقائد و اعمال اور اخلاق کو پاکیزہ بنانا چاہیے۔

(۴) وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔ بتوں سے الگ رہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں (رجز) سے ہر معصیت و گناہ کو مراد لیا گیا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے گناہ سے الگ رہو اور پاک

رہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو پہلے ہی سے بل کہ زمانۂ قبل نبوت سے ہی ان چیزوں سے دور ہیں پھر بھی یہ حکم کیا جارہا ہے تو اس کا معنی یہ ہوا کہ آئندہ بھی ان سے دور رہو یعنی سابق توحید پر بدستور قائم رہو۔ کیوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شرک میں مبتلا ہونے کا کوئی تصور بھی نہ تھا۔ درحقیقت یہ حکم امت کی تعلیم کے لیے ہے اور خوب تاکید مقصود ہے کہ جب معصوم پیغمبر کو اس کا حکم اور خطاب کیا جارہا ہے تو امت کو اس کا کتنا اہتمام کرنا چاہیے۔

(۵) وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ۔ اور ایسا نہ کر کہ احسان کرے اور بدلہ بہت چاہے۔ یعنی کسی پر اس نیت سے احسان نہ کیجئے کہ جو کچھ اس کو دیا ہے دوسرے وقت میں اس سے زیادہ وصول ہوگا۔

(۶) وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ۔ اپنے رب (کی خوشنودی) کے واسطے صبر کیجئے۔ یہ آیت شریفہ تبلیغ سے متعلق ہے۔ جیسے اوپر قم فانذر تبلیغ سے متعلق تھی۔۔۔ اور کپڑے پاک رکھیے، بتوں سے الگ رہیے، احسان کے بعد زیادتی نہ چاہیں ان سب کا تعلق اپنی ذات سے ہے۔

مؤخر الذکر میں اول ''کپڑے'' سے اعمال۔۔۔ ثانی ''بتوں سے'' سے عقائد۔۔۔ اور ثالث ''احسان'' سے اخلاق مراد ہیں۔ گویا یہ چند آیتیں جامع ہیں اصلاح خلق اور عقائد واعمال اور اخلاق سب ہی کو۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی (معارف القرآن ۸/ ۶۱۰)۔

ان احکامات میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سمندر بکوزہ ہے ان میں سب ہی چیزیں آجاتی ہیں۔ ضرورت صرف اتنی ہے کہ عملی جامہ پہنایا جائے۔ اللہ تعالی ہم سب ہی کے لیے راہ عمل کو آسان فرمائیں اور ان کی توفیق نصیب فرمائیں۔

(۶) اول الواجبات معرفت الٰہیہ کا حصول ہے

''قَالَ عَلَيهِ الصلوٰة والسلام ''اَلشَّرِيْعَةُ اَقْوَالِيْ وَالطَّرِيْقَةُ اَفْعَالِيْ وَالْحَقِيْقَةُ

آحْوَالِیْ وَالْمَعْرِفَۃُ اَسْرَارِیْ ''۔شریعت،طریقت،حقیقت اور معرفت یہ چار مرتبے ہیں۔ان میں طریقت حقیقت اور معرفت شریعت سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔شریعت مانند دودھ کے اور طریقت مثل دہی کے اور حقیقت مثل مکھن کے اور معرفت مانند روغن (گھی) خالص کے ہے اگر دودھ ہی نہ ہوتو یہ تینوں کہاں سے بن سکیں؟

''قال علیہ الصلوٰۃ و السلام الشریعۃُ کالسَّفِینۃِ۔۔۔ وَالطَّرِیْقَۃُ کالبحر ۔۔۔وَالحقیقۃُ کالصَّدَفِ (سیپ)۔۔۔والمعرفۃُ کالدُّرِ، فمن ارادَ الدرَ یرکبُ السفِینۃَ ثم شَرَعَ فِی البحرِ یصلُ الدُرَّ ومن ترك ھٰذِہِ الترتیبَ لم یَصِلِ اِلی الدر'' (ترجمہ مفتاح اللطائف ۴، ۳ حضرت خواجہ محمد اسلمؒ)۔آیئے ہم معرفت کی قدر سمجھتے ہیں!

معرفت الٰہیہ وہ بیش قیمت گوہر ہے جس کا حصول بقول امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ اول الواجبات ہے۔لہٰذا خشیت کی مذکورہ تفصیل کے بعد ہم ائمہ حضرات کی خدمت میں مؤدبانہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے منصب امامت کے ساتھ اپنے میں معرفت خداوندی کی فکر رکھا کریں اور جتنا ممکن ہو معرفت میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجات طے کرنے کی کوشش کریں۔

کیوں کہ معرفت خداوندی کے بھی مختلف درجات ہیں جن میں ادنی سے اعلیٰ کی طرف سیر مطلوب ہے۔یہاں درجات معرفت سے عمومی معرفت مراد ہے اہل تصوف کی معرفت کا ذکر اخیر میں مذکور ہے۔

معرفت کا پہلا درجہ

ان درجات میں سب سے مقدم اور ضروری درجہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔یعنی اپنے معبود حقیقی کو پہچاننا ہے۔امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے (قرآن شریف کی آیت: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ

اَلَّذِیْ خَلَقَ۔ پڑھیے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے کے ذیل میں) لکھا ہے کہ بقول جمہور مفسرین یہ آیت سب سے پہلے نازل ہوئی۔ پھر لکھا ہے کہ علماء متکلمین کا علی حسب اختلاف الاقوال اس پر اتفاق ہے کہ

* اول الواجبات: اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا،
* یا اس (کی معرفت) پر غور وفکر کرنا،
* یا کم از کم معرفت کے لیے غور وفکر کا قصد کرنا ہے [۱]،

اس کے ثبوت پر آیت اس طرح دال ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کی جانب مبعوث کرنا چاہا تو یوں نہیں فرمایا "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ لَاشَرِیْكَ لَهٗ " اس پروردگار کے نام سے پڑھیے جس کا کوئی شریک نہیں۔

---

[۱] جمہور اشاعرہ اور ماتریدیہ کے نزدیک یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جسے مذہب اسلام کی دعوت اور اس کی بونہ پہنچ سکی ہو۔ ورنہ مکلف (ایمان لانے والے) پر اول واجب توحید (لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ) کا اقرار ہے۔

چناں چہ امام اشعریؒ کے نزدیک اول واجب، اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ اور استاذ ابو اسحاق اسفرائیؒ کے نزدیک اول واجب، معرفت کے لیے غور وفکر کرنا ہے۔ اور قاضی ابو بکر باقلانیؒ، اور ابن فورکؒ اور امام الحرمینؒ کے یہاں غور وفکر کا قصد وارادہ اول واجب ہے۔

مذکورہ بالا حکم ظاہر یہ کے خلاف ہے۔ وہ ان چیزوں کو اول واجب نہیں مانتے کیوں کہ توحید فطری ہے تو عقل یعنی غور وفکر کا استعمال ضروری نہیں۔ لیکن جمہور توحید کے فطری ہونے کے باوجود اور غور وفکر کی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دعوت ثابت نہ ہونے کے باوجود استعمال عقل کو اول واجب مانتے ہیں۔

جمہور کے دلائل بڑی کتابوں میں ہیں اس کا اشارہ ملاحظہ ہو، قرآن کریم میں غور اور فکر وتدبر کا مکلف کیا گیا ہے۔ مثلاً "قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ " اس طرح کی آیات بے شمار ہیں اور حضرت عائشہؓ کی حدیث شریف میں ہے کہ اس شخص کے لیے ویل وخرابی ہے جو ان آیات "تفکر" کو پڑھے اور ان میں غور وفکر نہ کرے " وَیْلٌ لِمَنْ قَرَءَهَا وَلَمْ یَتَفَکَّرْ فِیْهَا " (رواہ ابن حبان فی صحیحہ) (نبراس ۲۴)۔

محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے حدیث "طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ اَوْ مسلمة" میں فریضۂ علم کی تشریح میں چند باتیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا علم مراد ہے۔ گویا حدیث شریف سے بھی معرفت کا ضروری اور مقدم ہونا معلوم ہوا۔ اسی طرح قرآن شریف کی اس آیت "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ" میں بھی لِيَعْبُدُوْنَ سے معرفت مراد ہے۔

قرآن کریم نے اس الٰہ ومعبود کی معرفت میں خطا نہ ہو اس لیے چار صفات سے اس کی توضیح وتعیین کردی۔ چناں چہ

- پہلی صفت کو بیان فرمایا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ معبود وہ ہوگا جو یکتا ہو۔
- دوسری صفت ہے اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ وہ ساری کائنات سے بے نیاز ہو۔
- تیسری صفت ہے لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ نہ اس کی کوئی اولاد ہو نہ وہ کسی کی اولاد ہو۔
- چوتھی صفت ہے وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ اس کے مثل اور مشابہ کوئی بھی نہ ہو۔

پہلی تین صفتیں سمجھ میں آگئیں کہ وہ مخلوق کی صفت بن ہی نہیں سکتیں۔ لیکن چوتھی صفت کو سمجھنا ذرا مشکل ہے۔ کیوں کہ اس کے مثل اور مشابہ کچھ چیزیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی طرح مخلوقات کا سننا دیکھنا، قدرت وعلم رکھنا اور دوسروں پر رحم وشفقت کرنا وغیرہ۔ جواب یہ ہے کہ بندے اور خدا کی صفات صرف نام میں تو مشابہت ومماثلت رکھتی ہیں لیکن حقیقت کے لحاظ سے وہ اللہ تعالیٰ کی صفت کے مشابہ اور مثل نہیں۔

کیوں کہ مثلاً ہمارا علم حادث ہے، جائز الوجود ہے، عارضی ہے اور ہر وقت متجدد ہوتا رہتا ہے۔ جب کہ باری تعالیٰ کا علم قدیم ہے، وجوبی ہے اور دائمی اور ابد تک کے لیے ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی وہ صفات علیٰ وجہ الاتم اور ذاتی ہوئیں جب کہ بندے کی یہ صفات ناقص اور خدا کی عطا

کردہ ہوئیں نہ کہ ان کی ذاتی (شرح عقائد ۵۰)۔خلاصہ یہ کہ جس میں یہ ذاتی صفات پائی جائیں وہی معبود حقیقی ہے۔

معرفت کا دوسرا درجہ

اللہ تعالیٰ کو معبود جان لینے اور تسلیم کر لینے کے بعد جو معرفت کا پہلا درجہ ہے اب دوسرا درجہ ہے۔جس میں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہم سے کس چیز کا مطالبہ فرماتے ہیں؟ اور یہ معلوم کرنا ہے کہ جو مطالبہ ہے اس کو کس طرح پورا کیا جائے؟

جس چیز کا مطالبہ ہے وہ تو ہے بندگی اور عبادت (مثلاً نماز، روزہ، حج، وزکوٰۃ وغیرہ) اور جس طرح کی بندگی کا مطالبہ ہے وہ اس طرح کی بندگی ہے جس کو سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عملی طور پر کر کے بتا دیا۔مختصر یہ کہ اس کی رضاء و ناراضگی کے امور (معروفات و منکرات) کو جاننا اور پھر ان کو بجالانا ہے۔

(یعنی زندگی کے تمام مراحل و ادوار میں حق و باطل، ہدایت و ضلالت، نور و ظلمت، طاعت و معصیت، حلال و حرام، فناء و بقاء، صلاح و فساد، علم و جہل اور خلوص و ریا کو جاننا اور ان کے فرق کو جاننا، جان کر قولاً، فعلاً، فکراً و اعتقاداً فرق کرنا اور کماً و کیفاً جیسا مطلوب ہے اس طرح بجالانا) اور سبقاً سبقاً ان میں ترقی اختیار کرنا یہ معرفت کا دوسرا درجہ ہے۔

حضرت سلطان باہو قدس سرہ فرماتے ہیں کہ جو فقیر فنافی اللہ ہوتا ہے وہ اگرچہ ظاہر میں عوام الناس سے ہم کلام ہوتا ہے لیکن باطن میں اللہ تعالیٰ کی طرف حاضر رہتا ہے اور معرفت میں مشغول رہتا ہے۔پھر لکھا ہے کہ اب علم العلم کی شرح جاننا ضروری ہے اور وہ حق و باطل کی تمیز کرنا ہے پس دیکھنا چاہیے کہ حق کیا ہے اور باطل کس کو کہتے ہیں (ترجمہ کتاب تیغ برہنہ ۱۳، ۱۴)۔تو پہلا درجہ علم ہوا اور دوسرا علم العلم ہوا۔قرآنی اصطلاح میں اس کو حق کی معرفت کہتے ہیں قرآن شریف کا

ارشاد ہے "وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ" (مائدہ ۸۳)۔

ان دونوں قسموں کی معرفت کا نتیجہ یہ ہو کہ نمازیں اور دیگر عبادتیں برائے معرفت ہوں۔ اور معرفت برائے طاعت وعبادت ہو۔ یعنی ہر پچھلی معرفت سے اگلی معرفت، اور ہر پچھلی عبادت سے اگلی عبادت کمًا وکیفًا بڑھی ہوئی ہو جیسے مرقات میں ہے "کُلَّمَا ازْدَادَ الْعَبْدُ مَعْرِفَةً ازْدَادَ عُبُوْدِيَّةً" (۶۰ ج۱)۔ (اللھم زد فزد) ذیل میں معرفت کے تیسرے درجہ کا بیان ہے لیکن پہلے معرفت کسبیہ کا حال۔

عند العلماء معرفت کسبیہ معتبر ومطلوب ہے

بطور خاص حضرات علماء وائمہ کے لیے تحصیل معرفت میں معرفت کسبیہ سے موسوم بحث کو بیان کرنا بھی معرفت میں اضافہ کا سبب بن سکتا ہے اس لیے اسے مختصرًا پیش کیا جاتا ہے۔

ایمان کہتے ہیں تصدیق کو، صرف علم ومعرفت (جاننے) کو ایمان نہیں کہتے۔ اگر تصدیق ہے تو کہیں گے ایمان ہے۔ صرف علم ومعرفت حاصل ہے تو کہیں گے ایمان نہیں ہے۔ پھر تصدیق کہتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دل کے قصد وارادہ کے ساتھ سچا جاننے اور قبول کرنے کو اور علم ومعرفت کہتے ہیں صرف اس طرح جانکاری اور معرفت رکھنے کو جو خود بخود حاصل ہو جائے (اس طرح کہ نہ تو مانے نہ تو قبول کرے)۔

یہ بھی یاد رکھیے کہ تصدیق کے لیے قصد وارادہ ضروری ہے معرفت کے لیے قصد وارادہ ضروری نہیں وہ بغیر ارادہ بھی (صرف آنکھوں وغیرہ سے دیکھنے سننے سے بھی) بطور بدیہی حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً: کسی شخص نے نبی کا کوئی معجزہ دیکھا تو اسے معجزہ دیکھنے سے نبی کے سچا ہونے کا بدیہی طور پر یعنی بلا قصد وارادہ یقین ضرور حاصل ہوگا، لیکن یہ ضروری نہیں کہ سچا

جاننے کے بعد نبی کو دل سے ماننے بھی جس کو تصدیق کہتے ہیں۔ جیسے صالح علیہ السلام کی اونٹنی دیکھ کر ان کی قوم نے نبی ہونے کا یقین تو کیا لیکن تصدیق نہیں کی۔

اہل کتاب " اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنَاھُمُ الْکِتَابَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ أَبْنَاءَھُمْ "۔ (انعام/۲۰)۔ وہ (اہل کتاب) آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (نبی ہونے کے ناتے) بالکل سچا نبی ہونا اسی طرح جانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو (بیٹا ہونا)۔ اس جاننے کے بعد بھی وہ ایمان لانے والے (تصدیق کرنے والے) نہیں کہلائیں کیوں کہ وہ جانتے تھے لیکن یہ جاننا غیر اختیاری تھا۔

ہاں اگر جاننا اپنے قصد وارادہ سے ہو (بطور بدیہی نہ ہو) جس کو معرفت کسبیہ کہتے ہیں تو پھر ایسی معرفت جو اپنی طرف سے حاصل کی ہو وہ تصدیق کہلائے گی۔

لیکن اس مذکورہ بات (معرفت غیر اختیاریہ کا تصدیق نہ ہونا) پر اعتراض ہوگا فرشتوں اور نبیوں کی تصدیق سے کہ ان کو بذریعہ وحی جو علم حاصل ہوتا ہے تو اس میں ان کے کسب واختیار کا تو کوئی دخل نہیں پھر اس پر تصدیق کا اطلاق کیسے درست ہے؟ تو اس کا جواب صاحب نبراس نے (صفحہ ۲۵۹) پر دیا ہے اور حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحب نے شرح عقائد کی شرح میں یہ دیا ہے کہ یہ حضرات حصول اول کے بعد دوبارہ اپنے کسب واختیار سے تحصیل کے مکلف تھے تو پھر تصدیق کا اطلاق درست ہے (جواہر الفرائد ۵۶۳)۔

اس پوری بحث کو شرح عقائد وغیرہ کتابوں میں اس طرح بیان کیا ہے "وَالْمَذْکُوْرُ فِیْ کَلَامِ بَعْضِ الْمَشَائِخِ اَنَّ التَّصْدِیْقَ عِبَارَۃٌ عَنْ رَبْطِ الْقَلْبِ عَلٰی مَا عُلِمَ مِنْ اِخْبَارِ المخبِرِ وَھُوَ اَمرٌ کَسْبِیٌّ یَثبتُ بِاختیارِ المُصَدِّقِ۔۔۔وَلَا یَکْفِیْ فِیْ حُصُوْلِ التَّصْدِیْقِ اَلْمَعْرِفَۃُ لِاَنَّھَا قَدْ تَکُوْنُ بِدُوْنِ ذٰلِکَ۔۔۔وَلِذَا قَالُوْا مَنْ وَقَعَ فِیْ قَلْبِہٖ صِدْقُ النَّبِیِّ صلعم بِلَااِخْتِیَارٍ لَمْ یَکُنْ ذٰلِکَ اِیْمَانًا۔۔۔نَعَمْ یَلْزَمُ اَنْ تَکُوْنَ الْمَعْرِفَۃُ الْیَقِیْنِیَّۃُ

اَلْمُکْتَسَبَۃُ بِالْاِخْتِیَارِ تَصْدِیْقًا"۔(۹۴)۔ لہٰذا ہمیں اور دیگر مسلمانوں کو بھی ایسی تصدیق پیدا کرنے کی ضرورت ہے جس سے ہمارا ذہنی داخلی اور خارجی وجود آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کے تابع ہوجائے بل کہ ایسی معرفت یقینیہ کسبیہ میں اضافہ بھی ہو۔ یہ نہیں کہ وہ تصدیق صرف رسمی ہو اور وہ تصدیق ومعرفت منجمد ہو۔

ایک عالم کی بات ملاحظہ فرمائیں، بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ ہر شخص بطور خاص عالم اپنے علمی سفر کے دوران اپنے بچپن کے ایمان سے اوپر اٹھتا ہے لیکن میں زمانہ شعور سے قرآن وحدیث کی ہر ہر بات پر شعوری طور پر بالاختیار ایمان لاتا رہا اور تصدیق کرتا رہا جس کی وجہ سے ایمانی جمود کا شکار نہیں رہا بل کہ ہر وقت میں اپنے اندر تجدد ایمان پاتا رہا، پھر انہوں نے مسلمانوں کو اس طرح شعوری ایمان وتصدیق کی دعوت دی ہے تا کہ ایمانی جمود ختم ہو۔

معرفت کا تیسرا درجہ

زندگی کے مختلف شعبوں میں رہ کر مخلوقات الٰہیہ پر غور وفکر کر کے اور ساتھ ہی اپنے ایمان ویقین میں خوب جدوجہد کرتے ہوئے اس کو ایسی مضبوطی بخشے جس کے نتیجہ میں تمام احکام شرعیہ مثلاً نماز، روزہ، حج وزکات، ذکر ودعاء، صدق وامانت، اخلاق وتواضع وغیرہ بجالانے میں اور منہیات شرعیہ مثلاً جھوٹ، کینہ، حسد، کبر، چوری، غیبت اور بدنظری وغیرہ سے بچنے میں پوری طرح معین ومددگار ہو جس کی وجہ سے دوسرے درجہ کی کمی بھی پوری ہوجائے بل کہ اس میں اضافہ ہوتا رہے۔ یہ معرفت کا تیسرا درجہ کہلائے گا۔

مرقات میں لکھا ہے کہ معرفت بسا اوقات نفس کے خلاف مجاہدہ سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً نفس کو برے اخلاق اور اوصاف رذیلہ سے پاک کرنا، اور نفس کو اچھائیوں کے انوارات سے آراستہ کرنا۔ مثلاً توبہ، تقویٰ، زہد اور استقامت اور جملہ اخلاق حمیدہ، اور ایک حال سے دوسرے

حال اور ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف اٹھنا اور بلند ہونا۔حتی کہ صفات جلالیہ کی کرنیں واضح ہونے لگیں۔۔۔(مرقات ۱/۲۶۳) یہی بات اس سے اوپر کہی گئی ہے جس میں ایمان ویقین کو اوراس کی طرف توجہ کو بنیاد قرار دیا ہے۔

تَنَبُّہ: درجات معرفت کی اس تفصیل میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ تین درجات بالترتیب ہیں۔لیکن یہ بات بھی ذہن نشین ہو کہ وہ صعودی ترتیب ہے۔یعنی پہلا درجہ اگر چہ فرض ہے لیکن دوسرے اور تیسرے درجے کی معرفت سے اس کا مقام ومرتبہ کم ہے، اس طرح دوسرے کا مقام تیسرے کے مقابلے میں کم ہے۔خلاصہ یہ کہ تیسرے درجے کی معروفت کا مرتبہ ان سب میں بلند ہے۔اس طرح درجات کا فرق آگے پیر ومرید کی معرفت میں فرق کے بیان میں دیکھ سکتے ہیں۔

مزید درجات

اس کے بعد کے درجات آدمی کے کسب معرفت اور اس کی جدوجہد پر موقوف ہوں گے۔جس کو معرفتی جدوجہد میں جتنی دسترس حاصل ہوگی معرفت میں اس کا درجہ اتنا ہی بلند ہوگا۔

کیوں کہ اہل نظر اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ذوق ومعرفت۔۔۔ایمان ویقین۔۔۔اخلاص واستقامت۔۔۔تزکیہ وتہذیب۔۔۔اور کامل اتباع سنت اور فنا فی الشریعت، وہ حقیقی مقاصد ہیں جن کے لیے مختلف وسائل اختیار کئے جاتے ہیں۔محققین ان مقاصد کے حصول کو کسی ایک وسیلہ میں منحصر نہیں مانتے بل کہ کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ’’طَرِیْقُ الْوُصُوْلِ اِلَی اللّٰہِ بِعَدَدِ اَنْفَاسِ الْخَلَائِقِ ‘‘(مرقات ۱/۲۷۹ باب العلم)۔

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔’’ مَنِ انْكَشَفَ وَلَوِ الشَّيْءُ الْيَسِيْرُ لَهٗ بِطَرِيْقِ الْاِلْهَامِ وَالْوُقُوْعِ فِي الْقَلْبِ مِنْ حَيْثُ لَا يَدْرِيْ فَقَدْ صَارَ عَارِفًا بِصِحَّةِ الطَّرِيْقِ،

وَلَمْ يَرَهٗ ذٰلِكَ مِنْ نَفْسِهٖ قَطُّ. فَيَنْبَغِيْ اَنْ يُّؤْمِنَ بِهٖ. فَاِذَنْ دَرَجَةُ الْمَعْرِفَةِ فِيْهِ عَزِيْزَةٌ جِدًّا

[1] (طیبی ۱/۴۱۵)۔اب اس کی آپ بہت سی مثالیں پا سکتے ہیں۔

پہلی مثال : مثلاً اگر کسی سے کوئی گناہ سرزد ہوا اور اس پر من جانب اللہ بطور تنبیہ کوئی مصیبت واقع ہوا اور اس کو اللہ کی طرف سے سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو، یا کسی نیکی کے کام پر مسرت اور بدی پر قلق وافسوس ہو(جیسا کہ حدیث شریف میں اس کا ذکر ہے) تو ان سب صورتوں میں رجوع یا مسرت وافسوس بھی معرفت کی دلیل ہوگی۔

دوسری مثال : اسی طرح مدرس کو اپنی تدریس۔۔۔امام کو اپنی امامت۔۔۔مدرس کو مطالعہ کرنے۔۔۔طلباء کو قابل بنانے۔۔۔اور تفسیر وحدیث وفقہ کی ترجیح میں۔۔۔اللہ تعالیٰ کی طرف کامل توجہ رہے تو یہ بھی اضافۂ معرفت کا سبب ہوگا۔اس کو سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے مردوں کو کس طرح زندہ کرتے ہیں اسے دکھانے کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا تمہیں اس کا یقین نہیں ہے کہ تم دیکھنا چاہتے ہو تو حضرت ابراہیم نے فرمایا: اے اللہ یقین تو ہے لیکن مزید اطمینان کے لیے دیکھنا چاہتا ہوں (سورۂ بقرہ ۲۶۰) دیکھئے رویت سے پہلے اور بعد کے تطمین قلب میں فرق معلوم ہوا۔ اس طرح معرفت میں اضافہ ہوتا ہے۔

روح المعانی میں ’’دَعْوٰهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ‘‘ (سورۃ

---

[1] اوپر الہام کا ذکر آیا ہے تو اس کو اور فراست کو سمجھ لیں۔الہام ایسے علم حق کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ غیب سے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالے۔’’قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ۔ اور فراست ایسے علم کو کہتے ہیں جو غیب سے منکشف ہو لیکن اشیاء وصور کے آثار پر غور وتدبر کے ذریعہ۔پس دونوں میں فرق یہ ہوا کہ فراست میں امور غیبیہ کا کشف صورتوں کے آثار کے واسطے سے ہوتا ہے اور الہام میں ان کا واسطہ نہیں ہوتا (مرقات ۱/۲۶۴)۔

یونس۱۰) کے تحت لکھا ہے کہ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض ''رسائل فی الکلام'' میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت میں تفاوت کی وجہ سے اہل جنت کے درجات مختلف ہوں گے۔

فرمایا : عوام مؤمنین جنت میں علمی مرتبہ میں علماء ''فی الدنیا'' کی طرح ہوں گے۔ اور علماء انبیاء علیہم السلام ''فی الدنیا'' کی طرح۔ اور انبیاء علیہم السلام ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح۔ اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس علمی بلند مقام پر ہوں گے۔ 'لَاتَکُوۡنُ لِمَلَکٍ مُقَرَّبٍ وَلَانَبِیٍّ مُرۡسَلٍ ' وَیُمۡکِنُ اَنۡ یَکُوۡنَ ذٰلِکَ الۡمَقَامُ الۡمَحۡمُوۡدَ''۔ پھر اس کے بعد لکھا ہے کہ اہل جنت اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات سلبیہ وصفات اکرام کی غیر متناہی سیر ومعرفت حاصل کریں گے (روح المعانی ۱۱/۱۰۳)۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کو کسی مسئلہ میں کوئی اشکال یا کسی آیت کے سمجھنے میں دقت پیش آتی تو وہ کسی سنسان مسجد میں چلے جاتے اور پیشانی خاک پر رکھ کر دیر تک یہ کہتے رہتے۔ ''یَامُعَلِّمُ ابراھیمَ فَهِّمۡنِیۡ'' اے ابراہیم کو علم عطا کرنے والے مجھے اس کی سمجھ عطا فرما۔ (العقود الدریۃ ۲) اور یہ بھی فرماتے۔ ''فَاَسۡتَغۡفِرُ اللہَ اَلۡفَ مَرَّۃٍ اَوۡ اَکۡثَرَ اَوۡ اَقَلَّ حَتّٰی یَنۡشَرِحَ الصَّدۡرُ وَیَنۡجَلِیَ اِشۡکَالُ مَا اَشۡکَلَ ''۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے مناجات کے کلمات پر غور کیجیے۔ ''یَارَبِّ عَرَفۡتُ حَقَّ الۡمَعۡرِفَۃِ، وَمَا عَبَدۡتُّكَ حَقَّ الۡعِبَادَۃِ فَھَبۡ لِیۡ نُقۡصَانَ الۡخِدۡمَۃِ بِکَمَالِ الۡمَعۡرِفَۃِ'' (عقود الجمان ۲۲۰)۔

⬅ تیسری مثال : اگر کسی خوش نصیب کو روزمرہ کے پیش آنے والے مخلوقات کے واقعات سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ومیلان کا سامان میسر ہو تو یہ ان مذکورہ تمام درجات میں بڑھا ہوا درجہ مفہوم کیا جائے گا۔

کیوں کہ دنیا آدمی کو اللہ تعالیٰ سے غافل کرنے والی ہے، لیکن اس خوش نصیب نے

اس کو بھی معرفت خداوندی کا ذریعہ سمجھا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ اور ہماری ذات کے درمیان وصول سے پردے مانع ہیں جن کو ہٹا کر اس تک پہنچنے کا امر ہے جو جتنے پردے اٹھاتا جایے گا اتنا وہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہوگا۔ان پردوں کا ہٹانا اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات کی معرفت ہی سے ممکن ہے نہ کہ ذات سے۔ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "عَرَفْتُ رَبِّيْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ" میں نے اپنے رب کو ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا حضرت شیخؒ نے فضائل درود میں ۷۶۵ پر یہ دوسروں کا حال بیان کیا ہے[1]۔

حضرت خواجہ حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے۔ "اَنَّهٗ رَاٰى شَخْصاً يَلْعَبُ فَوْقَ الْجِبَالِ فَقَالَ اِنَّ هٰذَا خَيْرٌ مِنْ اَصْحَابِنَا ، لِاَنَّهٗ يَاْكُلُ الدُّنْيَا بِالدُّنْيَا ، وَاَصْحَابُنَا يَاْكُلُوْنَ الدُّنْيَا بِالدِّيْنِ" (مرقات ۱/۲۸۷ باب العلم)۔اسی طرح ایک بزرگ کا قول "اَعْرِفُ ذٰلِكَ فِيْ خُلُقِ دَابَّتِيْ وَخَدَمِيْ"۔(۸ دعوت فکر وعمل)۔ اس کو متضاد مثال سے سمجھیے ایک شخص بیت الخلاء میں قضاء حاجت سنت نبوی سے کرتا ہے یعنی بیت الخلاء میں غافل نہیں، جب کہ دوسرا شخص بیت اللہ میں بھی خدا سے غافل ہوتا ہے۔اسی طرح کوئی بازار میں ذاکر ہے تو کوئی بیت اللہ میں غافل یہ اسی معرفت وعدم معرفت کا نتیجہ ہے۔ کہ ایک کو معرفت حاصل ہے دوسرے کو نہیں۔

---

[1] اللہ تعالیٰ کی ذات اور ہمارے درمیان پردے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ پردے میں ہے، وہ تو ظاہر وباہر ہے" هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ "بل کہ ہم پردے میں پڑے ہوئے ہیں ،جس سے ہم اللہ سے دور ہیں۔ وہ بہیمیت وحیوانیت اور خواہشات کے پردے ہیں، جتنے ہم ان کو دور کریں گے اتنے ہم اصل انسان بنیں گے۔شریعت کے اوامر ونواہی کی وضع اسی بہیمیت سے نکالنے کے لیے ہے (مرقات ۲/ ۲۲۰)۔سادات تصوف کے یہاں تو یہ پردے سخت عذاب سمجھے جاتے ہیں۔ "اَلْحِجَابُ اَشَدُّ الْعَذَابِ" (مرقات ۱/ ۷۶)۔

اسی طرف ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس جملہ سے اشارہ فرمایا ہے۔ ''کُنْ مِمَّنْ يَكُوْنُ فِي السُّوْقِ وَقَلْبُه مُعَلَّقٌ فِي الْمَسْجِدِ لَا بِالْعَكْسِ۔'' (مرقات ۱۹۲/۲)۔

مجدد الملت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بازار چوں کہ شر وفساد کی جگہ ہے اس لیے سنت ہے کہ بازار میں یہ کلمہ پڑھ لے۔ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ'' حدیث میں اس کے بڑے فضائل مذکور ہیں۔ دس لاکھ نیکیاں لکھی جاتیں ہیں، دس لاکھ گناہ معاف کیے جاتے ہیں دس لاکھ درجات بلند کیے جاتے ہیں اور جنت میں ایک گھر اس کے لیے بنایا جاتا ہے۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ۔ مشکوٰۃ ۲۱۴)۔

بعض صحابہ کے بارے میں ہے کہ وہ کبھی اس کلمہ کا ثواب عظیم حاصل کرنے بازار جایا کرتے تھے۔ پھر حضرت فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ ان کے تقویٰ وذکر نے بازاروں کو بھی مساجد بنادیا تھا۔ افسوس کہ ہم آخرت کے بازاروں (مسجد) سے بھی کورے واپس جاتے ہیں، نہ دین ہی کی متاع ملتی ہے اور نہ ہی دنیا کی دولت، بل کہ اس سے بھی زیادہ خسارہ یہ ہے کہ وہاں اپنی حسنات کو بھی کھودیتے ہیں (آداب مساجد ۱۳)۔

چناں چہ ایسی معرفت کے ایک دو واقعات ہم ذکر کرتے ہیں تاکہ ان کو پڑھ کر اور سمجھ کر اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس راستے پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائیں۔ کیوں کہ ولایت ومعرفت کے درجات کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہوئے ہیں بشرطیکہ وہ اس کی جدوجہد کرے۔ اہل اللہ لوگوں سے جو ریاضت ومحنت کراتے ہیں ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ تم بھی ہماری طرح بن جاؤ اور تم بھی اس درجہ پر آجاؤ جہاں ہم ہیں۔ ان کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ہم جہاں ہیں ہم وہیں رہیں اور تم وہی رہو۔ نہیں بل کہ ان کی تمنا ہوتی ہے کہ تم اپنی اپنی صلاحیت ومجاہدات لے کر

آؤ،اور آگے بڑھتے جاؤ۔

چناں چہ بہت سے مریدین اپنے مرشدین سے، بہت سے تلامذہ اپنے اساتذہ سے سبقت لے گئے ہیں۔لہٰذا ہم بھی اس راستے پر چلنا شروع کریں، راستے پر چلتے ہوئے راستے کی کٹھنائی اور اس کی طویل مسافت سے نہ گھبرائیں۔کیوں کہ راستہ طویل ہے لیکن راستہ کی منزل یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ہم سے ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے ۔

پیرو مرید کی معرفت میں فرق

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کا ترجمہ دو طرح سے ہوتا ہے۔

(۱) بسم اللہ سے پہلے (اَبْدَأُ) محزوف مانا جائے یعنی ابدأ باسم اللہ، شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے۔

(۲) بسم اللہ کے اخیر میں (ابتدائی) محزوف مانا جائے یعنی بسم اللہ ابتدائی، اس اللہ کے نام سے میری ابتداء ہے۔۔۔

امام صاحب (رازی رحمہ اللہ) دوسرے طریقے کو پسند فرماتے ہیں۔کیوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا نام مبارک مقدم رہتا ہے اور یہی بہتر ہے۔جب کہ پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ کا (اسم مبارک) مؤخر ہو جاتا ہے۔اس بحث کے ضمن میں امام صاحب نے تفسیر کبیر میں ایک واقعہ جو معرفت سے تعلق رکھتا ہے ذکر کیا ہے۔

امام صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد (شیخ ضیاء الدین۔رحمہ اللہ تعالیٰ) سے سنا وہ فرماتے تھے کہ مجھ سے شیخ ابو القاسم انصاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ شیخ ابو سعید بن ابو الخیر، حضرت ابو القاسم قشیری رحمہا اللہ تعالیٰ کے ہم راہ تشریف لائے، گفتگو کے دوران حضرت قشیری

نے فرمایا: علمائے محققین کا یہ مقولہ ہے "مَارَأَیْنَا شَیْئًا اِلَّا وَرَاَیْنَا اللّٰہَ بَعْدَہٗ" ہم نے جو چیز بھی دیکھی تو اس چیز کو دیکھنے کے بعد اس میں اللہ کو ضرور دیکھا۔ استاذ قشیری کے اس ارشاد کے بعد شیخ ابو سعیدؒ نے فرمایا۔ "ذٰلِكَ مَقَامُ الْمُرِیْدِیْنَ" یہ تو مریدوں کا رتبہ ہے یعنی یہ تو ادنیٰ درجہ ہے، لیکن مرشدین کاملین کا مقام سنو "فَاِنَّهُمْ مَارَاَوْا شیئاً اِلَّا وَ کَانُوْا قَدْ رَأَوُا اللّٰہَ قَبْلَہٗ" وہ تو ان چیزوں کو دیکھنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو دیکھ چکے ہوتے ہیں پھر دنیا کی چیزیں دیکھتے ہیں۔

اس واقعہ سے امام صاحب نے بسملہ میں بسم اللہ سے ابتدا کو بہتر سمجھنے پر استدلال کیا ہے۔ کیوں کہ اس میں ابتداء اللہ کے اسم مبارک سے ہے یعنی خالق سے ابتداء ہے جب کہ اس کے علاوہ صورت میں اسم مبارک مؤخر ہو جاتا ہے (اور ابتدا مخلوق سے ہوتی ہے)۔

اس کو علمی اصطلاح میں یوں کہیں کہ اس واقعہ میں اول مرید کے طریقے میں مخلوق (کی معرفت) سے خالق کی طرف انتقال ہے جس کو برھان اِنّی کہتے ہیں۔ اور مرشد کے طریقے میں خالق (کی معرفت) سے مخلوق کی طرف انتقال ہے جس کو برھان لِمّی کہتے ہیں اور برہان انّی سے لمّیؔ افضل واشرف ہوتی ہے۔ خیر واقعۂ مذکورہ سے معرفت کی دو راہیں اور دو مرتبے معلوم ہوئے (تفسیر کبیر ج۱/ ۱۰۱، طبع ثالث)۔ یہاں بھی بعد والے درجہ کا مرتبہ پہلے درجے سے بلند ہے۔

عند اللہ اپنا درجہ معلوم کرنے کا طریقہ

امام رازیؒ نے معرفت پر ایک زریں جملہ ارشاد فرمایا ہے پڑھنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے دعا کر لیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی حقیقت سے نوازیں یہاں ایک مختصر جملہ سے ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ عند اللہ ہمارا کیا مقام و درجہ ہے فرمایا: اِنَّ جَنَّۃَ الْمَعْرِفَۃِ خَیْرٌ مِنْ جَنَّۃِ النَّعِیْمِ (تفسیر کبیر ج ۱/ ۱۷۷)۔ کہ معرفت کی جنت، نعمتوں والی آخرت کی جنت سے بہت بہتر ہے۔ اس

جملے میں دو اہم نکتوں کی طرف اشارہ ہے۔

(۱) ایک یہ کہ آخرت کی جنت میں جنتی آدمی کو جو لطف آئے گا اس سے زیادہ لطف دنیا میں عارف کو معرفت حاصل ہونے میں آتا ہے۔

(۲) دوسرا یہ کہ دنیا میں جس کو اللہ تعالیٰ کی جتنی معرفت حاصل ہوتی ہے اتنا اس کا مقام بلند ہوتا ہے یعنی اللہ کی معرفت کا حاصل ہونا عند اللہ اپنے مقام و مرتبہ پہچاننے کے لیے معیار ہے۔ اور یہی بات امام قرطبی تحریر فرماتے ہیں ''مَثَلُ السُّنَّةِ فِي الدُّنْيَا كَمَثَلِ الْجَنَّةِ فِي الْعُقْبٰى، مَنْ دَخَلَ الْجَنَّةَ فِي الْعُقْبٰى سَلِمَ كَذٰلِكَ مَنْ لَزِمَ السُّنَّةَ فِي الدُّنْيَا سَلِمَ۔ (قرطبی ۳۶۵/۱۳)۔

ترجمہ: جو مقام و درجہ اخروی زندگی میں جنت کو حاصل ہے دنیوی زندگی میں وہ نبوی سنتوں کو حاصل ہے۔ لہٰذا جس طرح کوئی شخص اخروی جنت میں محفوظ و سالم رہتا ہے بس اسی طرح دنیوی زندگی میں سنتوں پر چلنے والا بھی شرور و آفات سے محفوظ رہتا ہے۔ جس طرح امام رازیؒ نے بلند مقام کا معیار معرفت کو قرار دیا تھا بس اسی طرح یہاں سنت نبوی کو معیار قرار دیا ہے۔ کہ دنیا میں جس کی زندگی میں جتنی سنتیں ہوں گی اس قدر عند اللہ اس کا مقام بلند ہوگا۔ اللہ اکبر!! کتنی بڑی باتیں ہیں اللہ تعالیٰ ان سے ہمیں نوازیں۔

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی تین علامتیں

حضرت شیخ ابرار احمد دھلیوی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ رب اکرم کی خوشنودی کی تین علامتیں ہیں مطلب جن سے اللہ پاک خوش ہوتے ہیں ان کو تین دولتیں مرحمت فرماتے ہیں۔

(۱) دولت : دین کی سمجھ اور دین کی فہم ہے۔ ہر لائن کی ایک سمجھ ہوتی ہے ہر

لائن کا ایک شعور ہوتا ہے اس کا تجربہ اس کی بصیرت ومہارت ہوتی ہے جیسے ڈاکٹری، انجنیری، وکالت، سائنس وغیرہ ایسے ہی دین کی بھی ایک سمجھ ہوتی ہے ۔۔۔ علماء لکھتے ہیں کہ کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ خدائے پاک کا اس کے لیے کیا ارادہ ہے؟ مگر جس کو رب اکرم نے دین کی سمجھ عطا فرمائی ہو اس کے لیے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے بھلائی چاہتے ہیں۔'' مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُّفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ ''۔

(۲) دولت وعلامت: دنیا سے دل کا فارغ ہوجانا، بے رغبت ہوجانا۔ کیوں کہ قلب کا کام معرفت کا ہے کہ وہ رب العالمین کو پہچانے۔ اگر قلب میں دنیا ہے تو معرفت ربّ حاصل نہ ہوگی۔

(۳) علامت: یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کسی بندے کو اس کے عیوب اور اس کی کمزوریوں پر مطلع فرمادیں کہ اس کو اپنی برائیاں نظر آئیں، غیروں کی نہیں۔ جب کہ آج ساری دنیا کا حال اس کے برعکس ہے (فیض ابرار ۲/۲۹۴)۔

برف سے شرف تک

جیسے ہم نے کہا تھا کہ اگر کوئی شخص روزمرہ کے واقعات پر عبرت ومعرفت کی نگاہ ڈالے تو دنیوی احوال سے بھی اسے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا سامان میسر ہوسکتا ہے اور اصلاح زندگی کی توفیق حاصل ہوسکتی ہے۔ اسی کو سمجھانے کے لیے ایک بزرگ کا واقعہ نقل کیا جاتا ہے تاکہ اس طرف ہمارا بھی دھیان ہمیشہ نہ سہی کبھی کبھی تو جایا کرے۔

حضرت شیخ ابرار احمد صاحب دھلیوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب فیض ابرار میں ایک بزرگ کا بڑا عجیب واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے مریدین میں سے ایک نے یہ پوچھا کہ

حضرت آپ کو یہ ولایت کیسے ملی؟ حضرت نے فرمایا اس طرح کہ میں ایک مرتبہ راستہ پر سے گزر رہا تھا میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھوں میں برف کی سِل اٹھائے ہوئے تھا اور وہ یہ آواز دے رہا تھا ''اے اللہ کے بندو مجھ پر رحم کرو اور مجھ سے یہ برف خرید لو۔ کیوں کہ میرا ہر لمحہ گھاٹے میں گذر رہا ہے'' (کیوں کہ برف ہر لمحہ پگل کر پانی بن جاتی ہے) تو میں نے غور کیا کہ اس کا تو ہر لمحہ صرف دنیوی گھاٹے میں گزرتا ہے، لیکن میرا تو ہر لمحہ اُخروی گھاٹے میں گزرتا ہے۔ تب سے میں نے یہ طے کیا کہ اب ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے کاموں میں صرف کروں گا اور اس عہد پر میں ہمیشہ قائم رہا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس برف والے سے (ولایت کا) یہ شرف بخشا۔ یہ ہے برف سے شرف تک۔ اللہ تعالیٰ ہماری نگاہِ عبرت کو کھول دے اور اپنا مقرب بنادے۔ آمین۔

اولیاء اللہ اور ان کے کچھ درجات

بحث معرفت کے بعد مناسب ہے کہ اولیاء کے درجات کی کچھ تفصیل پیش کی جائے تا کہ ہم میں بھی بلند ہمتی آئے اور اس راستے پر ہمارے بھی قدم اٹھیں چاہے جس قدر بھی ہو ۔حضرت شیخ ابرار احمد دھلیوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے کہ علمائے اسلام فرماتے ہیں کہ نبوت تو وہبی ہے اور ولایت کسبی۔ ان کی مثال اس طرح سمجھئے کہ نبوت ورسالت کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی خاص قسم کا گریڈ (درجہ) ہو جو حاکم کی طرف سے ملے۔ اور ولایت کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی ڈگری ہو جس کو آدمی کوشش کر کے حاصل کرے۔

مطلب ولایت کوشش سے حاصل ہو سکتی ہے لیکن نبوت ورسالت کا حاصل کرنا دشوار ہی نہیں بل کہ ناممکن ومحال ہے۔ اور محققین نے لکھا ہے کہ ولایت بھی اللہ ہی کے فضل سے ملتی ہے ۔البتہ اسباب ولایت کسبی ہیں، مثلاً اتباع سنت ،تقویٰ اور ذکر اللہ کی کثرت اور معرفت کا

حاصل کرنا وغیرہ۔ (فیض ابرار ۱۴۶/۴) اللھم ارزقنا منہا۔

ولی کون ؟

شرح عقائد میں ہے ''وَالْوَلِیُّ ھُوَ الْعَارِفُ بِاللّٰہِ تَعَالٰی وَصِفَاتِہٖ حَسْبَ مَا یُمْکِنُ، الْمَوَاظِبُ عَلَی الطَّاعَاتِ المجتَنِبُ عَنِ الْمَعَاصِیْ اَلْمُعْرِضُ عَنِ الْاِنْہِمَاکِ فِی اللَّذَّاتِ وَالشَّھَوَاتِ'' (شرح عقائد ۱۰۵)۔ ولی وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی اور اس کی صفات کی جس قدر ممکن ہو معرفت حاصل ہو جو عبادات کا پابند ہو، معاصی سے اجتناب کرنے والا ہو، لذات وشہوات میں انہماک سے کنارہ کش ہو۔

ولی کی مذکورہ تعریف بالکل واضح ہے۔ البتہ ''حسب استطاعت بمعنی قدر امکان، کچھ محتاج تفصیل ہے۔ ملا عصام الدین نے حاشیہ میں بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔ لکھا ہے کہ حصول معرفت بحسب استطاعت میں دو احتمال ہیں، پھر دونوں پر اعتراض کیا ہے اور جواب بھی دیا ہے۔

(۱) حصول معرفت بحسب استطاعت سے مراد اگر ''استطاعت بالنوع یعنی نوع ولی'' کے لیے استطاعت کا ممکن ہونا مراد ہو اور مطلب یہ ہو کہ نوع ولی کے لیے جو استطاعت ممکن ہو وہ اگر کسی کو حاصل ہو تو وہ ولی ہوگا۔ تو اس سے افضل نوع (یعنی فرد کامل) کی ولایت تو ثابت ہوگی لیکن غیر افضل نوع کے ولایت کی نفی لازم آئے گی۔

(۲) اگر استطاعت بالمعرفت سے معین شخص کی استطاعت مراد ہو کہ کوئی بھی مخصوص شخص اپنی بساط کے بقدر معرفت حاصل کرے تو وہ ولی ہوگا۔ تو اس سے لازم یہ آئے گا کہ وہ شخص ولی نہ ہو جو وقت ضائع کردے باوجودیکہ اس کا معرفت سے تعلق اور اس سے شغل ہے۔ اس لیے کہ اس

نے اپنی استطاعت کے بقدر معرفت حاصل نہیں کی کیوں کہ اگر وہ اس وقت کو معرفت میں صرف کرتا تو مزید معرفت حاصل ہوتی۔

لیکن اس احتمال ثانی میں اس محروم شخص کی ولایت بھی تھوڑی سی تبدیلی سے ثابت ہوسکتی ہے۔ وہ یہ کہ ولایت کا مدار تضییع اوقات پر نہ ہو بل کہ اس کا مدار اللہ تعالیٰ کی طرف سے لطف عطا کرنے اور اسے حاصل کرنے پر ہو۔ اور مطلب یہ ہو کہ اس فائت الوقت کو ایک عرصہ تضییع اوقات کے بعد من جانب اللہ توبہ کی توفیق حاصل ہوجائے جس سے اب تا موت معرفت حاصل کرنا ممکن رہے۔ گویا حسب استطاعت کا تعلق توفیق توبہ کے بعد سے ہے کہ اس کے بعد پورا وقت معرفت میں صرف کرے اور یہ سلسلہ خاتمہ تک برقرار رہے تو وہ ولی ہوگا اگر چہ قبل التوبہ ولایت کا اہل نہیں تھا۔ واللہ اعلم (حاشیہ ملا عصام شرح عقائد ۱۰۵)۔

ولی کے دو معنی ہیں۔ ایک وہ شخص ہے جس کے معاملات کا اللہ تعالیٰ متولی ہوگیا ہو۔ یعنی وہ خدا تعالیٰ کی تولیت میں رہتا ہو۔ ایک لحظہ کے لیے بھی اس کے نفس کے حوالے نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی طاعت وعبادت میں ایسا مشغول رہے کہ عصیان کا گزر ہی نہ ہو۔ ''بِعِبَادَةٍ تَجْرِیْ عَلَیْهِ عَلَی التَّوَالِیْ مِنْ غَیْرِ اَنْ یَتَخَلَّلَهَا عِصْیَانٌ'' (حاشیہ نبراس محمد برخوردار ۴۷۵)۔ ملا جامی نفحات میں فرماتے ہیں کہ ولی وہ ہے جو مشاہدۂ حق میں ایسا مستغرق ہو کہ اپنے نفس کی بھی خبر نہ ہو اور غیر اللہ کے ساتھ قرار نہ ہو۔

قرآن شریف کا ارشاد ہے ''اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ ○''۔ (یونس ۶۲، ۶۳)۔ روح المعانی میں ہے کہ ولی کی جمع اولیاء ہے ولی وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ سے ایک مخصوص قرب ونزدیکی حاصل ہو۔ اس کے بعد انہوں نے ایک درجہ بیان کرنے کے بعد، دوسرے درجات مختلف شرائط وقیود کی رعایت اور ان پر اعتراض

وجواب کے ساتھ بیان کئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) سب سے کم رتبہ ولی وہ ہے جو فرائض کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے والا ہو۔ ''اللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا '' (سورۃ بقرہ ۲۵۰)۔

(۲) درجہ آیت بالا میں '' اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ '' سے معلوم ہورہا ہے۔ جب اس کو ''جملہ مستانفہ'' مانیں تو یہ جملہ خود اولیاء کی تفسیر بنے گا، اور مطلب یہ ہوگا کہ اولیاء وہ ہیں جو مومن ومتقی ہوں۔

لیکن تقویٰ کے بھی مختلف درجات ہیں۔

الف : اگر تقویٰ سے مراد ایسا کامل تقویٰ مراد ہو جس کو قرآن نے '' اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ '' سے بیان کیا ہے جس میں کامل استغراق بالحق پایا جائے جو شہود حق اور اس کے حضور وقرب کا باعث ہو تو یہ درجہ صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہوگا۔ کیوں کہ ایسا تقویٰ جو کامل استغراق وشہود کا سبب ہو یہ صرف انبیاء ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ اب '' اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ۔ اَنْبِیَاءَ اللّٰہِ '' کے معنی میں ہوگا۔ تو اب کہیں گے کہ انبیاء علیہم السلام، نبوت وولایت دونوں کے جامع ہیں۔

ب : اگر کامل استغراق سے کم رتبہ تقویٰ کا مراد لیں تو یہ درجہ مومن متقی کا ہوگا۔

(۳) اگر آیت بالا کا مذکورہ جملہ، مستانفہ نہ مانیں بل کہ ''اولیاء کی صفت'' قرار دیں تو پھر مذکورہ بالا درجات اس جملہ سے ثابت نہ ہوں گے، لیکن یہ احتمال غیر وزنی ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ وَلِیٌّ بروزن فَعِیْلٌ میں دو احتمال ہیں۔ یا تو بمعنی فاعل ہو یا بمعنی مفعول، بہر دو صورت ولی کی تفسیر یہ ہوگی کہ ولی وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی تولیت میں رہے اور وہ مسلسل طاعت وعبادت پر قائم رہے۔ (امام قشیری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں وصف (تولیت یعنی دیکھ بھال اور مسلسل طاعت) ولایت میں شرط ہیں۔ مگر ہاں اللہ تعالیٰ کی

تولیت کا وصف، مجذوب میں اور تسلسل طاعت کا وصف، مرید سالک میں غالب ہوتا ہے)

یہ مذکورہ تفصیل اس پر دال ہے کہ معصیت منافیٔ ولایت ہے کہ اگر کوئی گناہ پیش آ گیا تو وہ ولی نہیں رہ سکتا۔ یعنی ولایت کے لیے عصمت شرط ہے۔ چناں چہ اکثر حضرات اسی کے قائل بھی ہیں۔

لیکن اس پر اعتراض ہوگا کہ عصمت صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے غیر نبی کے لیے اہل حق عصمت کے قائل نہیں۔ دوسری طرف اہل حق غیر نبی کے ولی ہونے کے بھی قائل ہیں پھر تو دونوں میں جمع وتطبیق مشکل ہے۔ اسی لیے بعض حضرات نے یہ کہہ کر اس سے چھٹکارہ حاصل کرلیا کہ اولیاء اگر چہ معصوم تو نہیں ہوتے ان میں صدور معصیت کا امکان رہتا ہے پھر بھی وہ محفوظ ضرور ہوتے ہیں۔

اکثر حضرات کے برخلاف عند البعض معصیت منافیٔ ولایت نہیں (فلا حاجة الی قیل وقال)۔ ان بعض کی دلیل یہ کہ حضرت جنید رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا "هَلْ يَزْنِي الْعَارِفُ؟" تو فرمایا "نَعَمْ" "وَكَانَ أَمْرُ اللهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا"۔ لیکن فریقِ اول اس دلیل کا یہ جواب دیتا ہے کہ حضرت جنیدؒ کا جواب اور سائل کا سوال دونوں امکان معصیت پر محمول ہیں وقوع سے بحث نہیں۔ ادھر یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ غیر نبی میں صدور معصیت کا امکان ہوتا ہے۔ اور منافیٔ ولایت وقوعِ معصیت ہے نہ کہ اس کا صرف امکان۔

یہ بات یقینی بھی ہے اور اتفاقی بھی، کہ ولی سے جب صدور معصیت ہو تو وہ ولی نہ رہے گا۔ کیوں کہ ولایت کا مدار ہی تقویٰ پر بل کہ ایمان پر ہے (کوئی غیر متقی وغیر مؤمن ولی ہو نہیں سکتا) جب صدور معصیت سے تقویٰ وایمان دونوں متأثر ہوتے ہیں تو ولایت کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔

بعض نے ولایت کی اس طرح دو قسمیں کی ہیں۔(۱)ولایت صغریٰ۔(۲)ولایت کبریٰ۔

(۱) ولایت صغریٰ وہ ہے جس میں ذنب (گناہ) کا صدور ہو لیکن کبھی ہو اور بہت جلد اس سے باز آ جائے۔ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ وقوع ذنب منافی عصمت نہیں لہٰذا وقوع کے باوجود ولایت منقطع نہیں ہوگی۔ ہاں منافیٔ عصمت، وقوع کا تکرار اور اس کی کثرت ہے، اور وقوع کے بعد اس سے باز نہ آنا ہے۔

(۲) ولایت کبریٰ وہ ہے جس میں ذنب کا وقوع بالکل نہ ہو البتہ اس کا امکان رہتا ضرور ہے۔ علامہ آلوسی صاحب روح المعانی رحمہ اللہ تعالیٰ اس تقسیم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ صغری وکبریٰ کی تقسیم ہے تو اچھی، لیکن اس سے بہت سوں (نااہل) کے لیے ولایت کے دعویٰ کا دروازہ کھل سکتا ہے واللہ اعلم۔ (روح المعانی ۱۹۶ تا ۱۱/۱۹۷)۔

مفسر قرآن حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے بھی معارف القرآن میں قدرے تفصیل بیان کی ہے لیکن وہ سب ہی مذکورہ تفصیل کے تحت آ جاتی ہے اس لیے ہم صرف اس کا خلاصہ پیش کر دیتے ہیں۔

ایک ہے ولایت خاصہ اور ایک ہے ولایت عامہ۔ ولایت خاصہ کے درجات۔

(۱) خدا سے ایسا کامل تقرب جس کی وجہ سے بندہ کا ہر کام اللہ تعالیٰ کی عنایت وتوجہ کے تابع ہو جائے (جیسا کہ حدیث قدسی میں بندے کے کان وغیرہ اعضاء بننے کا ذکر ہے) یہ ولایت خاصہ ہے۔ پھر اس کے بے شمار درجات ہوں گے۔ سب سے اعلیٰ درجہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پھر دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کا۔

(۲) اسی ولایت خاصہ کا ادنیٰ درجہ ولایت عامہ کا ہے۔ جس کو اصطلاح صوفیاء میں درجہ فنا کہا جاتا ہے۔ اس فنا کا خلاصہ دو چیزیں ہیں۔

(الف) : کسی سے محبت وبغض اور دوستی اور عداوت کا صرف اللہ کے لیے ہونا۔

(ب) : ہر حال میں احکام کی اطاعت۔ یہ دو وصف ولایت کی گویا شرط ہیں۔ ایک بھی فوت ہو تو وہ اس درجہ میں شامل نہ ہوگا۔ یہ دو شرط جس میں ہوں گی وہ ولی اللہ کہلائے گا۔ اب اس میں بھی اعلیٰ وادنی کئی درجات ہوں گے۔

(۱) جس میں وہ دونوں وصف جس قدر اعلیٰ ہوں گے اس قدر ولایت میں اس کا درجہ اعلی ہوگا۔

(۲) اوسط میں اوسط

(۳) ادنی میں ادنی۔ مطلب درجہ فنا میں بھی کچھ درجات ہیں۔

علامتیں : ولایت کی کچھ علامتیں مذکور ہیں۔

(۱) محبت وعداوت صرف اللہ کے لیے ہو۔ (لیکن صرف اللہ کے لیے ہونے کو معمولی نہ سمجھا جائے وہ بھی محتاج تفصیل ہے۔ مطلب ہر ہر چیز میں محبت وعداوت صرف اور صرف اللہ کے لیے ہو نفس کا ذرا بھی دخل نہ ہو)۔

(۲) علامت حدیث قدسی میں مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے بندوں میں سے میرے اولیاء وہ لوگ ہیں جو میری یاد کے ساتھ یاد آویں اور جن کی یاد کے ساتھ میں یاد آؤں۔

خلاصہ جن کو دیکھنا اور جن کا تذکرہ یاد الٰہی کا ذریعہ ہو۔ مطلب جن کے ساتھ رہنے سے جن کی ملاقاتوں سے اللہ تعالیٰ کی یاد وذکر کی توفیق حاصل ہو اور دنیوی فکروں میں کمی محسوس ہو آخرت کی طرف رغبت ہو وہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء ہیں (معارف القرآن ۵۴۸/۴)۔

(۳) کامل متبع سنت ہو۔

(۴) جن کا ظاہر سر سجدے میں، زبان ثناء میں، دل ذکر میں، روح فکر میں، ہاتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح سخاوت میں، آنکھ معرفت کے دیکھنے میں، قدم مسلمانوں کی زیارت میں، کان

کلام الٰہی کے سننے میں اور معروفات پر کمر بستہ ہو۔ (مفتاح العارفین حضرت سلطان باہو ۵۱)۔

تَنَبُّہ: بحث ولایت میں ذکر اللہ سے ایسا ذکر ہر گز مراد نہیں کہ زبان تو ذاکر ہو اور دل غافل ہو۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نوافل اور اذکار و اوراد سے قلب میں جو انوار پیدا ہوتے ہیں اس سے ایک روحانی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس طاقت کا استعمال بارگاہ خلوتِ حق میں نہیں ہے بل کہ (۱) اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آنا، (۲) بے جا غصہ کو ضبط کرنا، (۳) بدنظری سے آنکھوں کو محفوظ رکھنا، (۴) مخلوق کی خطاؤں کو معاف کرنا، (۵) شہوت اور غضب سے مغلوب نہ ہونا، (۶) کسی کو حقیر نہ سمجھنا، (۷) انتقام نہ لینا، (۸) اپنے کو مخلوق خدا کا خادم سمجھنا، (۹) مؤمن کا اکرام کرنا، (۱۰) اپنے کو بڑا نہ سمجھنا وغیرہ میں ہے۔ اگر خلوت میں ذاکر و شاغل ہے اور مخلوق خدا پر ظالم اور مغلوب الغضب ہے تو اس نے روحانی طاقت کا صحیح استعمال نہیں کیا (کشکول معرفت ۵۱۵)۔ حضرت نے واقعی بڑی عمدہ باتیں فرمائیں۔

اولیاء اللہ کے مختلف درجات

ویسے اولیاء کے مختلف درجات کی کچھ اصطلاحات بھی ہیں جو تصوف و سلوک کی کتابوں میں زیر بحث آتی ہیں۔ مثلا: غوث، قطب، ابدال، نقباء، نجباء، اوتاد، قطب مدار اور قطب ارشاد وغیرہ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

یہ درجات، لطائف سبعہ پر مرتب ہیں (نقشبندیہ)۔

(۱) لطیفۂ اول قلب ہے۔ جس کے سالک کا نام ''بدرالدین'' بنتا ہے۔ وہ اولیاء اللہ میں سے

ایک ولی ہوتا ہے۔

(۲) لطیفۂ دوم روحی ہے۔ جس کے سالک کا نام ''نجم الدین'' بنتا ہے۔ وہ نقباء اولیاء اللہ میں سے ایک نقیب ہوتا ہے۔

(۳) لطیفۂ سوم سرّی ہے۔ جس کے سالک کا نام ''نورالدین'' بنتا ہے۔ وہ نجباء اولیاء اللہ میں سے ایک نجیب ہوتا ہے۔

(۴) لطیفۂ چہارم سِرُّ السِّرّی ہے۔ جس کے سالک کا نام ''شمس الدین'' بنتا ہے۔ وہ ندبا اولیاء اللہ میں سے ایک ندیب ہوتا ہے۔

(۵) لطیفۂ پنجم خفی ہے۔ جس کے سالک کا نام ''حسام الدین'' بنتا ہے۔ وہ ابدال اولیاء اللہ میں سے ایک بدل ہوتا ہے۔

(۶) لطیفۂ ششم اِخفا ہے۔ جس کے سالک کا نام ''جمال الدین'' بنتا ہے۔ وہ اوتاد اولیاء اللہ میں سے ایک وتد ہوتا ہے۔

(۷) لطیفہ ہفتم قدسی ہے۔ جس کے سالک کا نام ''کمال الدین'' بنتا ہے۔ وہ قُطُبُ وغوث اولیاء اللہ میں سے ایک قُطب ہوتا ہے۔ (مفتاح اللطائف حضرت خواجہ محمد اسلم ۴۳تا۴۹)۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ کے لیے فرمایا گیا ہے کہ آپ مجموعہ ''قطب مدار'' یعنی باعث بقاء جان عالم اور ''قطب ارشاد'' یعنی باعث بقاء ایمان عالم تھے[1]۔ (کتاب جواہر مجددیہ سوانح حضرت شیخ احمد سرہندیؒ ۴۹)۔

---

[1] نیز معرفت کے تین درجات ہیں (۱) واحدیّت، (۲) وحدت، (۳) احدیّت۔ مرتبہ احدیت تمام مراتب کی جائے صدور ہے (مفتاح اللطائف ۴)۔

پیر چار طرح کے ہوتے ہیں۔ (۱) پیر بیعت۔ (۲) پیر خرقہ، (۳) پیر ارشاد، (۴) پیر صحبت۔ (ترجمہ انتباہ المریدین ۷ حضرت شیخ محمد چشتیؒ)۔

(۷) ذاتی اصلاح سب امور سے مقدم ہے

کسی بھی اجتماعی کام کا مبدأ، فرد وذات ہوتا ہے یعنی اصول یہ ہے کہ ہر کام ذات سے شروع ہوکر اوروں تک اور جماعتوں تک پہنچتا ہے۔ دوسروں کو کسی خطرے سے وہ ہی بچا سکتا ہے جو خود اس خطرے سے محفوظ ہو۔ دوسروں کو وہی سنوار سکتا ہے جو پہلے اپنے کو سنوارے۔ اسی بات کو سمجھنے کے لیے قرآن کریم کے ارشاد کو پڑھئے اور غور کیجئے۔ ’’اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَاٰتُوْا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ ۔۔الخ آية‘‘ (نساء ۷۷)۔ (اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو یہ کہا گیا تھا کہ (ابھی) اپنے ہاتھوں کو (لڑنے سے) روکے رکھو اور ’’پہلے‘‘ نماز قائم کرو اور زکات دیا کرو پھر ان پر جہاد فرض کیا گیا تو۔۔۔

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ اللہ تعالی نے اس آیت کریم میں پہلے نماز قائم کرنے اور زکات ادا کرنے کا حکم دیا۔ جو نفس کا جہاد ہے پھر جہاد بالسیف کا حکم دیا۔ معلوم ہوا کہ جہاد بالنفس مقدم ہے جہاد بالسیف پر یعنی ذاتی اصلاح مقدم ہے (روح المعانی ۵/۱۱۲)۔ اور حضرت مفتی محمد شفیعؒ صاحب فرماتے ہیں کہ پہلے نماز اور زکات کے احکام کو بیان فرمایا جو اصلاح نفس کا سبب ہے اس کے بعد جہاد کا حکم دیا جو اصلاح ملک کا سبب ہے۔ معلوم ہوا کہ آدمی کو دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ چناں چہ درجہ کے اعتبار سے قسم اول کا حکم فرض عین ہے اور قسم ثانی کا فرض کفایہ۔ (معارف القرآن ۲/۴۸۲)۔ اسی طرح کی بات حدیث شریف سے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

’’عَنْ قَتَادَةَ رضی اللہ عنہ بَابٌ مِنَ الْعِلْمِ يَحْفَظُهُ الرَّجُلُ لِصَلَاحِ نَفْسِهٖ وَصَلَاحِ مَنْ بَعْدَهٗ اَفْضَلُ

مِنْ عِبَادَتِ حَوْلٍ" (طبی ۱/۳۴۷۳)۔حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آدمی کا علم کے ایک باب کو اس لیے سیکھنا تا کہ اس کے ذریعہ اپنی اصلاح کرے اور اپنے علاوہ کی بھی اصلاح کرے ایک سال کی (نفلی) عبادت سے بہتر ہے۔اس خبر واثر سے بھی یہ ثابت ہوا کہ پہلے اپنی اصلاح کا درجہ ہے پھر دوسروں کی اصلاح کا۔

ان نصوص کی روشنی میں یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ امام کو اپنی ذاتی اصلاح کی طرف توجہ پہلے کرنی چاہیے۔لہٰذا امام پابند شرع کامل متبع سنت، زہد وتقویٰ،صدق وامانت کا پیکر ہو اور وہ شفقت وخیر خواہی کا خوگر ہو کر ھَادِیْ اِلَی الْاِطَاعَۃِ اور جذبہ خلوص سے سرشار ہو کر دَاعِیْ اِلَی السُّنَّۃِ وَالشَّرِیْعَۃِ ہو۔کیوں کہ امامت دیگر دنیوی پیشوں کی طرح کوئی پیشہ نہیں بل کہ ذمہ داری کا ایک اہم منصب ہے جس کے لیے مقتدیوں کی اصلاح کی فکر کے ساتھ خود کی اصلاح کی بھی ضرورت ہے۔

کچھ ممالک کی بعض مسجدوں کے اماموں کا یہ حال کہ جب وہ امامت کے لیے جائے نماز پر آتے ہیں تو مصنوعی وضع قطع اختیار کر لیتے ہیں اور فراغت کے بعد انہیں اتار کر رکھ لیتے ہیں۔گویا دنیوی مختلف اداروں کے یونیفارم کی طرح ایک وقتی یونیفارم اور شکل وصورت اختیار کر لیتے ہیں۔یہ امامت نہیں امامت کے نام پر دنیوی پیشہ ہے۔دراصل یہ دشمنان اسلام یہودیوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔اَللّٰھُمَّ احفظنا مِنْ ذٰلِكَ۔ افسوس امت رسومات میں اس طرح کھوگئی کہ اس نے اپنی مذہبی عبادتوں اور امامت جیسے پروقار عہدوں کو بھی نہیں بخشا۔

شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کا خیال تھا کہ مصلح بننے سے پہلے صالح بننا ضروری ہے۔اس کو اس طرح بیان فرماتے کہ میرے خیال میں اصل مقصود تو ہر شخص کو اپنے نفس کی اصلاح ہے،فرائض وواجبات وعبادات وغیرہ ادا کرتا رہے اور اللہ اللہ کرتا رہے۔اگر اللہ کو

اس سے کوئی کام لینا مقصود ہوتا ہے تو خود اس کی طبیعت کو اس کی طرف متوجہ کردیتے ہیں اور بطریق الہام یا بحکم شیخ اسے کوئی کام سپرد کردیا جاتا ہے۔فرمایا دیکھو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حالاں کہ ازکی النفس ہیں مگر آپ کو بھی جب تک مامور من اللہ نہیں کیا گیا غار حرا میں تشریف لے جاکر انفرادی طور پر اللہ کی عبادت کرتے رہتے تھے۔حالاں کہ قوم کی بے اعتدالیاں، بت پرستی اور ظلم وغیرہ دیکھتے تھے مگر کسی سے تعرض نہیں کیا لیکن جب فرشتہ نازل ہوا اور فرمایا "بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ" تو آپ غار حرا کو چھوڑ کر کمر باندھ کر کھڑے ہوگئے اور اس فرض کو ادا کیا (تزکیہ واحسان ۱۴۹)۔

اصلاح اور حضرت حکیم الامت کی باریک نظر

حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنی حالت کا علم ہے کہ مجھ میں اصلاح کی کیا ضرورت ہے" بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ " انسان خود اپنی حالت پر خوب مطلع ہے گو اپنے حیلے پیش کرے۔ یعنی انسان اپنی حالت خوب جانتا ہے کہ وہ بہت سے کام شریعت کے خلاف کرتا ہے لیکن اس کی ظاہری وضع قطع اور نماز وروزہ کی وجہ سے لوگ اس کے معتقد ہوجاتے ہیں تو اس سے وہ خود بھی دھوکہ میں پڑجاتا ہے اور اپنے نفس کا وہ خود بھی معتقد ہوجاتا ہے۔کیوں کہ وہ دیکھتا ہے کہ اتنے آدمی مجھے دیندار سمجھتے ہیں گویا میری دینداری پر اجماع ہوچکا ہے اور اتنے آدمیوں کا اجماع غلط نہیں ہوسکتا۔

مگر میں کہتا ہوں کہ اجماع کہاں ہوا ہے ابھی ایک مسلمان کا اختلاف باقی ہے اور وہ اختلاف ایسے شخص کا ہے جس کا اختلاف اجماع میں قادح (نقصان دہ) ہے وہ مسلمان کون ہے؟ وہ تم خود ہو۔کیوں کہ تمہارا دل تو جانتا ہے کہ تم دیندار نہیں ہو پھر یہ اجماع کیوں کر حجت ہوسکتا ہے۔

اتنی اوراس کے علاوہ بہت ساری خرابیوں کے ہوتے ہوئے ہم کیسے اپنے آپ کے معتقد ہوسکتے ہیں اور کیسے دیندار ہوسکتے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں۔ " وَلَامُشَاحَۃَ فِیْ الْاِصْطِلَاحِ" اصطلاح مقرر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، سوہم آپ کی اصطلاح میں مزاحمت نہیں کرتے ممکن ہے آپ کے نزدیک دیندار کی بھی دوقسمیں ہوں۔ ایک حقیقی دیندار۔ دوسرا جس کولوگ دیندار سمجھیں (خطبات حکیم الامت وخیر الاعمال ۵۲۹)۔

حضرت فرماتے ہیں کہ ہر زمانہ میں اہل زمانہ میں مختلف امراض پائے جاتے رہے ہیں۔آج ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہماری نظر ہمہ تن دنیا پر ہے اس دین پر نہیں جس پر فلاح کا مدار ہے۔ یہ مرض عوام میں بھی ہے اوران دینداروں میں بھی جو اپنے کو دیندار سمجھتے ہیں (جن کا ذکر اوپر گزرا)۔ دنیا پر نظر کی وجہ سے ان دونوں کے نزدیک وقعت دنیاداروں کی ہوتی ہے نہ کہ حقیقی دینداروں کی۔

مثلاً ان کے پاس ایک دنیادار آوے اور ایک حقیقی ایسا دیندار آوے جس کو نہ کوئی عزت حاصل ہو نہ مال نہ وہ شیخ وبزرگ ہو نہ وہ اصطلاحی عالم ہو ہاں بقدر ضرورت علم رکھتا ہو اور واقع میں دیندار ہو تو میں بقسم کہتا ہوں جو قدر ووقعت ان کی نظر میں اس دنیادار کی ہوگی وہ اس دیندار کی نہ ہوگی۔

حق یہ ہے کہ نفوس میں عموماً دنیا کی طرف میلان ہے کہ ظاہری جاہ ومال دیکھا جاتا ہے اگرچہ یہ جاہ دین کی وجہ سے حاصل ہو۔ مثلاً بزرگوں میں سے بھی اسی بزرگ کی تعظیم کریں گے جس کی چار آدمی تعظیم کرتے ہوں اس لیے کہ اس کی تعظیم وخدمت کرنے سے عار نہیں ہوگی۔ یہ نفس کا مخفی مکر ہے۔

ظاہراً تو یہ تعظیم وخدمت نہایت صلاح پر دال ہے لیکن اس کا راز اوراس میں نفس کی

چال یہ ہے کہ ان بزرگ کی خدمت اور تعظیم اسی لیے کرتے ہیں تاکہ اس فعل سے لوگوں کی نظر میں اپنی بڑائی حاصل ہوتی ہے۔ پس یہ تعظیم اپنی ہی تعظیم کے لیے ہے اسی واسطے اس خدمت اور تعظیم سے نفس خوش ہوتا ہے (خطبات ۳۳۰)۔ اللہ اکبر کتنی بڑی بات حضرت نے سمجھائی بالکل صحیح تشخیص فرمائی ہے دکھتی رگ پکڑی ہے۔ بس اللہ کرے ہماری سمجھ میں آجائے۔

حضرت یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہم اسلام پر رونا رو رہے ہیں لیکن اپنی خبر نہیں لیتے جو لوگ اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ اپنی خدمت کریں جب وہ خود درست ہوجائیں گے تو اسلام بھی درست ہوجائے گا۔

اسلام کی اصل خدمت یہ ہے کہ تم اپنی اصلاح کرو اور اپنے اعمال واقوال اور اپنے احوال اسلام کے مطابق بناؤ۔ جب تمہاری کامل اصلاح ہوجائے گی تو اسلام کو ترقی حاصل ہو ہی جائے گی۔ ہمارے اعمال کی صورت بھی شریعت کے موافق نہیں تو یہ کیوں کر کہا جائے گا کہ ہمارے اسلام میں صورت اسلام ہے بس یہی کہا جائے گا اسلام نام کا رہ گیا ہے۔

اصلاح کی تدبیر

حضرت ارشاد فرماتے ہیں کہ پہلے یہ یقین کرلو کہ جو کام تم خود کو کرنا ہے وہ دوسروں کے کئے نہ ہوگا اگر دوسروں کے لیے کچھ ہوسکتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کا کام کرنے کیوں کافی نہ ہوجاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی کوشش کی کہ ابو طالب ایمان لے آئیں مگر وہ ایمان نہ لائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی کچھ نہ کرسکیں۔ (خطبات حکیم الامت ۵۸۳)۔

راقم کہتا ہے کہ اصلاح کرنے والا پہلے منکرات کے ازالہ کی طرف توجہ کرتا ہے تاکہ عبادتوں اور اعمال کا ذخیرہ ''هَبَاءً منثورًا'' کی نذر نہ ہوجائے صرف اعمال کے ذخیرے کی

طرف توجہ نہیں کرتا۔

لہٰذا جب اصلاح کا پختہ ارادہ کرلیا جائے تو پہلے ان منکرات اور برائیوں کی تعیین کی جائے جن کو اپنے سوا کوئی نہیں جانتا۔ مثلاً دوسروں کی تحقیر، بدنظری، حسد وکینہ، غیبت بل کہ چغلی، دوسروں کی وقعت گرانا حب جاہ حب مال وغیرہ وغیرہ۔

اب ان میں سے ایک ایک کو نکالنے کے لیے خوب مجاہدہ کریں اور نفس سے خوب جہاد کریں۔ بالقصد اپنی عظمت مٹائیں اور اللہ تعالی کی عظمت دل میں لائیں اس کا خوف دل میں لائیں اور آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت کے واسطے سے آپ کی بیان کردہ سزاؤں اور وعیدوں کو یاد کریں اس کا یقین کریں اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کریں۔

پہلی بار جب اصلاحی قدم اٹھائیں گے تو یقیناً آپ کو سوفیصد بوجھ پڑے گا آپ بالکل بآسانی قدم نہیں اٹھا سکیں گے لیکن ایک بار جب نفس کو ہمت سے پچھاڑ دیں گے تو دوسری بار اتنا بوجھ نہیں پڑے گا جتنا پہلی بار۔ پھر آپ نفس کو بچھاڑتے رہیے یہی ہے نفس اور رب کی معرفت "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالْفَنَاءِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ بِالْبَقَاءِ "۔ ترجمہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا جس نے اپنے نفس کے فانی ہونے کو سمجھ لیا اس نے اپنے رب کے باقی ہونے کو سمجھ لیا۔ نفس کی شناخت توفیق الٰہی سے ہوتی ہے اور رب کی شناخت نور معرفت اور باطنی صفائی سے ہوتی ہے (مفتاح العارفین ۸)۔

شہادت اور روزمرہ کے مجاہدات

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں ایک بار میرے دل میں بار بار یہ خیال آنے لگا کہ تو کیسا ذلیل ہے کہ فلاں جگہ جنگ ہورہی ہے اور شہادت سے اپنے کو باز رکھ رہا

ہے، ویسے دینداری کی باتیں کرتا ہے، جا اور شہید ہو جا۔ کیا تجھے شہادت کا مرتبہ معلوم نہیں ، یا معلوم ہے اس کا یقین نہیں یا شہادت سے گھبراتا ہے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ میں تردد میں تھا کہ کیا کروں؟ جب باریکی سے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ نفس کا فریب تھا وہ شہادت پر آمادہ اس لیے کر رہا تھا کہ وہ روز روز کے مجاہدوں سے گھبرا رہا تھا کہ یہ کیا قدم قدم پر گھستا اور پستا رہتا ہے، اس سے تو یہی بہتر ہے کہ ایک دفعہ میں معاملہ تمام ہو جائے۔

پھر حضرت نے فرمایا کہ نفس کی اس مکاری پر اگر سب ہی لوگ شہید ہو جائیں تو دین آگے کیسے پہنچے گا۔ معلوم ہوا کہ کبھی نفس کو مجاہدہ میں ڈالے رکھنا بھی شہادت سے بڑا مرتبہ رکھتا ہے۔ جیسے اس حدیث شریف "مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِیْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِیْ فَلَهٗ اَجْرُ مِأَةِ شَهِیْدٍ۔" (مشکوٰۃ ۳۰) سے معلوم ہو رہا ہے۔ کہ کبھی روز مرہ کے مجاہدات کا درجہ (شہادت سے) زیادہ بلند ہوتا ہے کیوں کہ ہر وقت نفس سے مجاہدہ کرنا رہتا ہے اور وہ وقت امت کے بگاڑ کا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں کہ تصوف نام ہے نفس پر ہر وقت خدا کے حکم کا آرا چلانے کا۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا "اُقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ بِسَیْفِ الْمُجَاهَدَةِ" (مفتاح العارفین ۴۰)۔

دور کرنے کے قابل ایک غلط فہمی

یہ بھی نفس کا ایک مکر ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ وہ از خود اصلاح نہیں کر سکتا اصلاح کے لیے بڑے پیر چاہیے یا تبلیغ کے چار ماہ چاہیے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ نفس اپنے اس مکر میں پھانس کر دوسرے مکر میں پھانسنے کی

کوشش کرتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی شیخ سے اصلاحی تعلق جوڑ لیا تو یہ خیال کر کے کہ اصلاح کے لیے تعلق ہی جوڑنا تھا جوڑ لیا بس اصلاح ہوگئی صرف دو چار عمل مثلاً تسبیحات ونوافل (نفلی اذکار وعبادات) اختیار کر کے بیٹھا رہے گا اور جو گناہ دور کرنے تھے ان سے بےفکر ہو کر رہ جائے گا۔

اب صرف شیخ کی خدمت میں آمد ورفت کی وجہ یہ بن جائے گی کہ لوگ مجھے دیکھتے رہیں کہ میں حضرت کا مرید ہوں۔ اب بتایئے اس میں اصلاح کیا ہوئی؟ اگر چہ اعمال اختیار کرنے کا ثواب حاصل ہو جائے گا لیکن یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس سے نفس، برائی کے کچھ اور دروازے کھول رہا ہے۔ اسی طرح تبلیغی چار ماہ کا مسئلہ [1]۔

---

[1] اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اصلاحی تعلق نہ جوڑا جائے۔ یا تبلیغی کام نہ کیا جائے۔ استغفر اللہ۔ دونوں کام کیے جائیں۔ بندہ خود بھی پیر رکھتا ہے لیکن بے دینی عام ہونے کی وجہ سے تبلیغی جدوجہد سے زیادہ منسلک ہے۔ کیوں کہ عوام اس قدر بے طلب ہیں کہ ان کے پاس جا کر ترغیب نہ دی جائے تو فرائض تو درکنار ایمان وتوحید سے بھی بیزار ہو جائیں۔ اس کا انکار تو وہ کرے گا جو بدنصیب ہو۔

یہاں صرف اصلاح کی اہمیت کو واضح کرنا ہے کہ تعلق کا حقیقی مقصد اور چار ماہ خروج کا حقیقی مقصد ہر مرید ومبلغ کے سامنے رہے وہ صرف تعلق جوڑ کر اور دو چار عمل اختیار کر کے بیٹھا نہ رہے، بل کہ شیخ کی عدم موجودگی میں جو دل کے گناہ تھے جن کو نہ شیخ دیکھ سکتا ہے نہ تبلیغی ذمہ دار دیکھ سکتے ہیں اور نہ کبھی مریدین سے ان کے بارے میں پوچھا جاتا ہے ان کو چھوڑے۔

مثلاً: اپنے بڑے ہونے کا خیال کرنا، دوسروں کی وقعت گرانا، اپنے کاموں میں غلو کرنا، خواہ مخواہ تکلفات برتنا، باطن کی فکر چھوڑ کر، صرف ظاہر کو سنوارنے میں لگے رہنا، خواہ مخواہ لوگوں سے بدظن ہونا، افواہ بازوں کا ساتھ دینا، غلط کاروں کا ساتھ دینا، وقت ضائع کرنا، غیبت کرنا، حسد کرنا اور بلاوجہ قہقہے لگاتے پھرنا وغیرہ وغیرہ۔

بندہ راقم الحروف مضمون بالا لکھ رہا تھا اس دوران حضرت حکیم الامت علامہ تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے جمع کردہ ملفوظات کی کتاب ''خطبات حکیم الامت'' پڑھ رہا تھا حسن اتفاق یہی مضمون سامنے آیا بے حد مسرت ہوئی جس کو مختصراً پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت مجدد الملت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''اگر مسلمانوں میں کسی کو دین کا تھوڑا بہت خیال بھی ہوتا ہے تو وہ دین اسلام کی ساری اصلاح کا طریقہ صرف بیعت ہونے کو سمجھتا ہے کہ بس کسی سے مرید ہو جاؤ پھر خود بخود اصلاح ہو جائے گی۔

بل کہ بعض تو یہ سمجھتے ہیں کہ پیر ہم سب کی طرف سے کافی ہو جائے گا ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پس یہ لوگ اعمال کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ہاں صرف پیروں کے نذرانہ کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ ناغہ نہ ہو۔

صاحبو جو کام تمہارے کرنے کا ہے وہ دوسروں کے کئے نہ ہوگا اگر دوسروں کے لیے کچھ ہو سکتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابوطالب کا کام کرنے کے لیے کیوں کافی نہ ہوتے۔۔۔(۸۳،۵۸۱)۔

بندے کی بات حضرت رحمہ اللہ کی بات کے بالکل موافق ہے۔فللہ الحمد۔

آسان ترین مطلوبہ اصلاح

آدمی کو چاہیے کہ وہ جہاں کہیں جس کسی سے بذریعہ وعظ و تقریر کچھ سنے یا کسی کتاب یا اوراق سے کچھ پڑھے تو فوراً اس سے جو کچھ اپنی اصلاح کی بات ملے قبول کرلے اور فوراً اپنی اصلاح کرلے۔اس طرح سے اپنی اصلاح آسان بھی ہے اور مطلوب بھی۔اصلاح کے کئی طریقے ہیں ۔مثلاً تنہائی میں فکر و تدبر سے کتاب پڑھنا، اصلاح و عبرت کی نیت سے وعظ سننا اور اسی نیت سے وعظ کرنا وغیرہ۔حدیث شریف میں ہے ''اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْحَكِيْمِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا '' حکمت کی بات مؤمن کا گم شدہ سرمایہ ہے پس وہ اس کو جہاں بھی پائے اسے لے لینے کا

زیادہ حقدار ہے (مشکوٰۃ ۳۴)۔یعنی دین وآخرت میں فائدہ دینے والی ہر بات مومن کا مطلوب ہے لہٰذا مومن کو چاہیے کہ وہ جہاں سے حاصل ہو قبول کر لے۔

بعض عارفین سے بڑی عمدہ بات منقول ہے اللہ کرے ہمیں عبرت دے جائے۔انہوں نے کہا کہ اگر کسی شخص نے کوئی بات حضرت بایزید بسطامیؒ جیسے جلیل القدر بزرگ سے سنی لہٰذا اس کو قبول کرلیا لیکن اسی بات کو اس نے اپنی کنیز اور باندی کی زبان سے سنی تو اس کو قبول نہیں کیا تو سمجھ وہ شخص متکبر ہے (مظاہر حق ۱/۲۷۴)۔

بل کہ یہ راقم آثم کہتا ہے کہ اگر آدمی کی نیت اصلاح کی ہوتی ہے اور فکر بھی تو وہ صرف دینی فضا وماحول سے ہی نہیں بل کہ لوگوں کے دنیوی روزمرہ کے معاملات سے بھی ان کو سن کر اور آنکھوں سے دیکھ کر اپنی اصلاح کا مواد پکڑ لیتا اور اس پر نشان دے لیتا ہے کہ ہاں یہ بات ہے جو میری اصلاح کی ہے۔اس کی مثالیں اول الواجبات میں ملاحظہ ہوں۔

لہٰذا اس طرح آپ جتنی اصلاح از خود کر سکتے ہیں وہ کریں پھر آپ کسی سے بیعت ہوں۔جب آپ اس طرح صاف دھلے کپڑے کی طرح پاک صاف ہو کر اصلاح کے لیے کہیں جائیں گے تو آپ کے مربی آپ کو بہت بلند مرتبے پر لیجائیں گے اور کم محنت اور کم مدت میں آپ طویل مسافت طے کرلیں گے۔

ساتھ ساتھ آپ دعوتی جدوجہد کے تقاضوں پر چار ماہ بھی اس طرح خروج کریں کہ جان بھی اپنی اور مال بھی اپنا۔اس سے زندگی کے بے شمار گوشوں کی بڑی اصلاح ہوگی مثلاً: امیر کی اطاعت،مسجد کی چہار دیواری، اتباع سنت،تصحیح یقین،تخلیص نیت،ضروری مسائل وفضائل کا علم،ذکر واستحضار،دوسروں کی فکر اور اپنی جان اپنا مال دین پر صرف کرنا وغیرہ وغیرہ۔آپ اگر اپنی اصلاح کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے تو ان شاءاللہ،اللہ تعالیٰ آپ کو ذریعہ ہدایت اور گمراہی کا تالا بنائیں گے۔اور نبیوں والی فکر،نبیوں والا درد اور نبیوں والی ہدایت وبرکت عطا فرمائیں گے۔

اپنی اصلاح کرلینا کافی نہیں نجات کے لیے اور بھی

مفسر قرآن حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آدمی کا صرف اپنی ذات کی اصلاح کرلینا نجات کے لیے کافی نہیں ہے۔ بل کہ نجات کے لیے دوسری بھی ذمہ داریاں شریعت نے عائد کی ہیں۔

چناں چہ انہوں نے سورۃ العصر کے تحت دیگر مفسرین کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ اس سورۃ شریفہ میں تمام انسانوں کی ناکامی اور خسارہ کی قسم کھائی ہے۔ سوا ان سعادت مندوں کے جن میں چار اوصاف ہوں۔

(۱) ایمان والا ہو۔

(۲) عمل صالح اختیار کرنے والا ہو۔

(۳) دوسروں کو حق پر قائم رہنے کی نصیحت و تاکید کرنے والا ہو۔

(۴) خود سے صبر و تحمل پر قائم رہ کر دوسروں کو بھی صبر و تحمل کی تاکید کرنے والا ہو۔

پہلے کے دو اوصاف اس لیے دیئے گئے ہیں تا کہ ان کے ذریعہ آدمی خود کامل بنے۔

اور آخر کے دو اوصاف اس لیے دیئے گئے ہیں تا کہ ان کے ذریعہ دوسروں کو کامل بنائے۔

تواصی کہتے ہیں۔ کسی شخص کو تاکید کے ساتھ موثر انداز میں نصیحت کرنا اور نیک کام کی ہدایت کرنا۔ یہ وصیت ایک تو ہے حق کی اور دوسری ہے صبر کی۔ حق سے مراد عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ ہیں اور صبر سے مراد تمام گناہوں اور برائیوں سے بچنا ہے۔ ان دونوں کی نصیحت دوسروں کو کرنا ہے۔

دوسروں کو جب حق و صبر کی دعوت دے گا تو اس میں احتمال ہے کہ وہ اس کو نہ مانے بل کہ ممکن ہے کہ اس سے لڑنے جھگڑنے لگے اور تکلیف پہنچائے تو اس مصیبت پر خندہ پیشانی سے

صبر کرے۔ اگرچہ اس صبر کی تاکید دوسروں کو کرنا ہے لیکن پہلے خود اس پر کاربند ہونا ہے تاکہ دوسروں کو صبر کی تلقین کرنا مؤثر ہو۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سورۃ شریفہ نے مسلمانوں کو بڑی اہم ہدایت دی ہے وہ یہ کہ ان کا صرف اپنے عمل کو قرآن وسنت کے تابع کرلینا جتنا اہم اور ضروری ہے اتنا ہی اہم اور ضروری دوسروں کو ایمان واعمال کی طرف بلانا اور مقدور بھر اس کی کوشش کرنا ہے۔ ورنہ صرف اپنا عمل نجات کے لیے کافی نہیں۔ خصوصًا اپنے اہل وعیال اور متعلقین کے اعمال سیئہ میں غفلت برتنا اپنی نجات کا راستہ بند کرنا ہے۔ اسی لیے قرآن وحدیث میں ہر مسلمان پر اپنی اپنی قدرت کے بقدر ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' فرض کیا گیا ہے لیکن اس میں عام مسلمان تو کیا بہت سے خواص بھی غفلت کے شکار ہیں (معارف القرآن ۸/ ۸۱۳)۔

حضرت مولانا عبیداللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے دو شخص ایسے تھے کہ جب وہ آپس میں ملتے تھے تو اس وقت تک جدا نہیں ہوتے تھے جب تک وہ ایک دوسرے کے سامنے اس سورہ کو نہ پڑھ لیتے۔ اور محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اس سورہ کے علاوہ کوئی اور سورہ نازل نہ بھی فرماتے تو یہ کافی ہوجاتی، لوگ اگر اسی سورہ کو غور وتدبر کے ساتھ پڑھ لیں تو دین ودنیا کی درستگی کے لیے کافی ہوجائے (معارف القرآن ۸/۸۱۱)۔

مذکورہ تفسیر سے معلوم ہوگیا کہ دوسروں کو ایمان واعمال کی دعوت دینا صرف حضرات علماء وائمہ ہی کا کام اور ان ہی کی صرف ذمہ داری نہیں بل کہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ تو علماء وائمہ کی کتنی ذمہ داری ہوئی۔ !! لہٰذا ائمہ حضرات خود کی ذمے داری سمجھتے ہوئے اپنے ماتحت مقتدیوں کو اس اہم ذمہ داری سے مطلع کریں اور ان کو یہ بتادیں کہ نجات کے لیے صرف اپنے اعمال کرلینا کافی نہیں بل کہ دوسروں کے دین وایمان کی فکر بھی ضروری ہے۔ اس طرح سے ان کو

دین کا داعی بنائیں اور ان میں جذبۂ حق و دعوت پیدا کریں۔

حضرت محمد بن سیرین رحمہ اللہ تعالیٰ کی فکر

حضرت موسیٰ بن مغیرہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ عین دوپہر کے وقت حضرت محمد بن سیرین رحمہ اللہ تعالیٰ کو بازار جاتے دیکھا اور پھر یہ دیکھا کہ وہ بازار میں بآواز بلند ''اللہ اکبر''، ''سبحان اللہ'' وغیرہ کلمات کہہ رہے ہیں۔ کسی نے ان سے پوچھا آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں تو فرمایا کہ لوگ بازاروں میں اللہ تعالیٰ سے اور آخرت کے خسارہ سے بہت غافل ہوتے ہیں میں ان کلمات کے ذریعہ ان کو اس سے بچانا چاہتا ہوں (کتاب الزہد ۳۱۲)۔

دیکھا ہمارے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ اپنے ماتحتوں کی اصلاح کی کیسی فکر فرمایا کرتے تھے؟ یہ تو اس زمانہ کی بات ہے جب کہ خیر شر پر غالب تھا پھر بھی انہوں نے بازاروں میں اصلاح کی ضرورت سمجھی۔ آج شر کتنا غالب ہے، بازاروں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ کوئی ہے آج جو بازاروں میں اس طرح اللہ اور آخرت کی یاد دلائے اس کا جواب نفی ہی میں دیا جاسکتا ہے۔

ہاں صرف ایک جماعت ہے اور وہ ہے تبلیغی جماعت۔ اللہ تعالیٰ تبلیغ و دعوت کی محنت کرنے والوں کو جزاء خیر دے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خوف اور آخرت کی یاد دلانے کی محنت بازاروں میں بھی کرتے ہیں بل کہ گناہوں کے اڈوں پر بھی جا کر ان کو گناہوں سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس محنت کو اور محنت کرنے والوں کو آباد رکھیں آمین۔

شیطان کی سوچ اور اس کی مانگ

ہر کوئی اللہ تعالیٰ سے اپنے طور پر خیر و بھلائی مانگتا ہے۔ کوئی مال و دولت کوئی حکومت

واقتدار مانگتا ہے، کوئی قوت وصحت، اولاد اور بیوی مانگتا ہے۔ لیکن غور کیجئے شیطان نے مانگا تو کیا مانگا اور اس نے سوچا تو کیا سوچا۔ جب اس سے خدا کی نافرمانی ہوئی تو اسے معافی مانگ لینی چاہیے تھی لیکن اس لعین وخبیث کی سوچ گندی تھی، تو اس کی دعا بھی بُری تھی اس نے اللہ تعالیٰ سے مانگا تو یوں مانگا۔

اے مرے رب مجھے مہلت دے قوت دے بعثت کے دن تک تاکہ میں تیرے بندوں کو بھٹکا سکوں ''قَالَ رَبِّ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ○'' تو اللہ تعالیٰ نے اس کو مہلت دیدی ''قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ○قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ○'' مطلب شیطان اکیلا جہنم میں نہیں جائے گا وہ اپنے ساتھ سب کو لے کر جائے گا۔ لہٰذا اس کے بالمقابل انبیاء واولیاء اور علماء علیہم السلام تنہا جنت میں نہیں جائیں گے بل کہ وہ اپنے ساتھ۔ ان شاء اللہ۔ دوسروں کو بھی لے کر جائیں گے۔ اس لیے ہمیں بھی نبیوں کی طرح سارے انسانوں کی اور ان کی جنت کی فکر کرنی چاہیے۔

کتنے مقتدی ہیں، جو بالخصوص فجر کی جماعت میں حاضر ہوتے ہیں! کیا نمازی مقتدی بھی رات کو سوتے وقت ان کو فجر کی نماز کی دعوت دے کر سوتے ہیں؟ یا فجر میں ان کے گھروں سے گزرتے ہوئے بھی دعوت دیتے گزرتے ہیں؟ یا کم از کم ان کے گھروں سے گزرتے ہوئے دعوت دینے کا خیال اور دعاء بھی کر لیتے ہیں کہ اے اللہ ان گھروں کے مسلمانوں کو نمازی بنادے اور ان کو نماز کے قضاء کے گناہ سے بچادے۔ مذکورہ سورۃ میں اسی کو تو سمجھایا کہ ہم دوسروں کو حق وصبر کی تاکید کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائیں۔

خیر وبھلائی پر لانے میں کبھی اِکراہ جائز بل کہ مستحب ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

اس شخص پر رحم فرمائیں جو رات کو نماز تہجد کے لیے اٹھے اور اپنی بیوی کو جگائے، تا کہ وہ بھی نماز تہجد پڑھے، اور اگر وہ نہ اٹھے تو اس کے چہرے پر پانی کی چھینٹ دے۔

اور اللہ تعالیٰ اس عورت پر رحم فرمائیں جو رات کو نماز تہجد کے لیے جاگے اور اپنے شوہر کو جگائے تا کہ وہ بھی نماز پڑھے اور اگر وہ نہ اٹھے تو اس کے چہرے پر پانی کی چھینٹ دے (مشکوٰۃ ۱۰۹)۔

حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حدیث شریف میں اگر چہ پہلے جملہ میں ذکر صرف بیوی کا ہے کہ اسکو جگائے لیکن اس میں اپنے ماتحت تمام محارم بھی شامل ہیں کہ ان سب کو نماز کے لیے اٹھانا چاہیے۔ مثلاً بیٹی، بہن، والدہ، اسی طرح بیٹا، بھائی اور والد وغیرہ۔ لیکن شفقت و نرمی سے اٹھائے اس طرح نہ اٹھائے کہ وہ متنفر ہو جائیں۔

اور نہ اٹھنے سے مراد یہ ہے کہ وہ سستی یا غلبۂ نیند کی وجہ سے نہ اٹھ سکیں، تو ان کو مذکورہ طریقہ سے اٹھائے تا کہ نیند کا غلبہ دور ہو۔ اور پھر لکھا ہے کہ محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی کبھی خیر کے کاموں پر لانے کے لیے ان پر اکراہ و جبر کرنا جائز ہے بل کہ مستحب ہے۔ [۱] (مرقات ۱۴۹/۳)۔

حدیث شریف سے ضمناً یہ بھی ثابت ہوا کہ لوگوں کو نماز تہجد کے علاوہ دوسرے خیر و بھلائی کے کاموں پر بھی پیار بھرے جبر و دباؤ سے لانا چاہیے، چاہے وہ کام فرائض و واجبات ہوں کہ نفل و سنت بل کہ نفل و سنت سے زیادہ فرض و واجب پر لانے کی سعی کرنی چاہیے، کیوں کہ فرائض و واجبات کا

---

[۱] جیسے اوپر لکھا ہے کہ اس طرح نہ اٹھائے کہ وہ متنفر ہو جائے۔ جس کی آسان صورت یہ ہے کہ اٹھانے سے چند دن پہلے تعلیم کتاب کے ذریعہ فضائل تہجد سنائے اور مجاہدہ کے فضائل سمجھائے پھر ان کو اٹھنے پر آمادہ کرے اور ان سے ہی پوچھ لے کہ کیا آپ تیار ہیں۔ اس طرح ان کی آمادگی کی محنت کر کے پھر وہ ترکیب آزمائے جو مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس عظیم دولت و سعادت سے نوازیں۔

درجہ مقدم ہے۔یہی بات سمجھانے کے لیے یہ عنوان قائم کیا ہے۔لہٰذا ائمہ حضرات منکرات کومٹانے کے لیےاور معروفات کوزندہ کرنے کے لیےلوگوں کوسمجھائیں اور حکمت سے کام لیں اور اپنے منصب کی قوت وزورکوکام میں لائیں۔

ائمہ میں دینی ماحول بنانے کی خوبی

حضرت مولانا آزادرحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر فرمایا کہ لوگ ماحول کارونا روتے ہیں کہ آج کل ماحول ہی ٹھیک نہیں،فرمایا ماحول تو آدمی خود بناتا ہے(اسی لیےتو ماحول یعنی اردگرد کہتے ہیں)،آدمی جب خودٹھیک ہوگاتواس کااردگردخود ہی ٹھیک ہوہی جائے گا۔اسی لیے تولوگ کہا کرتے ہیں''ہم اچھےتوسب اچھے''۔

جب سیدنا یوسف علیہ السلام قید خانہ میں تشریف لے گئے تو وہاں کونسا ماحول تھا! ماحول توخودانہوں نے جا کر بنایا۔انہوں نے سب سے پہلےتوحید کی دعوت دی''یَاصَاحِبَیِ السِّجۡنِ ءَاَرۡبَابٌ...''،تقویٰ،خوش اخلاقی،صبروشکرکی ترغیب دی اورتعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری کر کے دینی ایک ماحول قائم کیا،ایساماحول کہ ان کے نکلنے پر قیدی رورہاہےاورافسوس کررہاہے کہ آپ آئے تو قیدخانہ مدرسہ بن گیا،باغ بن گیابلکہ رشک جہاں بن گیا،آپ جارہے ہیں معلوم نہیں ہماراکیاہوگا؟۔

اس سے بڑھ کرجناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو ماحول ملاوہ عالم گیر جہالت کااسی لیے تواسے زمانہ جاہلیت کہتے ہیں۔مگرآپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ماحول کاکیسارخ پھیردیا کہ سب سے زیادہ جاہل سب سے زیادہ جاننے والے،گمراہ اور بھٹکےلوگ دوسروں کے لیے چراغ ہدایت بن گئےاورایساخوش گوارماحول قائم کیاکہ اس کی مثال نہ اس سے پہلے پائی گئی نہ اس کے بعد۔

خلاصہ یہ کہ ائمہ کرام کو انبیاء علیہم السلام کی اس صفت سے متصف ہونا چاہیے کہ جہاں جائیں جہاں بیٹھیں صالح ماحول قائم کریں بل کہ مقتدیوں کو بھی اس کی ترغیب دیں کہ وہ بھی صالح ماحول بنانے میں آپ کا ہاتھ بٹائیں۔

مقتدیوں کے گنہگار اور برے ہونے سے آپ نفرت نہ کریں بل کہ پیار سے ان کو سمجھائیں کہ ہم چاہے لاکھ گندے لاکھ گنہگار، مانا کہ گناہ نہیں چھوٹتے گناہ کی عادت ہوگئ تو کم از کم گناہ کم تو کر دیں، بار بار توبہ تو کریں۔ اگر بایزید بسطامیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ نہیں بن سکتے تو شیطان بھی تو نہ بنیں، گناہوں سے معافی تو مانگا کریں شیطان معافی نہیں مانگتا تم تو مانگ لیا کرو۔ ائمہ حضرات ان چیزوں پر دھیان دے کر پاکیزہ معاشرہ قائم کریں۔ نیز ائمہ حضرات لوگوں کو ذمہ داریوں کا احساس بھی دلائیں۔

ائمہ میں دینی احساس دلانے کی خوبی

تمام انبیاء علیہم السلام نے سب سے اہم تین باتوں کو سمجھایا توحید، نبوت اور حیات آخرت۔ اور ان تینوں میں بھی اہم حیات آخرت ہے۔ کیوں کہ جو اس کو مانے گا وہ توحید و نبوت کو ضرور مانے گا۔ اس لیے تمام انبیاء علیہم السلام نے اس کو بہت تاکید سے سمجھایا کہ کائنات اور کائنات کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے اور عالم ہر لمحہ عدم کی طرف رواں دواں ہے، اور انسانی جو قدم بھی اٹھتا ہے وہ قدم عدم کی طرف اٹھتا ہے۔ اسی لیے روایت میں اس زندگی کو سفر سے سمجھایا ہے

فانی ہر ایک شئ یہاں لاکلام ہے	کہتے ہیں جس کو باقی وہ اللہ کا نام ہے

ائمہ کرام مقتدیوں میں حیات آخرت کا خوب احساس پیدا کریں۔ اور ان کو اس کی تاکید کریں کہ وہ خود بھی دوسروں میں اس احساس کو بیدار کریں۔ کیوں کہ آدمی خود اچھے احساس

پر اس وقت باقی رہ سکتا ہے جب اس کے ارد گرد بھی اسی احساس کا ماحول ہو۔ کوئی عابد و عالم، متقی و زاہد، داعی و مصلح، قاری و حافظ اور دیندار اپنے وصف خاص میں کامل ہو ہی نہیں سکتا جب تک آخرت کو یاد نہ رکھے اور قبر کی زندگی کو یاد نہ رکھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کا معمول تھا کہ روزانہ رات کو علماء کے مجمع کو بلاتے جو موت کا قیامت کا اور آخرت کا ذکر کرتے اور ایسا روتے جیسا کہ جنازہ سامنے رکھا ہو۔

اصلاح میں ائمہ بڑوں کا اکرام فراموش نہ کریں

جب کوئی آدمی اصلاح کا کوئی کام لے کر اٹھے تو اسے اپنی اس تبلیغ و اصلاح میں بڑے حضرات سے بھی سابقہ پڑے گا اور ان کو تعلیم و آداب سکھانے کی ضرورت پیش آئے گی، ان کے بڑے ہونے سے اصلاح کا فریضہ ساقط نہیں ہوگا۔ لیکن ہاں ان کے علو مرتبہ کا خیال رکھنا ضروری ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اِذَا اَتَاکُمْ کَرِیْمُ قَوْمٍ فَاَکْرِمُوْہُ" (ابن ماجہ باب ۲/۱۹)۔ جب تمہارے پاس کسی قوم و جماعت کا کوئی معزز شخص آئے تو تم اس کا اکرام کرو۔ نیز حدیث میں ہے "وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا فَلَیْسَ مِنَّا" کہ جو ہمارے بڑوں کا اکرام نہ کرے وہ ہمارے (اس اکرام کے) طریقہ پر نہیں۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا جب انتقال ہوا تو آپ کے بھائی حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو فرمائش کی کیوں کہ وہ مدینہ المنورہ میں گورنر تھے تو اس مقام کا لحاظ کرتے ہوئے نماز جنازہ ان سے پڑھوائی تا کہ ان کے اکرام کا ادب حاصل ہو۔ (اشبہ الناس بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم الحسن بن علی ۲/۲۲۸)۔

جب اپنے سے بڑوں کو کوئی تعلیم دینی ہو ان کی کچھ اصلاح کرنی ہو تو کس طرح کریں

کہ ان کا ادب بھی ملحوظ رہے اور اصلاح بھی ہو جائے۔ اس کی ایک مثال ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ علامہ کردری رحمہ اللہ تعالیٰ نقل کرتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس نواسے حضرات حَسَنَین (حسن و حسین) رضی اللہ عنہما نے ایک مرتبہ دریائے فرات کے کنارے ایک بوڑھے دیہاتی کو دیکھا کہ اس نے جلدی جلدی وضو کیا اور اس طرح جلد بازی میں نماز بھی پڑھی جس میں مسنون طریقہ کی کوئی رعایت نہیں کی حضرات حسنین ؓ اسے سمجھانا چاہتے تھے لیکن اندیشہ یہ تھا کہ یہ شخص عمر رسیدہ ہے کہیں اپنی غلطی سن کر بھڑک نہ جائے،

دونوں حضرات اس کے قریب پہنچے اور کہا کہ ”ہم دونوں جوان ہیں اور آپ تجربہ کار آدمی ہیں آپ وضو اور نماز کا طریقہ ہم سے بہتر جانتے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو وضو کر کے اور نماز پڑھ کر کے دکھائیں تاکہ ہماری کوئی غلطی ہو تو آپ ہمیں بتا دیں۔ انہوں نے اس کے بعد سنت کے مطابق وضو کر کے سنت کے مطابق نماز پڑھ کر دکھائی۔ جب بوڑھے شخص نے سنتوں کی رعایت والا وضو اور نماز دیکھی تو سمجھ گیا کہ اصل میں ان کی اصلاح مقصود نہیں بل کہ میری اصلاح مقصود ہے لیکن انہوں نے ادب کے خاطر یہ طرز اختیار کیا ہے تو اس بوڑھے نے اعتراف غلطی کے ساتھ اپنی غلطی اور کوتاہی سے توبہ کی اور سنت طریقہ اختیار کیا،، (مناقب الامام الاعظم للکردری ۱ر ۳۹)۔

(۸) ائمہ حضرات شرعاً داعی اور مبلغ ہوتے ہیں

دعوت اسلام کی روح اور اس کی وہ بنیاد ہے کہ جس پر اسلام کا بقا منحصر ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی جانب سے جس خاص الخاص کام کے لیے رسول بنا کر مبعوث فرمائے گئے وہ دعوت الی اللہ ہے، دعوت آپ کا سب سے بڑا مشن ہے۔ حضرت شیخ ابرار احمد دھلیوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ دعوت الی اللہ نبوت کی شاخ ہے۔ اسی لیے تو تعلیم پر مشتمل سب سے

پہلے وحی نازل ہوئی تو ساتھ ہی دوسری وحی دعوت پر مشتمل ''قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ''نازل ہوئی کہ جتنا علم حاصل ہوا اس کو دوسروں تک پہنچاؤ۔

اسی لیے دعوت اور داعی کی تعریف کی گئی ہے۔ ارشاد ہے'' وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلاً مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا ''(بنی اسرائیل)۔ علماء اسلام نے لکھا ہے کہ دعوت اور عمل دونوں کو اکٹھا جمع کرنا دین کو سب سے اچھا بنا دیتا ہے۔ اسلام میں حسن لانے کا راستہ دعوت ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالی خود فرماتے ہیں کہ اس سے اچھا اسلام کسی کا ہو ہی نہیں سکتا جو دعوت دیتے ہوئے عمل کرے۔ دعوت امت کا ایک اجتماعی فریضہ ہے (مسجد کی آبادی کی محنت ۷)۔

لہٰذا ائمہ حضرات کو چاہیے کہ وہ امامت کے ساتھ ساتھ خصوصی توجہ تبلیغ دین اور احیاء دین پر فرمائیں۔ یقیناً ہمارا تعلیم وامامت کا انجام دینا قابل مبارک باد عمل ہے تاہم اس کے ساتھ تبلیغ کو انجام دینا بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ ائمہ شرعاً معلّم ہونے کے ساتھ داعی اور مبلغ بھی ہوتے ہیں۔ آپ یقیناً تعلیم کے فریضہ کو انجام دے رہے ہیں، لیکن اس سے یہ نہ سمجھیں کہ آپ مبلغ بھی ہیں کیوں کہ تعلیم وتبلیغ میں باریک فرق ہے حقیقی اور کامل مبلغ اور ہوتا ہے۔ **حضرت مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی** رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ **حضرت مولانا محمد الیاس صاحب** رحمہ اللہ تعالیٰ نے عجیب باریک فرق بتایا وہ یہ ہے کہ غیر طالب کو دین سکھانا تبلیغ ہے اور جب وہ طالب ہو جائے تو اس کو دین سکھانا یہ تعلیم ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر کوئی مبلغ ہے تو وہ معلم بھی ہے (مواعظ عبیدیہ ۳۰۷)۔

دعوت ایک ایسی عظیم الشان صفت ہے جس کی نسبت نہ صرف امت کی طرف ہے بل کہ امت کے نبی کی طرف بھی ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کر کے اس کی اہمیت کو جتلایا ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے۔

(۱) " وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓ إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ " (یونس ۲۵) کہ اللہ جل شانہ (لوگوں کو) دارالسلام (جنت) کی طرف بلاتے ہیں۔

(۲)" يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا " (احزاب ۴۵،۴۶)۔اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو شاہد اور بشارت دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔اور آپ اللہ تعالی کے حکم سے (لوگوں کو) اللہ تعالی کی طرف بلانے والے اور روشن چراغ بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

(۳) " وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ " (ال عمران ۱۰۴) اور تم میں کی ایک جماعت ایسی ہو جو خیر کی طرف دعوت دے اور وہ لوگ (دوسروں کو) بھلائی کا حکم کریں اور برائیوں سے روکیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

بل کہ دعوت خود انسانی فطرت ہے آپ کہیں گے یہ کیسے! اس کو اس طرح سمجھیے کہ جو کوئی خوشی کی بات ہوتی ہے آدمی اس خوشی میں دوسروں کو بھی شامل کرنا چاہتا اور اس کو ان میں بانٹنا چاہتا ہے اور اس کا اظہار دوسروں کے سامنے کرنا چاہتا ہے۔ایک بچہ محلہ میں کھیلتا ہے جب وہ اپنے باپ کو سفر سے گھر آتے دیکھ لیتا ہے تو دوڑ کر اپنی امی جان کے پاس جا کر خبر دیتا ہے کہ ابا جان آگئے، طالب علم پڑھائی میں کامیابی کا اظہار اپنے خاندان والوں کے سامنے کرتا اور سب ہی کو خوشی میں شامل کرتا ہے۔

آدمی چلتے ہوئے سانپ دیکھ لیتا ہے تو جتنا اہتمام اپنے بچاؤ میں کرتا ہے اتنا ہی اہتمام دوسروں کے بچانے میں بھی کرتا ہے فوراً از ورزور سے چلاتا ہے سانپ سانپ مطلب کہ ہر قسم کے نقصان سے دوسروں کو بچانے کا جذبہ فطری طور پر ہر شخص میں ہے۔انہی فطری دو

وصف (خوشی میں شامل کرنے ضرر سے بچانے) کا اعلان ''مبشرًا و نذیرًا'' سے کیا گیا ہے اور یہ سمجھایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابدی بشارت دینے اور ابدی مضرتوں سے ڈرانے والے ہیں۔

جس طرح ظاہری تاریکی کو دور کرنے کے لیے ایک تو چراغ ہوتا ہے اور دوسرا اس سے بڑھ کر آفتاب و مہتاب ہوتے ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ دعوت و تبلیغ باطنی تاریکی کو مٹانے کے لیے مبعوث فرمایا تو فرمایا آپ روشن چراغ ''سِرَاجًا مُنِيْرًا'' ہیں۔ چاند وسورج نہیں فرمایا، حالاں کہ عقلی تقاضا یہ تھا کہ چاند کہا جاتا سورج کہا جاتا جو کہ روشنی میں بے مثال ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ عقلی تقاضے کے مطابق اگر سورج و چاند کہا جاتا تو وہ مقصد حاصل نہ ہوتا جو سراج منیر کہنے میں ملحوظ ہے۔ وہ یہ کہ تاریکی کو دور کرنے کے لیے اولاً ایک شخص چراغ روشن کرتا ہے پھر اس سے دوسرا شخص اپنا چراغ روشن کرتا ہے پھر اس سے تیسرا شخص اس طرح آن کی آن میں ہزاروں چراغ روشن کیے جاتے ہیں اور تاریکی کو مٹایا جاتا ہے۔ لہٰذا بذریعہ دعوت و تبلیغ دوسروں کو روشن کرنے کے لیے جامع کلمہ یہی تھا کہ ''سراج منیر'' کہا جائے اور باطنی تاریکی کو مٹایا جائے۔ برخلاف سورج و چاند کے کہ وہ ایک ہی ہیں، ایک سورج سے دوسرا سورج اور ایک چاند سے دوسرا چاند وجود میں نہیں آسکتا۔

''وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ'' تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امت سے مراد مجاہدین اور علماء ہیں جن کا فرض منصبی دعوت الی اللہ ہے۔ اور لکھا ہے کہ آیت شریفہ کا مقصود یہ ہے کہ اس امت کا ایک طبقہ تو بطور خاص اسی کام کے لیے مخصوص ہو۔ اگر چہ یہ عظیم الشان کام ویسے تو اپنے بس کے بقدر امت کے ہر فرد پر واجب ہے۔ پھر دعوت کی اہمیت پر بہت سی روایتیں نقل کی ہیں۔

ایک حدیث شریف کا خلاصہ ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس ذات کی قسم جس

کے قبضہ میں میری جان ہے تم ضرور بالضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہا کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب بھیجے گا پھر تم اس سے دعا بھی کروگے تو تمہاری دعا قبول نہیں کی جائے گی (تفسیر ابن کثیر ۲/۹۰ ۳ والترمذی)۔

ان مذکورہ نصوص سے جہاں دعوت کی خوب اہمیت ظاہر ہوتی ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ بھی داعی ہیں، نبی بھی داعی اور امت بھی داعی۔ اور علماء وائمہ تو دوہرے درجہ میں داعی ہیں۔ انبیاء کے وارث ہوکر اور امت میں شامل ہوکر۔ لہٰذا ائمہ کرام کو چاہیے کہ وہ منصب امامت سے دعوت الی اللہ کا کام خوب انجام دیں، بل کہ آیت شریفہ سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ انہیں اپنے ماتحت مقتدیوں کا مزاج بھی دعوتی بنانا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دعوت کا اندازہ ذیل کی روایت سے کیجئے۔ حیاۃ الصحابہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس دن کا ذکر ہے جس میں وہ مشرف باسلام ہوئے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب آپ کو دعوت دی تو اسلام قبول کرلیا جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے حد خوش ہوئے۔

حضرت ابوبکرؓ اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت عثمانؓ بن عفان، طلحہؓ، زبیرؓ، سعد بن وقاصؓ کے پاس تشریف لے گئے، ان کو دعوت دی یہ حضرات بھی مسلمان ہوگئے تو دوسرے روز حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمانؓ بن مظعون، ابوعبیدہؓ، عبدالرحمنؓ، ابوسلمہؓ اور ارقمؓ کو لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے وہ لوگ بھی مشرف باسلام ہوئے (حیاۃ الصحابہ مترجم ۱/۸۰)۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ کو بھی وہ فکر لاحق تھی جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تھی۔

وجہ یہ ہے کہ باطل اور ضلالت کا توڑ صرف دعوت ہے کہ دنیا کا باطل ٹوٹے گا تو صرف دعوت سے اور دنیا کی تاریکی اگر ختم ہوگی تو نبی والی دعوت سے، نبی کو دعوت لے کر اسی لیے

مبعوث فرمایا ہے تاکہ باطل مٹ جائے جو صرف اعمال اختیار کرلینے سے حاصل نہ ہوگا۔

لہٰذا ائمہ حضرات کو بقول حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ علیہ تعالیٰ بل کہ بقول حکیم الامت علامہ تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ائمہ کو دعوت لے کر اپنے اطراف وجوانب (دیہات اور قریبی علاقوں) میں جانا پڑے تو ضرور جائیں، اپنی امامت وتعلیم میں کسی کو نائب بنانا پڑے تو بنالیں لیکن جائیں ضرور۔ اس کو خدا کی بڑی نعمت وسعادت سمجھیں۔

حضرت اقدس تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ مدرسہ سے عام تبلیغ کا بھی انتظام ہونا چاہیے اس کے لیے ضرورت پڑے تو تنخواہ دار مبلغ بھی رکھے جائیں اور ان کو اطراف وجوانب میں بھیجا جائے اور ان کو اس کی تاکید بھی کی جائے کہ وہ لوگوں سے مدرسہ کے لیے چندہ طلب نہ کریں۔ وہ صرف احکام پہونچائیں۔ اور فرماتے تھے کہ لوگ اگر مدرسہ کے لیے سامنے سے چندہ دیں تو اسے بھی قبول نہ کریں۔ ہاں مدرسہ کا پتہ دیدیں اور خود مبلغ کو بھی کوئی ہدیہ دے تو اسے بھی قبول نہ کرے اس کا کام صرف احکام کی دعوت وتبلیغ ہو اسی بے غرض وعظ وتبلیغ کا بڑا فائدہ ہوگا اور مخاطب پر بڑا اثر پڑے گا (العلم والعلماء ۱۰۶)۔

دعوت وتبلیغ کا فقہی حکم [1]

(۱) تبلیغ ہمارے اوپر فرض ہے اصولاً۔ (یعنی عقائد کی) بھی اور فروعاً (یعنی مسائل کی) بھی۔ اس کا فرض ہونا تو اس سے معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح ایمان وعمل صالح کا امر فرمایا ہے اسی طرح تواصی بالحق (یعنی وصیت کرنے) کا بھی حکم فرمایا ہے اور اس مجموعہ پر خسارہ سے بچنے کو موقوف کیا ہے۔

---

[1] (ماخوذ از کتاب تبلیغ بالیقین کار نبوت ہے ۳۵۷ تا ۳۷۱)۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں " وَالْعَصْرِ () اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ () اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ () "۔

حق تعالیٰ اس جگہ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ قسم ہے زمانہ کی کہ انسان خسارہ میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے۔ اور باہم ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرتے رہے اور باہم ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح ایمان وعمل صالح پر خسارہ سے بچنے کو موقوف کیا ہے اسی طرح تواصی بالحق پر بھی موقوف کیا ہے جس کے معنی ہیں ایک دوسرے کو دین کی نصیحت کرنا۔ دوسروں کو دین کی تبلیغ کرنا (حضرت تھانوی صاحب رحمہ اللہ علیہ التواصی بالحق ص ۱۵۵۔۱۵۶)

پھر قادر کے ذمہ تو یہ وجوب علی الکفایہ ہے اگر اتنے آدمی اس کام کو کرتے ہوں کہ بقدر حاجت کام چل رہا ہو، تو دوسرے اہل قدرت کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا (بیان القرآن ص ۴۵)

ایک موقع پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ تبلیغ ہم پر فرض ہے اس کے بغیر ایمان کامل حاصل نہیں ہوسکتا (خطبات حکیم الامت)۔

(۲) حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے فرمایا: کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مسلمان کے ذمہ فرض عین ہے۔۔ مگر آج ہم اس کی فرضیت سے غافل ہیں۔ (اصلاحی خطبات ج۹)۔

(۳) حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم : تبلیغ فرض عین ہے ۔مختلف جہتوں سے تبلیغ ودعوت کا کام خصوصی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ بالخصوص اس دور میں جب کہ شر کی قوتیں اپنی مفاسد پھیلا رہی ہیں۔

اور ماشاءاللہ تبلیغی جماعت بحیثیت مجموعی اسی کام کو بطریق احسن پورا کر رہی ہے۔

لہٰذا مسلمانوں کو اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔

واللہ سبحانہ اعلم احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۲۔۸۔۱۹ ۱۴۱۹ھ ماہنامہ ''البلاغ''

(۴) **حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم:** خاص صورتوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض عین ہے اور تمام حالات میں نیکیوں کی ترغیب اور برائیوں سے روکنے کی مقدور بھر کوشش کرنا اس امت کی اجتماعی ذمہ داری ہے اور مروجہ تبلیغی جماعت اس اہم دینی ذمہ داری کو بڑی جانفشانی سے موثر طور پر انجام دے رہی ہے۔

لہٰذا اس کام میں ان کے ساتھ لگنا اور تعاون کرنا بہت بڑی سعادت اور باعث اجر وثواب ہے۔

واللہ المستعان وھو اعلم

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ

۴۔۱۳۔۱۴۱۶ھ

ماہنامہ ''البلاغ''

(۵) **حضرت مولانا طارق جمیل صاحب:** نے فرمایا اگر امت نے فرائض چھوڑ دیئے ہوں تو تبلیغ کرنا فرض ہے۔۔۔اور اگر واجب چھوڑ دیئے ہوں تو تبلیغ واجب ہے۔۔۔اگر سنت چھوڑ دی ہو تو تبلیغ کرنا سنت ہے۔اب ہم خود اندازہ لگالیں کہ امت کیا کیا چھوڑ رہی ہے۔

میرے دوستو! آج بھی اس دنیا میں لاکھوں انسان ایسے ہیں جنہیں یہ پتہ نہیں کہ دین اسلام بھی کوئی دین ہے، قرآن بھی کوئی کتاب ہے، محمد ﷺ بھی کوئی رسول ہیں۔اس کی

وجہ کیا ہے کہ ہر دور میں نئی نسل آرہی ہے۔۔۔اس وقت کتنے ارب انسان حالت کفر میں زندگی گزار رہے ہیں۔۔۔اگر یہ اسلام نہ لائے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں چلے جائیں گے۔

آج شیطان نے بڑے عجیب چکر میں ڈال رکھا ہے۔دین دار طبقہ کو یہ چکر دے رکھا ہے کہ تم اپنی نماز پڑھتے رہو۔اور جاہل طبقہ کے دل میں یہ ڈال دیا ہے کہ تم (بس) کس منہ سے لوگوں کے پاس جاؤ گے۔

(۶) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول : (اللہ ہم پر رحم فرمائے) نہ ہم ایک دوسرے کو نیکی کی دعوت دیتے ہیں نہ برائی سے روکتے ہیں۔۔۔اللہ ہم کو معاف نہیں کرے گا۔۔۔نہ معلوم ہم پر کون سا عذاب آئے (احیاء العلوم)

(۷) فتاوی عالمگیری : لکھا ہے کہ اگر مخاطب کے بات کو سن لینے کی امید ہو تو تبلیغ واجب ہے۔

(۸) حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول : مولوی فاروق صاحب نے فرمایا کہ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے فرمایا کہ اے فاروق تو میرے کہنے پر تبلیغ پر نکل جا۔۔۔ چناں چہ میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر حضرت مولانا فاروق صاحب نے یہ بھی فرمایا حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس راستہ میں نکلنا قبولیت کی علامت ہے۔اگر میرے بس میں ہوتا تو میں سب طالب علموں کو اللہ کے راستے میں نکالتا (حضرت مولانا محمد فاروق صاحب مدظلہ)۔

(۹) حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ : نے شمائل ترمذی میں ۱۸ گناہ کبیرہ لکھے ہیں۔۔۔اس میں سے ایک گناہ کبیرہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر نہ کرنا بھی لکھا ہے۔

(۱۰) حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمہ اللہ تعالیٰ : جو شخص دعوت الی اللہ کا کام کرے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ شخص دنیا سے بغیر ایمان کے چلا جائے۔۔۔کہ ساری زندگی تو اللہ

تعالیٰ کی طرف بلاتا رہا اور اب اللہ تعالیٰ اس کو ایمان سے محروم کر دیں یہ ہو ہی نہیں سکتا۔

(ماخوذ از کتاب تبلیغ بالیقین کارنبوت ہے ۳۵۷ تا ۳۷۱)۔

سیرۃ طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا مشن تھا، آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایک امتی کا درد تھا، آپ ہمیشہ دعوت کے لیے متفکر رہا کرتے تھے حتی کہ خود اللہ جل شانہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے ”فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى آثَارِهِمْ إِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوا“ (الکھف ۶) آپ اس انتظار میں نہیں رہا کرتے تھے کہ لوگ آپ کے پاس آئیں تو ان کو دعوت دیں بل کہ آپ بنفس نفیس اور آپ کے جانثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لوگوں کے گھروں بازاروں اور میلوں میں جا کر انہیں حق کی دعوت دیتے تھے۔

مریض کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تو وہاں بھی آپ دعوت کو فراموش نہ فرماتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی غلام آپ کی خدمت میں آیا کرتا تھا وہ بیمار ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کے لیے اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس کے سرہانے بیٹھ گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا اسلام قبول کر لو۔ اس کے پاس اس کا باپ بھی تھا اس نے باپ کی طرف دیکھا تو باپ نے بیٹے سے کہا ابو القاسم (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات مان لو چناں چہ وہ اسلام لے آیا۔ جب آپ اس کے پاس سے نکلے تو آپ نے فرمایا تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اس کو (ایمان سے) جہنم سے بچا دیا۔ (مشکوٰۃ ۱۳۷)۔ یہ تھا آقا کا درد۔ اس لڑکے کا نام عبد القدوس تھا۔ (مرقات ۳/۳۷۲)۔

اس سے علماء اسلام نے لکھا ہے کہ کسی بندے پر ایمانی وغیرہ دعوت ومحنت سے جب کہ وہ قبول نہ کرے تو مایوس نہ ہونا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ زندگی کے آخری لمحات میں ہدایت نصیب ہو جائے۔

ائمہ حضرات کبھی تنہائی میں یہ سوچ لیا کریں کہ آپ کے اطراف میں بہت سی بستیاں ہوں گی جن میں کافی بڑی تعداد مسلمانوں کی ہوگی، لیکن اتنی بڑی تعداد میں نمازیوں کی تعداد کتنی ہے؟ جو نمازوں سے غافل ہیں ان کی فکر کون کرے گا؟ کیا آپ کی ذمہ داری نہیں۔

بل کہ آپ جہاں امامت وخطابت انجام دے رہے ہیں وہاں کے بارے میں بھی غور کریں کہ کیا آبادی کے سب ہی لوگ پنج وقتہ نمازی ہیں؟ بتائیں ان میں ایسا دینی شوق جگانا جس سے وہ اوامر خداوندی پر مضبوطی سے کھڑے ہوجائیں آپ کی ذمہ داری نہیں؟ لہٰذا ہم اپنا فرض منصبی اچھائی کی دعوت اور برائی سے لوگوں کو بچانا ہرگز نہ بھولیں نہ سفر میں نہ حضر میں۔ آپ کی خوش قسمتی ہوگی کہ آپ کی محنت کے نتیجہ میں لوگ گناہوں سے باز آجائیں اور بے نمازی نمازی بن جائیں۔ اس کے لیے آپ کو اللہ تعالیٰ سے اس کی توفیق بھی طلب کرنی چاہیے۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ جو جلیل القدر محدث وعارف کامل ہیں فرماتے ہیں۔ ”وَاللّٰہِ لَوۡ لَمۡ یَاۡتُوۡنِیۡ لَاَتَیۡتُہُمۡ فِیۡ بُیُوۡتِہِمۡ “ اللہ کی قسم ”میرے شاگرد“ اگر میرے پاس حدیث شریف سیکھنے نہ آئیں تو میں ”حدیث شریف“ سکھانے کے لیے ان کے گھروں پر جاؤں گا (کتاب العلم لابن عبدالبر ۱/ ۱۴۲)۔ آپ نے اتنے بڑے محدث کی بات ملاحظہ کی کہ وہ خود ان کے شاگردوں کے پاس جانے کی تمنا رکھتے ہیں۔

یہ تو حدیث شریف سکھانے کے لیے تھا۔ جب کہ یہاں تو بقول **حضرت مولانا محمد الیاس** رحمہ اللہ سرے سے دین اور فرائض ہی معدوم ہیں، امہات عقائد ہی کمزور ہیں، امہات عقائد میں امہات کی شان باقی نہیں رہی، جس کی وجہ سے ابواب رحمت بند ہو چکے ہیں۔

اب اگر رات بھر دعائیں کی جائیں تب بھی کام نہ ہوں گے۔ تو اب اس کے لیے کتنی فکر ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان لکھی باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ اس وقت جو کچھ دنیا

کی رونق نظر آتی ہے وہ سابق مبلغ وداعی حضرات کی قربانی کا ہی نتیجہ ہے۔

حضرت شیخ سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ اسی فکر ودعوت کی اہمیت کو یوں بیان کرتے ہیں کہ ” حاملین قرآن کی ایک ہی غرض ہونی چاہیے وہ یہ کہ وہ خود بھی نیک ہوں اور اپنے اچھے اخلاق وکردار کے ذریعہ اوروں کی بھی اصلاح کرنے والے ہوں اور امت کی دینی تربیت اور دین کی طرف رہ نمائی کرنے والے ہوں“۔ ”یَکُوْنُ الغرضُ الوحیدُ مِنَ الْمُتَخَرِّجِیْنَ فِیْ المدارس الناجِحِیْن فِیْ عُلُومِها اَنْ یَکُوْنُوْا صَالِحِیْنَ فِیْ اَنْفُسِهُمْ. وَاَخْلاقُهم واٰدابُهم مُصلِحِیْنَ لِغَیرِهِمْ راشِدِیْنَ مُرْشِدِیْنَ مُهْتَمِّیْنَ بَتَرْبِیَةِ الْاُمَّةِ“ (وجوب التعاون بین المسلمین ۱/۲۰۰)۔

نبی کی طرح ائمہ حضرات کو بھی مؤمنین سے توجہ ہٹانی نہیں چاہیے

مسند احمد اور طبرانی کی روایت ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ سرداران قریش کا گزر ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ہوا جب کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب حضرت صہیبؓ، عمارؓ، بلالؓ اور خبابؓ وغیرہ ضعفاء مسلمین بیٹھے ہوئے تھے تو سرداران قریش نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اپنی قوم کے ان جیسے (کمزور) افراد پر خوش ہیں کیا اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان میں سے ان کو منتخب کر کے ان پر احسان کر رکھا ہے کیا ہم ایسے (حقیر وکمزور) لوگوں کے تابع بن کر رہیں، اگر آپ ان کو ہٹا دیں تو ممکن ہیں ہم آپ کی پیروی کرلیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے آیت شریفہ ”وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ“ (انعام ۵۲) نازل فرمائی ترجمہ: اور ان لوگوں کو (اپنی مجلس سے) نہ نکالیے جو صبح وشام اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں جس سے (ان کا) مقصد صرف اللہ کی رضا ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے صرف زبانی گفتگو کو کافی نہیں سمجھا بل کہ ایک تحریری عہد نامہ کا مطالبہ بھی کیا۔ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو لکھنے کے لیے بلایا

لیکن لکھنے سے پہلے ہی حضرت جبرئیل علیہ السلام آیت بالا کو لے کر نازل ہوئے۔ خلاصہ یہ کہ آپ کو اس سے منع کر دیا کہ غرباء مسلمین سے اپنی توجہ محض ان کافروں کے ایمان لانے کی توقع سے ہٹائیں اور بتلا دیا کہ خواہ یہ لوگ ایمان لائیں یا نہ لائیں آپ غرباء مسلمین کے مقابلے میں اس کی پرواہ نہ کریں۔ (روح المعانی ۷/۲۰۵)۔

آج بہت سے مسلمان (جو دنیوی اعتبار سے تو عزت دار کہلاتے ہیں) ضعف ایمان کی وجہ سے (غیر عزت دار مسلمان کے مقابلہ میں سیاست و معاملات میں) بہت سے کافروں کی طرف میلان رکھتے ہیں اور اللہ کے دشمن اور اس کے خلیل اور صالح و فاسد اور مومن و کافر کے درمیان فرق نہیں کرتے، بل کہ ان کے ساتھ گہری دوستی رکھتے ہوئے ان کا تعاون بھی کرتے ہیں، قرآن نے اس سے سختی سے روکا ہے۔ ارشاد ہے "وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ" (ہود ۱۱۳) تم ان لوگوں کی طرف میلان مت رکھو جنہوں نے ظلم کر رکھا ہے ورنہ تمہیں آگ پہنچ کر رہے گی۔

لہٰذا اس ہدایت کے مطابق انبیاء علیہم السلام کے وارثین علماء کرام وائمہ عظام کو بھی چاہیے کہ وہ بھی اپنی نگاہ صرف مسلمانوں پر مرکوز رکھیں۔ ان سے دلی محبت رکھیں، بل کہ ان کو اپنے سے قریب کریں وہ چاہے دینی مرتبہ میں کم تر ہوں لیکن ان کے اندر کا ایمان ان کو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں سارے کفار و مشرکین سے بلند بنا دیتا ہے۔ اگر ان کے اندر عیوب ہوں تو جذبۂ خیر خواہی اور شفقت و ترحم سے ان کو دور کر کے انہیں معزز بنائیں۔ یہی طریقہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔

جب بھی ائمہ حضرات کے پاس لوگ آئیں تو پہلے انہیں نصیحت کریں

ائمہ حضرات کی یہ بھی ایک بڑی خوبی اور صفت ہے کہ جب بھی ان کے پاس کوئی کسی

بھی غرض سے آتا ہے تو اسے ضرور نصیحت کرتے اور دینی بات سمجھاتے ہیں۔قرآن شریف نے اس گوشہ کو سیدنا یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے سمجھایا ہے۔ جب یوسف علیہ السلام قید خانہ میں پہنچے تو ان کے ساتھ دو قیدی بھی قید خانہ میں داخل ہوئے اور انہوں نے خواب دیکھ رکھے تھے،ان کو معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام خواب کی تعبیر کا علم رکھتے ہیں تو انہوں نے اپنے خوابوں کا تذکرہ کیا لیکن سیدنا یوسف علیہ السلام نے پہلے تو ان کو مطمئن کیا کہ میں تم کو تمہارے خوابوں کی تعبیر جلد ہی بتاؤں گا اور ضرور بتاؤں گا،

پھر دین کی نصیحت کی،لیکن دین کی نصیحت بھی بڑی حکمت سے کی۔ پہلے یہ بتایا کہ یہ علم میرا ذاتی نہیں بل کہ یہ مجھے میرے رب نے عطا کیا ہے۔(کیوں کہ) میں نے ان لوگوں کا مذہب چھوڑ رکھا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے منکر ہیں۔ ’’ذٰلِکُمَا مِمَّا عَلَّمَنِی رَبِّیْ إِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ‘‘(یوسف ۳۷)۔

اس طرح طویل تمہید کے بعد اب نصیحت شروع کی اور دین کی دعوت پیش کی۔ ’’یَا صَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَ أَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ‘‘ (سورۃ یوسف ۳۹) اے قید خانہ کے میرے دوستو (بتاؤ) مختلف رب (ماننا) بہتر ہیں یا وہ اللہ جو کہ تنہا ہے اور قہار ہے۔

مفسرینؒ نے یہاں بڑی نفیس بحث کی ہے آپ تفسیر سے معلوم کرسکتے ہیں۔ یہاں ضروری بات یہ ہے کہ قیدی لوگ اپنی غرض لے کر آئے تھے لیکن یوسف علیہ السلام نے ان کو پہلے دین کی نصیحت کی۔لہٰذا ہم ائمہ کو بھی (وراثت کے ناتے) چاہیے کہ جب بھی ہم سے متعلق کوئی شخص کام لے کر آئے تو اسے دینی نصیحت کے بغیر نہ چھوڑیں۔ جو شخص دین کے جس معیار کا ہو اعلیٰ اوسط ادنیٰ اسے اس کے معیار سے اوپر کی نصیحت ضرور کریں۔مثلاً نمازوں کا اہتمام،شرم وحیا کبازی،اخلاق وکردار وغیرہ ان شاء اللہ چند سالوں میں آپ اچھا معاشرہ دیکھ سکیں گے۔

یوسف علیہ السلام کا تأثر قیدیوں پر

جب یوسف علیہ السلام قید میں داخل ہوئے تو اس میں ایسے قیدیوں کو پایا جو زندگی سے مایوس، سخت مصائب سے دوچار تھے جن کا غم طویل ہو چکا تھا۔ تو یوسف علیہ السلام نے داخل ہوتے ہی فرمایا تم لوگ خوش ہو جاؤ اور صبر کر لو تمہیں اجر وثواب سے نوازا جائے گا۔ تو انہوں تعجب سے کہا اے نوجوان اللہ تمہیں برکت عطا فرمائیں آپ کس قدر حسین سیرت وصورت کے مالک ہیں، ہمیں آپ کی اس صحبت سے برکت کی امید ہے، لیکن ہمیں حیرت یہ ہے کہ جب سے ہم یہاں آئے ہیں تب سے ایسی خبر آپ کے سوا کسی نے نہیں دی ہمیں کسی نے بھی ایسی تسلی نہیں دی کہ صبر پر اجر وثواب حاصل ہوگا نیز مصائب پر صبر سے گناہوں کا کفارہ حاصل ہوگا اور ان سے صفائی حاصل ہوگی آخر آپ ہیں کون؟ (روح المعانی ۱۲/۵۹۲، ۵۸۴)۔

دیکھئے حضرت یوسف علیہ السلام نے قیدیوں کو اول ملاقات میں کیسا متأثر کر دیا، ہم بھی مغموموں کے غم میں حصہ دار بنیں، مصیبت زدہ کے ساتھ روئیں اور تکلیف میں مبتلا لوگوں کے آنسوں پونچھیں اس طرح اپنی دعوت کو مؤثر بنائیں۔ پھر ان کو نصیحت کریں۔ وہ ضرور آپ کی نصیحت کو قبول کریں گے۔

(۹) ائمہ حضرات معلّم الناس ہیں، تعلیم ناس مقدم ہے نوافل پڑھنے پر

سید الانبیاء حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم جہاں امام الانبیاء والمسلمین تھے وہاں آپ معلّم امت بھی تھے۔ ارشاد ہے "اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً" کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ آپ نے جہاں صحابہ کی نمازوں میں امامت فرمائی ہے وہاں آپ نے ان کو زیور علم سے آراستہ بھی فرمایا ہے۔ لہٰذا ائمہ حضرت کو بھی چاہیے کہ امامت کے ساتھ مقتدیوں کی تعلیم سے دلچسپی رکھیں۔

چناں چہ مختلف روایتوں میں وارد ہے کہ کبھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو قرآن شریف کی

چند آیتیں، کسی کو ثنا، کسی کو دعائیں، اور کسی کو ذکر اللہ کے مختلف کلمات، کسی کو تشہد اور کسی کو مسنون دعا وغیرہ سکھلائیں۔

حتی کہ آپ نے اپنی حیثیت ہی معلم کہہ کر یہ سمجھا دی کہ نبی اپنی امت کے لیے ایک بے غرض غیر تنخواہ دار ہر وقت سکھلانے والا معلّم ہوتا ہے اور معلم یعنی سکھلانے والا کہہ کر سکھلانے والے اور پڑھانے والے میں فرق سمجھا دیا کہ آپ صرف پڑھانے والے ہی نہیں بل کہ سکھلانے والے ہیں۔ سکھلانے والا وہ ہوتا ہے جو متعلم کو سکھلا کر چھوڑے۔

حضرت کریب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فریضۃ العصر پڑھنے کے بعد دو رکعت نماز پڑھی باوجودیکہ آپ عصر کی نماز کے بعد کوئی اور نماز پڑھنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان پڑھی ہوئی دو رکعتوں کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس وفد عبد القیس آیا تھا (ان کی تعلیمی) مصروفیت سے ظہر کے بعد کی دو رکعت سنت پڑھنے سے رہ گئی تھی وہ میں نے پڑھی ہے۔ (مشکوۃ ۹۴)۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ آپ کیسے معلم تھے کہ امت کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے اپنے ذاتی معمول کو بھی مؤخر کیا[1]۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سنت الظہر چھوڑ کر وفد ابی قیس کو تعلیم دینے سے علماء اسلام نے یہ سمجھا ہے کہ لوگوں کو دین سکھلانا نوافل پڑھنے پر مقدم ہے اور اگر شدید ضرورت ہو تو سنن رواتب پر بھی مقدم ہے (مرقات ۳/۴۶)۔ (مسجد میں تعلیمی حلقوں کی بحث جزء چہارم میں ہوگی)۔

دینی تعلیم نبوی درسگاہ کا وہ سبق ہے جسے معلم امت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو ایمان کے بعد سب سے پہلے پڑھایا ہے۔ اسی لیے سینکڑوں احادیث میں علم کی عبادت پر اور علماء کی

---

[1] جس سنت الظہر کا تذکرہ اس حدیث شریف میں ہے اس کا درجہ تمام سنن رواتب میں تیسرا ہے۔ اول تو سنت الفجر ہے پھر سنت المغرب ہے پھر سنت الظہر۔

عابدوں پر فضیلتیں وارد ہیں۔ وجہ فضیلت یہ ہے کہ علم سے جہالت دور ہوتی ہے، اور علم ہی شیطان کے مکر کا توڑ ہے۔ نیز علم کا فائدہ متعدی ہے جب کہ عبادت کا لازم۔

تعلیم نبوت کی طاقت، معجزہ کی طاقت سے زیادہ ہوتی ہے

علمائے اسلام نے علماء حضرات کے لیے ایک بڑی عمدہ اور اہم بات لکھی ہے، غور سے پڑھیں اور دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت ہم پر منکشف فرمائیں۔

کم تنخواہ کے باوجود مکتب و مدارس کے اساتذہ کا ۴۰/۵۰ سال طویل عرصہ ہمہ تن دینی تعلیم میں اشتغال کی قوت، قوت معجزہ سے کم نہیں۔ آپ کو ضرور تعجب ہوگا کہ یہ کیسے؟ اسی کو سمجھانے اور اس کا یقین دلانے ہی کے لیے یہ عنوان مرتب کیا ہے۔ اللہ کرے یقین حاصل ہو۔

معجزہ دلیل نبوت ہے نہ کہ مقصد نبوت

ہر دعویٰ کی ایک دلیل ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی کہے کہ یہ مکان میرا ہے، یہ بیٹا میرا ہے تو یہ اس کا دعویٰ ہے یہ دعویٰ اس وقت درست ہوگا جب کہ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں دلیل پیش کرے۔ اسی طرح نبی و رسول کا یہ کہنا کہ میں نبی یا رسول ہوں یہ نبوت و رسالت کا دعویٰ ہے۔ انبیاء و رسل علیہم السلام بھی اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے میں دلیل رکھتے ہیں اور وہ دلیل ان کا معجزہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینکڑوں معجزات ہیں۔ [۱]

---

[۱] مثلاً شق القمر کا معجزہ کہ آپ نے چاند کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کیا تو اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے سورج کو غروب ہونے کے بعد دوبارہ لوٹایا اور نکالا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا جو جادوگروں کے تمام سانپوں کو ایسا بڑا اژدہا اور سانپ بن کر نگل جاتا تھا، کہ جب وہ اپنا جبڑا کھولتا تو اوپر نیچے کے ہونٹ کے درمیان فرعون کا پورا محل آجاتا یہ اس فرعون کے لیے عذاب اور دردِ سر تھا جس کے سر میں چار سو سال تک درد نہیں ہوا۔

بہر حال ہر نبی ورسول کو دو چیزیں عطا کی جاتی ہیں ایک نبوت ورسالت دوسرا معجزہ۔ نبوت ورسالت مقصد اور دعویٰ ہوتا ہے، اور معجزہ اس کی دلیل اسی کو یوں بھی کہہ لیں کہ ہر نبی کو من جانب اللہ دو چیزیں عطا کی جاتی ہیں۔ ایک تعلیم دوسری تائید۔

تعلیم دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اس کا مکلف کیا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو فکری ونظری طور پر توحید کی تعلیم دے کر ان کو شرک وکفر اور جہالت وبدعات سے نکال کر وحدانیت وسنت اور علم وہدایت کی طرف بلائے اور عملی طور پر معاصی ومنکرات سے نکال کر طاعت وعبادت اور اخلاق وکردار کی طرف بلائے۔ یہ تعلیم اس کے فرائض ومقاصد میں سے ہے اور اس کا درجہ ایسا ہی ہے جیسا جسم میں روح کا۔

اور تائید نبوت دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جب لوگ نبی کی دعوت اور تعلیم کا انکار کردیں اور اس کی تصدیق کے لیے کوئی دلیل طلب کریں کہ جب تک دلیل سے ہمیں یقین نہیں دلائیں گے تب تک ہم تسلیم نہیں کریں گے۔ تو من جانب اللہ نبی کو (اس کی دعوتِ رسالت کی تصدیق کے لیے) دلیل دی جاتی ہے جس دلیل کو اصطلاح شرع میں معجزہ کہتے ہیں۔[1]

یہ معجزہ مقصد نبوت نہیں ہوتا بل کہ مقصد کی تائید ہوتا ہے۔ یہ ہُوا تائید نبوت (نبراس ۴۸۳ وجواہر الفرائد ۶۳۶)۔

مذکورہ تفصیل سے آپ نے سمجھ ہی لیا کہ معجزہ کی طاقت کیا ہوتی ہے حالاں کہ معجزہ نبوت ورسالت کا مقصد نہیں بل کہ وہ مقصد کے لیے صرف دلیل وتائید ہوتا ہے۔ تو اندازہ کیجئے جو چیز مقصد ہوگی یعنی نبوت ورسالت اور نبی کی تعلیم اس کی طاقت کیا ہوگی! بلفظ دیگر! دو نظام ہیں۔

---

[1] معجزہ نبی کے ہاتھ عادت واسباب کے خلاف ظاہر ہونے والے امر کو کہتے ہیں۔ اور اس کو معجزہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس جیسے امر کو دوسرے لوگ پیش کرنے سے عاجز ہوتے ہیں۔

تکوینی نظام اور تشریعی نظام

(۱) تکوینی نظام مثلاً: آسمان وزمین کی تخلیق ان کی گردش، چاند وسورج اور سیاروں کی روش، مادی منفعتوں کے ذرائع اور ہواؤں، موسموں اور بارشوں وغیرہ کا نظام۔

(۲) تشریعی نظام مثلاً: نماز وروزہ وغیرہ عبادتیں، اوامر واعمال کا امتثال اور نواہی ومعاصی سے اجتناب، دینی علوم اور حفاظت دین اور اس کی اشاعت وغیرہ۔

دونوں کی مثال یہ ہے کہ مثلاً کسی انجنیئر نے کوئی بڑی مشین بنائی جو قیمتی بھی ہو نفیس بھی۔ لیکن یہ صرف مشین کا ڈھانچہ اور اس کی صورت ہے جس سے کوئی منفعت حاصل نہیں ہوتی کیوں کہ وہ ساکن اور غیر متحرک ہے لیکن جب اس کے ساتھ بجلی سے ربط پیدا کر کے بجلی کی لہر اس میں دوڑا دی جائے تو وہ حرکت کرنا شروع کرے گی اور اس کی افادیت حاصل ہوگی۔

تکوینی نظام تو مشین کے ڈھانچہ کی طرح ہے اور تشریعی نظام بجلی کی رو اور لہر کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو بنایا جس میں ساری ضرورتوں کا انتظام فرمایا پھر نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ شرعی نظام قائم کیا تو گویا مادی کائناتی نظام کی جان اور روح شرعی نظام ہے جو اصل خلقت کا منشا ہے۔ سوچیے ہم کس قدر سعادت مند ہیں کہ ہم (ہمارا تعلیمی اشتغال) کائناتی نظام کی جان ہیں اور ہم کائنات کی خلقت کے اصل منشا میں مصروف ہیں۔

سوچیے اگر اپنے زمانہ کے کسی ولی کامل سے خارق عادت کسی کرامت کو کھلی آنکھوں دیکھ لیں: مثلاً ہوا میں اڑتے دیکھ لیں جیسا کہ شیخ احمد خضرویہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے مریدین کے بارے میں لکھا ہے، ''كَانَ لِلشَّيْخِ اَحْمَدَ خَضْرَوِيَةَ اَلْفُ مُرِيْدٍ يَمْشُوْنَ عَلَى الْمَاءِ وَيُطِيْرُوْنَ عَلَى الْهَوَاءِ'' (نبراس ۲۹۷)۔ تو کیا ہمارے حیرت کی کوئی انتہا ہوگی! کیا اتنی حیرت ہمیں مقصد

نبوت یعنی تعلیمی مصروفیت میں ہے جس کا درجہ اس کرامت سے بڑھ کر ہے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اپنی اس تعلیم پر کبھی یہ تصور نہیں ہوتا کہ ہم ایک بلند مقصد نبوت میں مصروف ہیں۔ حالاں کہ جتنی طاقت کرامت کی ہے اس سے کہیں زیادہ طاقت تعلیم کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تعلیمی تقاضوں کے انجام دینے میں پورے طور پر کوتاہی کے مرتکب ہیں۔ نہ طلبہ کی سچی خیر خواہی نہ دل کی صفائی نہ ہمہ تن علمی انہماک نہ اس نعمت کی شکر گزاری۔ اللہ تعالیٰ تعلیم کی قدر دانی ہمیں نصیب فرمائیں۔ آمین۔ لہٰذا ائمہ کو چاہیے کہ اپنے مقتدیوں کو سبقاً سبقاً تعلیم سے خوب آراستہ کریں۔

معاشرے کو قرآنی تعلیم سے آراستہ کرنا

ائمہ کی یہ بھی ایک صفت وخوبی ہے کہ قوم نے انہیں جن اہم مقاصد کے پیش نظر امامت جیسے منصب پر فائز کیا ہے ان مقاصد کے حصول سے ان کو فائدہ پہنچاتے ہیں، اس میں کوتاہی نہیں کرتے۔ ان مقاصد میں سے ایک اہم مقصد قرآن کی تعلیم ہے جس کو لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس تعلیم کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ ارشاد ہے ”اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ۝“ (سورۃ الرحمن)۔ رحمن نے قرآن سکھایا، اس نے انسان کو پیدا کیا، اس نے اس کو بیان سکھایا۔

---

[1] چناں چہ کتب تصوف میں کرامت کی دو قسموں سے بھی مذکورہ بات کی وضاحت ہوتی ہے۔ لکھا ہے کہ کرامت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کرامت حسی جیسے مافی الضمیر پر مطلع ہونا، پانی پر چلنا وغیرہ، عوام لوگ اسی کو کمال شمار کرتے ہیں۔ دوسری کرامت معنوی یعنی شریعت پر قائم رہنا۔ مکارم اخلاق کا خوگر ہونا۔ نیک کاموں کا پابندی و بے تکلفی سے صادر ہونا کہ کوئی سانس غفلت میں نہ گزرے۔ خواص کے نزدیک یہی کرامت اصل ہے۔ جس میں استدراج کا دخل نہیں برخلاف قسم اول کے اس میں استدراج کا احتمال ہے (کرامات حضرت شاہ امداد اللہ قدس سرہ ۱۱، ۱۴)۔ اسی لیے صوفیہ کہتے ہیں ”الاستقامۃ فوق الف کرامۃ“۔۔۔

اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں میں اگر کوئی نعمت بڑی ہے تو وہ قرآن کریم ہے۔اس لیے کہ وہ دین ودنیا اور معاش ومعاد کی تمام خیر وبرکات کا سرچشمہ ہے، اگر چہ انسان کی تخلیق بھی اللہ کی ایک نعمت ہے لیکن تعلیم اس سے بھی بڑی نعمت ہے۔غالباً اسی لیے تعلیم قرآن کو مقدم کیا ہے ''عَلَّمَ الْقُرْآنَ'' حالاں کہ طبعی طور پر تخلیق مقدم ہے اور تعلیم مؤخر۔تعلیم قرآن کو مقدم کر کے شاید اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ تخلیق کا مقصد ہی تعلیم اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ہے۔

تعلیم قرآن کو ذکر کرنے کے بعد تعلیمِ بیان کو ذکر کیا ''عَلَّمَهُ الْبَيَانَ'' کیوں کہ تعلیم قرآن کا افادہ واستفادہ بیان پر موقوف ہے، کیوں کہ عادۃً جو شخص قرآنی تعلیم لیتا دیتا ہے وہی اس کی تعلیم دینے پر قادر ہوتا ہے۔اور تعلیم بیان میں ہر قسم کی تعلیم شامل ہے چاہے زبانی ہو کہ تحریری یعنی افہام وتفہیم کے جتنے ذرائع ہیں وہ سب ہی۔اور یہ بھی عام ہے کہ جس زبان میں، جس علاقہ میں اور جس قوم میں بھی ہو یہ سب ہی تعلیم بیان کے اجزاء ہیں (معارف القرآن ۸/۲۴۳)۔

قرآنی تعلیم کا مطلب

معاشرہ کو قرآن کی تعلیم دینا اللہ کی نگاہ میں مکرم بنانا ہے۔لہٰذا ائمہ کرام معاشروں کو قرآنی تعلیم سے آراستہ کر کے انہیں رحمن کی نگاہ میں معزز ومکرم بنائیں۔قرآنی تعلیم کا مطلب صرف یہ نہیں کہ انہیں ناظرہ قرآن سکھایا جائے، ہاں وہ بھی اس کا ایک حصہ ہے۔بل کہ مطلب یہ ہے کہ قوم میں جو دینی مختلف کمزوریاں پائی جائیں ان کو بذریعہ مؤثر بیان ''عَلَّمَهُ الْبَيَانَ'' دور کرنا اور ان کو دینی مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنا ہے۔مثلاً:

(۱) ائمہ اگر عقائد کے باب میں شکوک وشبہات محسوس کریں تو عقائد صحیحہ کے ذریعہ ان کا ازالہ کریں۔

(۲) عقائد درست ہوں لیکن دلوں کا اعتماد ویقین کمزور ہو بایں معنی کہ لوگوں کا یقین اسباب ومخلوقات پر ہوتو اسباب اور مخلوقات کا یقین نکال کر مسبب الاسباب اور خالق کا یقین پیدا کریں۔

(۳) دنیوی زندگی کی طرف رجحان کو غالب پائیں تو اس کی فنائیت اور آخرت کی ابدیت کو سمجھا کر آخرت کی طرف راغب کریں۔

(۴) اعمال واخلاق میں کمزوری محسوس کریں تو اعمال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں فتح وکامیابی کے منحصر ہونے کو سمجھا کر نبوی اعمال اور نبوی تہذیب پر کھڑا کریں۔

اس طرح کی قرآنی تعلیم مقصود ہے جو ائمہ حضرات کا ایک فرض منصبی ہے، اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی توفیق نصیب فرمائیں۔ آمین۔

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کی علماء حضرات کو نصیحت

دینی تعلیم وتبلیغ اور اصلاح مسلمین کی اہمیت کو بڑے حسین اسلوب میں ماضی قریب کے ایک اللہ کے بڑے ولی حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے ہم استفادہ کی غرض سے اسے پیش کرتے ہیں۔

حضرات علمائے کرام اپنے اپنے حلقہ میں دین کے پیشوا اور قوم کے مقتدا ہیں ان کے اس رفیع منصب کے لحاظ سے ان پر گراں قدر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اس لیے ہم سب کا فرض بنتا ہے کہ ان عظیم الشان ذمہ داریوں کو پوری طرح محسوس کریں اور ان سے عہدہ برآں ہونے کی تدابیر اختیار کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو امانت ہمارے ذمہ سپرد ہوئی ہے اس کے لیے ہم فکر مند ہوں اور امت کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر چلانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

جو حضرات امامت وخطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں انہیں اس بات کی حرص ہونی چاہیے کہ ان کے وجود سے علاقے کے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ دینی نفع پہنچے۔ اور لوگوں کا تعلق مساجد سے قائم ہو جس کے لیے ذیل کی تدابیر اختیار کی جائیں۔

ا : جمعہ کے خطبات کیف ما اتفق نہ ہوں بل کہ ان کے لیے اہم دینی موضوعات کو ایک خاص ترتیب سے منتخب کیا جائے۔ اور جس موضوع پر خطاب کرنا ہو اس کے لیے پوری تیاری کی جائے، مؤثر انداز میں موضوع کا حق ادا کیا جائے، ترغیبی پہلو کو غالب رکھا جائے اور بات ایسے نپے تلے جملوں میں پیش کی جائے کہ جس سے نہ صرف بات ذہن نشین ہو جائے بل کہ سامعین کی فکری وعملی اصلاح بھی ہو۔

ب : جن مساجد میں مکاتب قرآنیہ کا نظم نہیں وہاں اس کو قائم کیا جائے۔ اور جہاں اس کا نظم ہو وہاں اس کی نگرانی سے اسے مزید مضبوط بنایا جائے اور ترغیب سے والدین کو آمادہ کر کے بچوں کو لایا جائے تا کہ محلہ کا ایک بھی بچہ ناظرہ قرآن پڑھنے سے محروم نہ رہے اور ناظرہ کے بعد بھی حفظ قرآن شریف کی ترغیب دی جائے۔

ج : نوجوان طبقہ کو دین سے مانوس کرنے کی سعی کی جائے اور ان کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے بھی وقت فارغ کیا جائے (تعلیم بالغان کا نظم کیا جائے)۔

د : جن مساجد میں تبلیغی جماعت کے حلقے قائم ہیں، ان سے ربط رکھا جائے ان کی بھرپور اعانت وسرپرستی کی جائے اور نوجوانوں کو ترغیب دے کر تبلیغی جماعت سے وابستہ کرنے کی ہر ممکن سعی کی جائے۔ (از تحفۃ الائمہ ۲۱۵)

ھ : قرآن کریم، حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسائل فقہیہ کا درس باقاعدگی کے ساتھ دیا

جائے جس کے لیے کوئی مناسب وقت تجویز کیا جائے۔[1]

نوٹ : یادرکھیں کہ تبلیغی جدوجہد سے یا تعلیم ناس سے یا تفسیر واحادیث کے درس سے مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہو اور لوگوں کو صرف اور صرف دین سے جوڑنا ہوتا کہ حقیقی معنی میں لوگ دیندار بنیں۔ اپنی ذات سے یا ہماری کوئی خاص محنت سے جوڑنے کا خیال نہ ہو۔

علماء کے عمل کی قوت اور اس کی تاثیر

حضرات ائمہ ایک بات ذہن نشین رکھیں کہ شریعت عوام الناس کا وزن جس میزان سے کرتی ہے علماء کا وزن اس میزان سے نہیں کرتی۔ جس طرح کافر کا وزن مؤمن کی میزان سے نہیں کرتی "هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ"۔ اور "أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَّا يَسْتَوُوْنَ"۔ علماء جس طرح وصف علم میں عوام سے ممتاز ہیں اس طرح وہ فکر و عمل کے اوصاف میں بھی ان سے ممتاز ہوں۔ علماء کے فکر و اعمال کی پرواز نہایت ہی بلند اور ان کے کردار نہایت ہی ممتاز ہوتے ہیں۔ کہیے کہ وہ ذائقہ میں شیریں، منظر میں دلکش، وزن میں بھاری اور اثر میں مقناطیس ہوتے ہیں۔ ان کے عمل کی قوت پر ذیل کا واقعہ ملاحظہ ہو۔

---

[1] شیخ الحدیث حضرت مولانا فضل الرحمن اعظمی مدظلہ العالی آج کل ساؤتھ افریقہ میں ہیں اور ان کی کتابوں کو اللہ تعالیٰ نے بہت مقبولیت دے رکھی ہے۔ حال ہی میں مکتبہ دارالہدیٰ سے ان کا ایک کتابچہ "کیا تبلیغی کام ضروری ہے؟" کے نام سے شائع ہوا ہے اس کتاب میں حضرت والا نے تبلیغی کام کی ضرورت واہمیت پر بہت ہی مفید ابحاث فرمائی ہیں۔ ائمہ حضرات کے لیے اس کا مطالعہ بہت ہی مفید رہے گا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب "مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت" اور حضرت مولانا محمد منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب "ملفوظات مولانا الیاس" واقعی اس لائق ہیں کہ ہر امام صاحب اپنی لائبریری میں ان کو رکھیں اور عوام الناس کو بھی ان کا مطالعہ کرائیں۔ تاکہ وہ بھی حکمت وبصیرت کے ساتھ اس تبلیغی کام کو کرنے والے بنیں اور دوسروں کے لیے بھی بہترین نمونہ ہوں (از تحفۃ الائمۃ حضرت مولانا محمد حنیف عبدالمجید صاحب، سابق استاذ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، پاکستان)۔

امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اصول حدیث کے ضمن میں علماء کے عمل کی قوت پر جو فیصلہ کیا ہے اسے بغور پڑھیں اور اپنے کو بھی اس پر ڈھالنے کی کوشش فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ امام ترمذی کو جزاء خیر عطا فرمائیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اِذَا اَتَی اَحَدُ کُمُ الصَّلٰوۃَ وَالْاِمَامُ عَلٰی حَالٍ فَلْیَصْنَعْ کَمَا یَصْنَعُ الْاِمَامُ " (ترمذی۔ مشکوۃ ۱۰۲) جب تم میں سے کوئی شخص (جماعت کی حاضری کے لیے) نماز کو آئے اور امام کسی حالت میں ہو تو امام جو کچھ کر رہا ہو تو وہ بھی وہی کرے۔ یعنی امام اگر رکوع یا سجدہ وغیرہ جس حال میں ہو تو آنے والا شخص بھی اس عمل میں شامل ہو جائے چاہے رکعت محسوب نہ ہو۔

اس حدیث شریف کو امام ترمذیؒ نے غریب کہا ہے [1]۔

پھر آگے لکھا ہے "وَالْعَمَلُ عَلٰی ھٰذَا عِنْدَ اَھْلِ الْعِلْمِ" کہ اگرچہ حدیث غریب ہے تاہم علماء اسلام کا اس حدیث پر عمل رہا ہے۔

امام ترمذی کا یہ ارشاد کہ اگرچہ حدیث غریب ہے لیکن علماء کا اس پر عمل ہے دبے جملہ میں وہ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ اسے علماء کے عمل سے تقویت حاصل ہے چناں چہ ملا علی قاریؒ نے یہ جملہ نقل کیا ہے۔ "فَکَاَنَّ التِّرْمِذِیَّ یُرِیْدُ تَقْوِیَۃَ الْحَدِیْثِ بِعَمَلِ اھلِ الْعِلم "۔ مذکورہ بات سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ علماء کا عمل کتنی اہمیت رکھتا ہے کہ جس کی وجہ سے اسے حدیث کی تقویت کا ذریعہ بنایا۔ اور اس قابل بنایا کہ اس پر عمل کیا جائے۔

---

[1] غریب اصول حدیث میں اس حدیث کو کہا جاتا ہے جس کو نقل کرنے والا راوی ایک ہی شخص ہو۔ چاہے تمام طبقات میں ایک ہی ایک ہو یا کسی طبقہ میں زائد بھی ہو گئے ہوں۔ (غریب کو یہ نہ سمجھیں کہ وہ ضعیف ہوتی ہے غریب بھی صحیح ہو سکتی ہے جس طرح وہ ضعیف ہو سکتی ہے)۔

چناں چہ اس کی تائید فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کے اس محتاط قول سے بھی ہوتی ہے جو تراویح کے بارے میں کتب فقہ میں مذکورہ ہے۔ فقہاء کا قول ہے: پیشوا اور راہ نمائے دین کے لیے مسجد میں نماز تراویح پڑھنا ضروری ہے۔ کیوں کہ پیشوا اور علماء کے قول وفعل کو لوگ حجت مانتے ہیں، اگر وہ گھروں میں پڑھیں گے تو عوام بھی سستی کریں گے۔ ''اِلَّا اَنْ یَکُوْنَ فَقِیْھًا عَظِیْمًا یُقْتَدَی بِہٖ فَیَکُوْنُ فِیْ حُضُوْرِہٖ تَرْغِیْبٌ لِغَیْرِہٖ وَفِیْ اِمْتِنَاعِہٖ تَقْلِیْلُ الْجَمَاعَۃِ'' (نور الایضاح ۹۹ حاشیہ ۱۱)۔ برخلاف عامۃ المسلمین کا قول وفعل (اگر وہ گھروں میں پڑھیں) کہ اس کو کوئی دلیل نہیں بناتا جس سے دین کا نقصان متعدی نہیں ہوتا۔

اسی کی ایک دوسری مثال ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے اور واقعہ امام الحرمین شیخ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ شیخ امام الحرمینؒ فرماتے ہیں کہ مجھے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث پہنچی ہے کہ جو شخص (لا الہ الا اللہ) ستر ہزار مرتبہ پڑھے تو اس کی مغفرت کردی جاتی ہے، اور اس کی بھی مغفرت کردی جاتی ہے جس کے لیے اسے پڑھا جائے۔ چناں چہ میں اس پاک کلمہ کو اس عدد کے مطابق پڑھا کرتا تھا اور خاص کسی کی نیت نہیں کرتا تھا۔

اتفاق سے ایک دن میں اپنے رفقاء کے ساتھ ایک دعوت میں شریک تھا وہاں ایک نوجوان بھی تھا جو کشف کے معاملہ میں پہلے سے مشہور تھا وہ کھانے کے دوران رونے لگا، میں نے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا میری والدہ کا انتقال ہو چکا ہے میں نے اسے بذریعہ کشف عذاب میں دیکھ لیا۔ ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر میں نے دل ہی دل میں کلمۂ مذکورہ کا ثواب اس کی ماں کو بخش دیا جس کا اسے پتہ نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ ہنسنے لگا اور کہنے لگا اب میں اپنی والدہ کو خوشی وراحت میں (جنت میں) دیکھ رہا ہوں۔

اس کے بعد شیخؒ نے بڑی حیرت کی بات کہی کہ میں نے اس حدیث (ستر ہزار والی) کے صحیح ہونے کو اس نوجوان کے کشف سے سمجھا اور اس کے کشف کے صحیح ہونے کو اس حدیث سے سمجھا۔ یعنی ایک کے صحیح ہونے کو دوسرے سے سمجھا۔ (مرقات ۹۸/۳)۔ مذکورہ واقعہ سے بھی معلوم ہوا کہ کسی کے کشف کا عمل بھی حدیث کے صحیح ہونے کا ذریعہ ہے۔ اگر چہ وہ عندالمحدثین حجت ہے یا نہیں وہ قابل بحث ہے۔

خیر یہ اس زمانہ کی بات تھی جب خیر کسی قدر غالب تھا۔ لیکن آج بھی علماء کے عمل کی اعلیٰ حیثیت سے کسی کو انکار نہیں یعنی آج بھی لوگ علماء کے بلند کردار کے خواہش مند ہیں۔ عوام تو عوام علماء بھی دوسرے علماء کو متقی وزاہد امین وصادق، مشفق وناصح اور باعمل وبااخلاق اور مخلص دیکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اپنے کو بااثر دیکھنا چاہتے ہیں تو اپنے اعمال وکردار کو باقوت وبااثر بنائیں یعنی پہلے ہم اپنے کو ایسا بنا کر دکھادیں اور پھر دوسروں کو بنا کر دکھائیں۔

جھوٹ عمل سے بھی ہوتا ہے اس سے بھی بچنا ضروری ہے

مذکورہ بالا مضمون (علماء کے عمل کی قوت) کے بیان سے معلوم ہوا کہ ائمہ حضرات کو ہر ایسے کام سے سخت اجتناب کرنا چاہیے جن سے ان کا تقویٰ وثقاہت اور ان کی عدالت اور ان کی شخصیت متاثر ہوتی ہو۔ مثلاً کذب وخیانت وغیرہ۔ جس طرح حدیث شریف کو قبول کرنے کے لیے حدیث کے راویوں میں سب سے پہلے یہی دیکھا جاتا ہے کہ کیا کسی حدیث کا راوی جھوٹ و خیانت کا مرتکب تو نہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کی حدیث قبول نہیں کی جاتی۔ لہٰذا ضروری سمجھ میں آرہا ہے کہ ہم کذب کو مع اس کی اقسام بیان کریں۔ تاکہ ائمہ حضرات ان سے بچنے کا اہتمام کریں۔

کذب دو طرح کا ہوتا ہے۔

ایک کذب صریح۔

دوسرا کذب خفی۔

علمۂ دیندار طبقہ کذب صریح سے اجتناب کرتا ہے۔ کیوں کہ کذب صریح سے آدمی کی شخصیت مجروح ہو جاتی ہے اور ایسا شخص لوگوں کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ علمائے اسلام نے احادیث کے ضمن میں بڑی عجیب بات لکھی ہے وہ یہ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں مشرکین شرک تو کرتے تھے لیکن جھوٹ نہیں بولتے تھے ان کے نزدیک بھی کذب ایسی مذموم چیز تھی جس سے وہ بھی اجتناب کرتے تھے لیکن آج مسلمان ہو کر آدمی جھوٹ بولتا ہے۔

دوسری قسم ایسی ہے جس سے دیندار طبقہ بھی احتیاط نہیں کرتا۔ اور ستم بالائے ستم اسے جھوٹ بھی نہیں مانا جاتا بل کہ اس پر سچائی اور حقیقت کا پردہ ڈال کر اس کو چھپایا جاتا ہے۔ بہر حال جو حکم اور نتیجہ کذب صریح کا ہے وہی کذب خفی کا بھی ہے۔

پھر کذب کی دوسرے لحاظ سے دو قسمیں ہیں۔

ایک کذب قولی۔

دوسری کذب فعلی و عملی۔

کذب قولی ظاہر المعنی ہے۔ لیکن کذب عملی خفی المعنی بھی ہے اور قلیل العلم بھی۔ اس لیے ہم اس کو حدیث شریف سے پیش کرتے ہیں۔

شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ جھوٹ جس طرح زبان سے ہوتا ہے اسی طرح بعض اوقات وہ عمل سے بھی ہوتا ہے۔ کیوں کہ بعض اوقات انسان ایسا عمل اختیار کرتا ہے جو درحقیقت خلاف حقیقت یعنی جھوٹ ہوتا ہے۔

مثال اس کی یہ ہے کہ حدیث شریف میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”اَلْمُتَشَبِّعُ بِمَا لَمْ یُعْطَ کَلَابِسِ ثَوْبَیْ زُوْرٍ“ (بخاری شریف ۷۸۵)۔شکم سیری کا مظاہرہ کرنے والا ایسی چیز سے جو اسے نہیں دی گئی ہے جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے۔یعنی جو شخص اپنے کسی بھی عمل سے اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرے جیسا وہ حقیقت میں نہیں ہے یہ دوہرا جھوٹ اختیار کرنے والے کے مانند ہے اور وہ سراپا جھوٹا ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲۰۶)۔یعنی اپنی اداؤں، نشست و برخواست اور اپنے طرز زندگی سے خلاف حقیقت کا اظہار کرے تو وہ سر سے پیر تک جھوٹا ہے۔بالفاظ دیگر تکلفات وتصنعات میں غلو سے کام لے یہ عملی جھوٹ ہے۔

آج کل عوام وخواص میں اپنی مصنوعی عزت وبرتری جتانے کے لیے حقیقت کے خلاف قول وعمل اختیار کرنا اس قدر عام ہو رہا ہے کہ۔اللہ کی پناہ۔جس کو ہر شخص جانتا ہے حالاں کہ یہ جھوٹ ہے شریعت کو چھوڑ کر آدمی عند اللہ عزت دار نہیں ہوسکتا اور بالکل نہیں۔اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔روایت میں ہے کہ مؤمن میں ہر خصلت وعادت ہوسکتی ہے لیکن خیانت وجھوٹ نہیں ہوسکتی (مشکوۃ ۴۱۴)۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس قبیح اور مذموم خصلت سے محفوظ رکھیں۔آمین۔مذکورہ عملی جھوٹ کی مناسبت سے سمجھ میں آرہا ہے کہ آخرت کے عملی انکار سے بھی آگاہ کیا جائے۔کہ دونوں عملی ہیں اور شدید قبیح بھی۔

انکارِ آخرت کی عملی شکل

آخرت کا ایک انکار تو صریح ہوتا ہے جو بالکل واضح ہے جیسے کفار ومشرکین اور ہندوستانی ہندوؤں کا انکار وغیرہ۔لیکن ایک انکار عملی ہوتا ہے عامۃً اس کو انکار سمجھا نہیں جاتا۔اور اس کا اشارہ خود قرآن کریم نے دیا ہے۔ارشاد ہے ”فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِکْرِنَا وَلَمْ

يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا. ذَٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ " (نجم ۲۹)۔ آپ ایسے لوگوں سے اپنا خیال ہٹا لیجیے جو ہماری یاد سے رخ پھیر لیں، اور دنیوی زندگی کے سوا ان کا کوئی مقصد نہ ہو۔ یہی ان کا منتہائے علم (ہنر) ہے۔

مفسر قرآن حضرت **مفتی محمد شفیع صاحب** رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں کہ یہ ان کفار کا حال بیان ہوا ہے جو آخرت وقیامت کے منکر ہیں جن کا مطمح نظر دنیا اور دنیوی مادی اسباب اور علم وہنر ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ انگریزوں کی تعلیم نے اور دنیوی ہوا وہوس نے آج ہم مسلمانوں کا حال بھی یہی بنا رکھا ہے !! کہ ہمارے سارے علوم وفنون اور علمی ترقی کی ساری کوششیں صرف معاشیات کے گرد گھومتی ہیں۔ (معارف القرآن ۸/۲۱۱)۔

اس کے بعد حضرت نے تفصیل بیان کی ہے اور کلی طور پر دنیا کی طرف توجہ کرنے پر آیت شریفہ سے ثابت کیا ہے کہ یہ بھی آخرت کا انکار ہے چاہے عملاً ہے۔ حضرت **مفتی صاحب**ؒ کے جملوں پر غور فرمائیں کتنی حسرت سے فرما رہے ہیں کہ دنیوی ہوس نے آج ہم مسلمانوں کا حال یہی بنا رکھا ہے۔ آیئے ہم جائزہ لیتے ہیں۔

ہم مسلمانوں کا ایک طبقہ تو بالکل غیر مسلموں کی طرح عصری تعلیم سے مقصد صرف اچھی ملازمت حاصل کرنا اور مال ودولت کو خوب جمع کرنا جانتا ہے اور ان کے طرز زندگی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ کمائی کی ایک مشین اور کمائی کا ایک جانور (حیوان کاسب) ہے جن کی صبح وشام اور شب وروز ایک ہی دُھن ہوتی ہے کہ کہاں سے کمائی زیادہ ہو اور وہ ہیں غیر علماء بعض عوام۔

اور مسلمانوں کا دوسرا (دینی) طبقہ دیکھئے جن کی دینی تعلیم کا مقصد نہ مادی اسباب کا حصول ہوتا ہے نہ اچھی ملازمت نہ عیش وعشرت بل کہ وہ زندگی میں قناعت کی روش اختیار کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کی تعلیم کا مقصد آخرت اور جنت اور رضاء الٰہی ہے اور وہ ہیں علماء کرام۔

ان دونوں طبقات کے مقاصد زندگی اور طرز زندگی کے فرق کو جاننے کے بعد آپ ہی فیصلہ کیجیے۔ کہ اگر دینی طبقہ کے مسلمانوں کی روش اوران کا طرز زندگی بھی پہلے طبقے کے مانند ہو جیسا کہ آج کل حال ہے نہ صرف عام مسلمانوں کا بل کہ بعض علماء کا کہ حب دنیا اور حرص دولت نے آخرت سے ان کو ایسا غافل بنادیا کہ ان (علماء وائمہ) کے زبانی کلمے اور جملے بھی بدل دیئے کہ خدمت دین کو ملازمت کہا جانے لگا اور زیادتیٔ وظیفہ پر قدیم جائے خدمت کو چھوڑا جانے لگا اور جب تک ایسی جگہ میسر نہ آئے اس جگہ کے منتظمین کو وظیفہ کی زیادتی کے لیے ہلکی سی دھمکیاں دی جانے لگیں کہ اگر تنخواہ نہیں بڑھائی تو ہم ملازمت چھوڑ دیں گے۔

یہ زبانی جملوں کی تبدیلی، جائے خدمت کی انتقالی، اور یہ دھمکیاں کس پر دلالت کرتی ہیں؟ سوچیے اور غور کیجیے۔

یقیناً آپ جس مشاہرہ اور معاوضے پر دینی خدمت کر رہے ہیں وہ صرف کم ہی نہیں بل کہ کچھ نہیں۔ وہ ترازو کی پاسنگ بھی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ بہت کچھ ہے بل کہ سب کچھ بھی۔

کیوں کہ کم کا سوال تو اس وقت ہوتا جب کہ ہم روپیوں کی بنیاد پر پڑھاتے۔ وارثین انبیاء کے یہاں دنیا کی کمی وبیشی کوئی درجہ نہیں رکھتی پھر اس میں موازنہ کیسا؟ اور بہت کچھ اس لیے ہے کہ آپ قرآن شریف کی کوئی آیت کریمہ یا کوئی حدیث گرامی کا ایک جملہ کسی کو پڑھائیں گے اس کا عوض دنیا کے سارے خزانے بھی نہیں بن سکتے۔ کیوں کہ آپ نے جو پڑھایا اس کا اجر وثواب لایزال غیر فانی ہے اور جو خزانے آپ کو دیئے گئے وہ فانی زائل ہونے والے ہیں [1]۔

---

[1] تنخواہ اور وظیفے کے بارے میں مذکورہ بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم وارثین انبیاء علیہم السلام (علمائے عظام وائمہ کرام) کی قدر ومنزلت مٹا رہے ہیں یا گھٹا رہے ہیں اور نہ یہ مطلب ہے کہ ان کے معاش کو

یہ تو اوقات کی اجرت ہے اور بس ''المجتمعُ المسلمُ یؤدِّی إلی الأئمةِ الکرامِ رواتِبَهُمُ الشهرِیَّةَ اجرةَ استخدامِ اوقاتِهِم فحسبُ لان الامامةَ بالمصلّین لایُمکنُ ان یُوزن هذهِ الخدمةُ الجلیلةُ بمیزانِ الرواتبِ والوظائِفِ'' ہاں یہ الگ بات ہے کہ آپ کے منتظمین کو آپ کا خوب سے خوب تر لحاظ رکھنا چاہیے ورنہ خواہ مخواہ کی تنگی میں ڈالنے کی صورت میں وہ قیامت کے روز ماخوذ ہوں گے۔

ائمہ کو بہت سے جائز کام بھی چھوڑ دینے پڑتے ہیں

مقتدا اور غیر مقتدا کی زندگی میں نمایاں فرق ہونا چاہیے۔ مطلب جو آدمی رتبہ میں جتنا بڑھا ہوا ہوتا ہے اس قدر اس کی ذمہ داریاں اور پابندیاں بھی بڑھی ہوئی ہوتی ہیں، لہٰذا جو کام

صفحہ نمبر ۱۴۴ کا باقیہ حاشیہ۔۔۔۔۔۔

برباد کر کے ان کو بے حال بنایا جائے، نہیں یہ ان کی حقیقی اوصاف کی صرف ترجمانی ہے ورنہ منتظمین مساجد اور عام مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے امام کو معاش سے بے فکر کر کے اپنے سے بلند درجہ نہ سہی کم از کم اپنے درجے میں ضرور رکھیں ان کی تمام ضروریات کا اس طرح خیال رکھیں جس طرح اپنی ضروریات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اور ائمہ کو بھی چاہیے کہ معاش سے بے فکر ہو کر مسلمانوں کی دینی ضروریات کے لیے سچی خیر خواہی کے ساتھ اپنے آپ کو وقف کر دیں۔

عجیب ماجرا ہے ! اگر بستی و آبادی کے سارے مسلمان مل کر اپنی مسجد کے ایک امام کو (اخراجات میں) اپنے ہی گھر کا ایک فرد تصور کر لیں تو کیا اس کی معاش کا کوئی مسئلہ باقی رہے؟ ہرگز نہ رہے۔ لیکن مسئلہ عمل کا ہے کون عمل کرے؟ اگر کوئی ایک دو محلے یا بستیاں عمل کر کے بتادیں تو پھر ان شاء اللہ یہ چیز رواج پا جائے۔ امید کرتا ہوں کہ مفکرین حضرات اس کی کوئی بہتر صورت تجویز فرما کر ائمہ کی شکایت کا منھ بند فرمائیں گے۔ میں نے اپنے بس کا کام کیا اب اللہ سے امید کر رہا ہوں۔

عوام کے لیے درجۂ جواز کے ہیں بلند رتبہ شخص کے لیے ان میں سے بعض کو کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ گویا کسی کے حق میں صغیرہ دوسرے کے حق میں کبیرہ بن جاتا ہے "مُبَاحَاتُ الْعَوَامِّ سیأتُ الاَبْرَارِ وحسناتُ الابرارِ سیأٰتُ المقرّبین"۔

مفسر قرآن حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ منافقون کی تفسیر میں لکھا ہے کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کا چوں کہ نفاق ظاہر ہو چکا تھا جس کی وجہ سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو قتل کرنے کی درخواست کی کہ اجازت ہو تو اس کو قتل کر دیا جائے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درخواست کو قبول نہیں فرمایا۔

کیوں کہ اس میں اس بات کا خطرہ تھا کہ دشمن لوگ اپنوں میں یہ غلط فہمی پھیلا دیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو قتل کر دیتے ہیں کیوں کہ وہ ظاہر میں مسلمان تھا (جس سے دوسروں کے لیے اسلام میں داخلہ کا دروازہ بند ہو جاتا)۔

اس کے تحت حضرت نے لکھا ہے کہ اس واقعہ نے ہمیں یہ سبق دیا کہ جو کام فی نفسہ جائز اور درست ہو مگر اس کے کرنے میں یہ خطرہ ہو کہ کسی مسلمان کو کوئی غلط فہمی ہوگی یا دشمنوں کو غلط فہمی پھیلانے کا موقع مل جائے گا تو وہ کام نہیں کیا جائے گا (معارف القرآن۔۸/۴۵۶)۔

مؤطا مالک (رحمہ اللہ تعالیٰ) میں حضرت نافع رحمہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کو حالت احرام میں رنگین کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو پوچھا طلحہ یہ کیا ہے؟ حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ نے جواب دیا امیر المؤمنین یہ مٹی سے رنگا ہوا ہے (غالباً مطلب یہ ہے کہ یہ مٹی لگنے سے مٹی کا رنگ لگا ہوا ہے)۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا آپ لوگوں کے امام ہیں لوگ آپ کی اقتداء کرتے ہیں جس سے لوگ بھی حالت احرام میں رنگین کپڑے پہننا شروع کر دیں گے، لہٰذا اس سے احتراز کیجیے (مؤطا ۱۲۶)۔

عہدے داروں کو اس کی ممانعت ہے کہ وہ بڑے لوگوں کی سی زندگی گزاریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ انہوں نے اس طرح کی پابندی اپنے عمال پر لگا رکھی تھی کہ وہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہیں اور اپنی معیشت کا معیار بلند رکھیں۔ ''شَرَطَ عَلَيْهِمْ اَنْ لَّا تَرْكَبُوْا بِرْذَوْنًا وَلَا تَاْكُلُوْا نَقِيًّا وَلَا تَلْبَسُوْا رَقِيقًا وَلَا تُغْلِقُوْا اَبْوَابًا دُوْنَ حَوَائِجِ النَّاسِ''۔ (مشکوٰۃ ۳۲۴)۔ تم اپنی سواری کے لیے ترکی گھوڑا نہ رکھنا۔ میدے کی روٹی نہ کھانا، باریک کپڑے نہ پہننا اور اپنی ضرورت لے کر آنے والوں (عوام) کے لیے دروازہ بند نہ رکھنا ورنہ تم سزا پاؤ گے۔ اوپر کی دونوں روایتیں علماء وائمہ کے لیے بڑی عبرت کا سامان پیش کر رہی ہیں۔

لہٰذا ائمہ وعلماء حضرات کو بھی جو کام فی نفسہ جائز ہوں ان کو اس وقت چھوڑ دینے چاہیے جب کہ ان کے کرنے سے کسی خرابی یا غلط فہمی کا اندیشہ ہو۔ لہٰذا چبوتروں پر بیٹھنے سے، غیر صالح کی صحبت سے (مگر یہ کہ اصلاح کی غرض ہو)، غیر ضروری گفتگو سے پر تعیش رہن سہن سے، مباح جلوس میں شرکت سے اور موبائیل کے غیر ضروری استعمال وغیرہ سے حتی الوسع پرہیز کرنا چاہیے۔

ائمہ کی زندگی سفید لباس کی طرح ہے

ائمہ حضرات کا مقام ومرتبہ ہر خاص وعام میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے ائمہ حضرات کو اپنے منصب ومقام کا خود بھی پاس ولحاظ رکھنا چاہیے۔ ان کی زندگی سفید لباس کی طرح ہے کہ اس پر کوئی بھی دھبہ فوراً نظر آ جاتا ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں بطور خاص مال ودولت کے بارے میں علماء وائمہ حضرات کا کیا رویہ ہونا چاہیے اس طرح بیان کیا ہے کہ ''ہم علماء کی زندگی عوام سے مال ودولت کے سلسلہ میں بالکل ممتاز ہونی چاہیے، دیکھنے والا کھلی آنکھوں

دیکھ لے کہ ہم دنیا کے طالب نہیں، ان کے یہاں مال و دولت معیار نہیں۔ جب تک ہمارے طبقہ علماء میں یہ اخلاقی امتیاز نہ ہوگا ان کی شخصیت مؤثر اور قابل احترام نہیں ہوگی۔

علماء کا وقار اس سے نہیں بڑھے گا کہ یہ مدرسہ اتنا بڑا ہے، وہ مدرسہ اتنا بڑا، وہاں اتنے طلبہ پڑھتے ہیں، اور وہاں کے جلسے اتنے کامیاب ہوتے ہیں اس سے علماء کا وقار قائم نہیں ہوگا۔ علماء کا وقار قائم ہوگا ذاتی نمونہ سے۔ عوام جب دیکھتے ہیں کہ یہ چیز (مال و دولت) ایسی ہے کہ اس پر جان دیدی جائے لیکن علماء اس کو ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھتے ہیں وہ اس کو خاطر میں بھی نہیں لاتے، تب علماء کا ایک مقام اللہ تعالیٰ عوام میں پیدا فرماتے ہیں (تحفۃ الائمہ ر ۷۷)۔

لہٰذا ائمہ حضرات اپنی ضروریات زندگی میں ایسا طرز اختیار کریں کہ کوئی بھی تہمت وشبہ باقی نہ رہے۔ مثلاً سواری، مکان اور کپڑے وغیرہ میں اپنی آمدنی کے تناسب سے اپنی سواری اپنا مکان وغیرہ بسائیں، آمدنی سے بڑھ کر نہ بسائیں۔ جس سے لوگ خواہ مخواہ مغالطوں اور شکوک کے شکار ہوں اور پھر آپ حضرات لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جائیں۔ چاہے لوگ آپ سے کہیں یا نہ کہیں سمجھتے ضرور ہیں کہ کیا ہو رہا ہے!!!

حضرت شیخ سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ بہت ہی بڑے عارف گزرے ہیں آپ نے فرمایا: دس درویش ایک کمبل میں سما سکتے ہیں مگر دو بادشاہ پورے ملک میں نہیں سما سکتے!! درویش سے پوچھیں تو کہے گا کہ یہ کمبل بہت بڑا ہے دس اور بھی آجائیں تو بھی اس میں سما جائیں گے۔ اور بادشاہ سے پوچھیں گے تو وہ کہے گا کہ یہ ملک تو بہت ہی چھوٹا ہے ایسی ہزاروں دنیا اور بھی پیدا ہو جائیں تو وہ بھی کم ہیں۔ معلوم ہوا کہ اصل بات لوگوں کی ہوس اور قناعت کی ہے۔

جب تک حب دنیا کو مٹایا نہیں جائے گا وہاں تک اللہ تعالیٰ کے یہاں ہمارا کوئی مقام ہی نہ ہوگا۔ حضرت شیخ زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ نے فضائل صدقات میں لکھا ہے کہ دنیا سے محبت رکھنے

والا اگر چہ آخرت کے اعمال کرتا ہو،لیکن اس ناپاک دنیا کی محبت رنگ لائے بغیر نہ رہے گی۔۔۔ جو شخص دنیا کو محبوب رکھتا ہے سارے پیرو مرشد مل کر بھی اس کو ہدایت نہیں کر سکتے۔اور جو شخص دنیا کو ترک کر دیتا ہے اس کو سارے مفسدین مل کر بھی گمراہ نہیں کر سکتے۔ (فضائل صدقات ۴۲۱)۔

اسی حب دنیا کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ابو طالب نے ایمان پیش کرنے کے معاملہ میں کہا تھا۔''اِخْتَرْتُ النَّارَ عَلَی الْعَارِ'' کہ قوم کی نگاہ میں ذلت برداشت نہیں کرسکتا ہاں جہنم کی آگ برداشت کرسکتا ہوں۔العیاذ باللہ۔۔

لہٰذا ائمہ حضرات قناعت کو اپنا شیوہ بنائیں اور جو ضرورت درپیش ہو اس کا سوال صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کریں،لوگوں سے اپنی ضرورت کا اظہار مہذب انداز میں بھی نہ کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں سے ہر شخص اپنی تمام ضرورتوں کا سوال اپنے رب سے کرے حتی کہ اپنے جوتے کے تسمہ کے ٹوٹنے پر تسمہ کا سوال بھی (صرف اللہ سے کرے)(مشکوۃ/۱۹۲)۔

حضرت ابو علی دقاق رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ بات معرفت کی نشانیوں میں سے ہے کہ اپنی حاجت،خواہ وہ بڑی سے بڑی ہو یا چھوٹی سے چھوٹی صرف اللہ سے مانگی جائے۔پھر انہوں نے بڑی عمدہ مثال پیش کی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اللہ تعالیٰ کے دیدار کے مشتاق ہوئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں سب سے بڑی اور سب سے عظیم الشان درخواست یہ پیش کی ''رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْكَ'' اے میرے رب مجھے دکھا کہ میں تیری طرف یعنی تجھے دیکھوں۔دوسری طرف وہ نانِ جویں کے بھی محتاج ہوئے تو پروردگار ہی سے عرض کیا ''رَبِّ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ'' میرے پروردگار تو نے میری طرف از قسم مال ورزق جو کچھ اتارا ہے میں اس کا محتاج ہوں۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے بیعت کے لیے بلایا اور

وہ اس بات پر تھی کہ تم ،لوگوں سے کسی بھی چیز کا سوال نہیں کرو گے۔ میں نے منظور کرلیا اور کہا کہ ٹھیک ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تمہارا اپنے ہاتھ سے کوڑا بھی گر جائے تم نیچے اتر کر خود اٹھاؤ گے۔ (مشکوۃ ۱۶۴)۔ حالاں کہ کوڑا اٹھوانا سوال میں سے نہیں کیوں کہ سوال تو دوسرے کے مال سے ہوتا ہے، جب کہ کوڑا تو خود کا ہے پھر بھی مبالغۃً کوڑا دوسرے سے اٹھوانے سے بھی منع فرمایا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عرفہ کے دن ایک آدمی کو لوگوں سے سوال کرتے سنا تو آپ نے یہ کہہ کر درہ سے خبر لی کہ اس دن اور اس جگہ (میدان عرفہ میں) غیر اللہ سے سوال کرتا ہے (مشکوۃ ۱۶۳)۔ یعنی اس مقدس دن اور مقدس جگہ میں جب کہ دو دو شرف جمع ہیں غیر اللہ سے سوال کرتا ہے اللہ سے مانگنا چاہیے نہ کہ لوگوں سے۔

ان احادیث وغیرہ کو نقل کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ہم خود بھی لوگوں سے مستغنی ہوں اور قناعت کو اختیار کریں اور اپنے مقتدیوں کو بھی استغناء کی خوب تعلیم دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کامل طور پر مستغنی بنائیں۔ آمین۔

ائمہ مضر بے تکلفی سے اپنے کو خوب بچائیں

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے ہر کام میں افراط و تفریط سے بچا کر اعتدال و میانہ روی کی خوب تعلیم دی ہے۔

احادیث کی کتابوں میں باقاعدہ محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے "بَابُ الْقَصْدِ فِي الْعَمَلِ" کے تحت ایسی احادیث جمع کی ہیں جن سے دینی بل کہ دنیوی کام میں بھی درمیانی اور متوسط طریقہ کیا ہو معلوم ہوتا ہے۔

مثلاً قرآن شریف میں آواز پست کرنے، اکڑ کر نہ چلنے اور نگاہ کو نیچی رکھنے کے جو

احکام ہیں وہ بھی اسی قبیل سے ہیں "وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا" ۔ "وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ" (سورۃ لقمان ۱۹) ۔لہٰذا بیوی بچوں پر خرچ (مثلاً کپڑوں اور کھانوں اور رہن سہن وغیرہ کے تمام امور) میں اعتدال اختیار کرنا چاہیے۔

اسی طرح بطور خاص ہم ائمہ کو دوسروں کے ساتھ تعلقات اختیار کرنے میں بھی اعتدال کی راہ اپنانی چاہیے کیوں کہ حد سے زیادہ بے تکلفی سے نفرت وعداوت پیدا ہوتی ہے پھر آپ اس کی نظر میں دشمن بن جائیں گے۔

حضرت طاہر بن حسین رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن طاہر رحمہ اللہ تعالیٰ کو جب وہ گورنر بنائے گیے تو کچھ وصیتیں فرمائی۔ان میں سے ایک یہ میانہ روی بھی ہے۔" وَعَلَيْكَ بِالْاَقْتِصَادِ فِي الْأُمُوْرِ كُلِّهَا .فَلَيْسَ شَيْئٌ اَبْيَنَ نَفْعًا. وَلَا اَخَصَّ اَمْنًا. وَلَا اَجْمَعَ فَضْلًا مِنْهُ " (القراءۃ الرشیدہ ۴/۶۱)۔

علماء ومصنفین نے نہ صرف اپنی ذات کا بل کہ اپنے علمی اور تصنیفی مقام کا بھی بہت لحاظ کیا ہے کہ کوئی بھی نقل وحرکت اور قول وفعل ایسا اختیار نہیں فرمایا جس سے اپنا علمی مقام یا تصنیفی کارنامہ متأثر ہو۔امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ کے احوال اس پر شاہد ہیں۔لہٰذا ائمہ حضرات کو بھی اپنے منصب امامت کا خیال رکھتے ہوئے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو منصب کے خلاف ہو۔

حضرت احنف بن قیس رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا:

(۱) اے احنف جو آدمی زیادہ ہنستا ہے اس کا رعب کم ہو جاتا ہے۔

(۲) جو زیادہ مذاق کرتا ہے تو لوگ اسے ہلکا اور بے حیثیت سمجھتے ہیں۔

(۳) جو باتیں زیادہ کرتا ہے اس کی لغزشیں زیادہ ہوجاتی ہیں۔
(۴) جس کی لغزشیں زیادہ ہوجاتی ہیں اس کی حیا کم ہوجاتی ہے
(۵) جس کی حیا کم ہوجاتی ہے اس کی پرہیزگاری کم ہوجاتی ہے
(۶) جس کی پرہیزگاری کم ہوجاتی ہے اس کا دل مردہ ہوجاتا ہے۔

تعلقات کے بارے میں حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالی کا ایک زریں جملہ نقل کیا جاتا ہے اس کو یاد رکھئے ان شاء اللہ بہت کام دے گا جو اسی اعتدالی صفت پر مبنی ہے۔فرمایا " اَلْاِنْقِبَاضُ عَنِ النَّاسِ مَكْسَبَةٌ لِلْعَدَاوَةِ وَالْاِنْبِسَاطُ اِلَيْهِمْ مَجْلَبَةٌ لِقُرَنَاءِ السُّوْءِ، فَكُنْ بَيْنَ الْمُنْقَبِضِ وَالْمُنْبَسِطِ " (حلیۃ الاولیاء ۹/ ۱۳۰)۔

ترجمہ: لوگوں کے ساتھ ترش روئی سے پیش آنا لوگوں کو دشمن بنا دیتا ہے۔ بہت زیادہ خندہ پیشانی سے ملتے رہنا برے ہم نشینوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ لہٰذا ترش روئی اور خندہ پیشانی کے درمیان راہ اختیار کرو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حد اعتدال سے رہنا سکھائیں۔ آمین۔

اپنے اسلاف کی اتباع نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کا قوی ستون ہے

علماء کرام انبیاء علیہم السلام کے وارث اسی لیے قرار دیئے گئے ہیں تاکہ وہ اپنے ماتحت افراد کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اپنی پوری جدوجہد سے اس طرح دین پر جمائے رکھیں جس طرح ایک نبی اپنی زندگی میں اپنی امت کو پوری جدوجہد سے قائم رکھتا اور جمائے رکھتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی حیات طیبہ میں کوہ طور پر جاتے ہوئے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب مقرر کیا تھا وہ اسی مقصد سے تھا۔ اس طرح کی نیابت اور دین پر جمائے رکھنے سے ایک مقصد ان کو اصل دین پر باقی رکھنا ہوتا ہے کہ اصل دین کوئی دوسری صورت اختیار نہ کر جائے۔

اور یہ اس صورت میں حاصل ہوگا جب بعد کے حضرات نبی کے متبعینِ اول وثانی (اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ) کے واسطے سے نبی سے وابستہ ہوں۔ کیوں کہ اگر اپنے اسلافؒ کے ساتھ وابستگی نہ رہے تو سبقاً سبقاً دین اپنی اصلی حالت سے ہٹ کر دوسری شکل اختیار کر جائے۔ اس تفصیل سے اپنے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کی اتباع کا بے انتہا ضروری ہونا معلوم ہوگیا۔ اس کو ایک حدیث شریف کی روشنی سے سمجھئے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے "قَالَ رَاٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فِی اَصْحَابِہٖ تَأَخُّرًا فَقَالَ لَھُمْ تَقَدَّمُوْا وَأْتَمُّوْابِیْ وَلِیَأْتَمَّ بِکُمْ مَنْ بَعْدَکُمْ" (مشکوٰۃ ۹۸)۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو (نماز کی صف یا حصول علم میں) پیچھے رہتے دیکھا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آگے بڑھو اور میری اقتداء کرو کیوں کہ تمہارے بعد والے تمہاری اقتداء کریں گے۔ میری اقتداء کرو کا مطلب یہ ہے کہ جیسا میں کروں ویسا تم بھی کرو۔

اس اتباع کی وجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ بعد میں آنے والے لوگ ایسا ہی عمل اختیار کریں گے جیسا انہوں نے اپنے سے پہلے والوں کو کرتے دیکھا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ بعد والوں کے درست اعمال کا مدار اسلافؒ کے اعمال پر ہے اور اسلافؒ کے اعمال کو اختیار کرنے کا مدار (جو رابط ہے) ان کی اتباع پر ہے۔ اگر یہ اتباع فوت ہوجائے تو درست عمل بھی فوت ہوجائے گا اور نادرست عمل اس کی جگہ لے لیگا۔

اسی پر بس نہیں کہ عملی خرابی پیدا ہوجائے گی بل کہ نظری (علمی) خرابی بھی پیدا ہوجائے گی۔ یعنی عملی اور علمی دونوں خرابیاں پیدا ہوجائیں گی۔ پھر امت کی گمراہی کا دروازہ کھل جائے گا۔

☜ **تَنَبُّه:** قابل توجہ بات یہ ہے کہ اتباع اسلافؒ کا مدار عوام نہیں بل کہ ان کے علماء ہیں جس طرح اصطلاح فقہ کے ''اجماعِ امت'' کا تعلق علماء سے ہے نہ کہ عوام سے۔ کیوں کہ عوام تو خود اپنے علماء کے تابع ہیں، وہ زندگی میں کسی عمل میں مستقل ومنفرد نہیں۔ عوام کے اعمال کی میزان۔۔۔علماء کے اعمال ہیں۔۔۔ جس طرح علماء کے اعمال کی میزان۔۔۔اسلافؒ کے اعمال ہیں۔۔۔لہٰذا ائمہ حضرات اپنے ہر قول وفعل میں پھونک پھونک کر قدم رکھیں کوئی بھی قدم بے سوچے سمجھے اور بے فکری سے نہ رکھیں۔ ورنہ اتباع سلف چھوٹنے پر امت کی گمراہی کے دروازے کھل جائیں گے۔

اس کی مثال حضرت سیدنا نوح علیہ السلام اور ان کے بعد کی قوموں کا حال ہے۔
حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نوح علیہ السلام تک جتنی قومیں آئیں وہ سب مومن تھیں اور ان کے پاس جو انبیاء تشریف لائے وہ دین وایمان اور اعمال بد سے اعمال صالحہ کی طرف دعوت دینے کے لیے تشریف لائے۔ لیکن حضرت نوح علیہ السلام کے بعد کفر وبت پرستی شروع ہوئی، شیطان نے حضرت نوح علیہ السلام کے بعد بت پرستی شروع کروائی۔۔۔

اس طرح کہ ایک نسل کو تو اپنے بزرگوں کی تصویریں بنا کر ذہنی تعظیم خوب کرائی'' صَوَّرُوْا الصَّالِحِیْنَ وَعَظَّمُوْهَا ''۔۔۔پھر دوسری نسل کو ان بزرگوں کے مرنے کے بعد ان کے مجسمے بنوا کر ان کے پاس ٹھہر کر دعائیں اور مرادیں منگوائیں اور ان کے پاس سجدے کرائے، لیکن یہ دعائیں اور سجدے مجسموں کے لیے نہیں بل کہ صرف اللہ کے لیے ہوتے ''مِنَ الصُّوَرِ اِلَی التَّمَاثِیْلِ''۔۔۔پھر تیسری نسل کو بت بنوا کر ان کی عبادت میں لگوایا'' مِنَ التَّمَاثِیْلِ اِلَی الْاَصْنَامِ ''۔۔۔اس طرح بتدریج شرک کی راہیں کھول دیں۔ اس نتیجہ اور اس کے اسباب پر غور کریں تو معلوم یہی ہوگا کہ اس کی وجہ اپنے اسلاف کی اتباع سے ان کے قدم کا ہٹنا اور اپنی سوچ

پر چلنا تھا جس کی وجہ سے بعد کی نسل کو اصل دین نہ پہنچ سکا،

لٰہذا ہم ائمہ حضرات کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے عمل کو پشت در پشت درست درست پہنچائیں۔ یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مذہب کا پیشوا بن کر لوگوں کو مذہب کی دولت نہ دے سکے۔!!! مذکورہ مضمون کو صاحب مرقاتؒ نے مذکورہ حدیث کے تحت اس عنوان سے پیش کیا ہے ”اِتِّبَاعُ السَّلَفِ مَامُوْرٌ بِہٖ“ (مرقات ۳/ ۷۰)۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بعد والوں کے لیے خیریت اسی میں ہے کہ وہ اپنے سلف صالحین کا اتباع کریں۔ جب آدمی اس سے آزاد ہو جاتا ہے تو شیطان اس کو آسانی سے کسی گمراہی اور فتنہ میں مبتلا کر سکتا ہے۔ جن لوگوں نے سلف صالحین کا دامن مضبوطی سے تھام لیا وہ ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ رہے۔ خاص کر ہمارے اس زمانہ میں جب کہ آزاد خیالی کی وبا عام ہے اور بہت سے لوگ صرف اردو رسالے پڑھ پڑھ کر دین کے بارے میں بالکل مجتہدانہ بل کہ آزادانہ طور پر غور کرنے کا اپنے کو حقدار سمجھنے لگتے ہیں تو اس وقت تو ہمیشہ سے زیادہ اتباع سلف کے اصول پر مضبوطی سے جمنے کی اور دوسروں کو جمانے کی ضرورت ہے (دین وشریعت ۱۲۵)۔ کسی عمل سے غفلت وسستی اتنا بڑا جرم نہیں جتنا اپنے نبی واسلاف کی اتباع سے انحراف کرنا جرم ہے کیوں کہ اس میں اصل دین کی متاع فوت ہو جاتی ہے۔ لٰہذا ہم ائمہ حضرات سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ عوام الناس کو اپنے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ سے جوڑنے کی ذمہ داری کو محسوس فرمائیں اور اس کی خوب کوشش کریں۔

خلافِ شرع عقل کی اتباع گمراہی ہے

ایک بات اسی مناسبت سے اور جانتے چلیں کہ یہ اتباع نبوی یا اتباع سلف امر تعبدی (خلاف عقل معاملہ) میں زیادہ واضح ہوتی ہے بنسبت غیر تعبدی کے۔ مثلاً:

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ ’’لَوْ کَانَ الدِّیْنُ بِالرَّایِ لَکَانَ اَسْفَلُ الْخُفِّ اَوْلٰی بِالْمَسْحِ مِنْ اَعْلَاہُ وَقَدْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَمْسَحُ عَلٰی ظَاھِرِ خُفَّیْہِ ‘‘ (مشکوٰۃ ۵۴)۔ اگر دین کا مدار عقل ورائے پر ہوتا تو مسح میں موزے کا نچلا حصہ بنسبت اوپر کے حصہ کے اولی اور بہتر ہوتا (کیوں کہ نچلا حصہ زیادہ گندہ ہوتا ہے بنسبت اوپر والے حصہ کے) لیکن میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو موزے کے اوپر کے حصہ میں مسح کرتے دیکھا ہے۔

(۲) **حضرت امام اعظم ابوحنیفہ (نعمان بن ثابت کوفی)** رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ اگر میں عقل ورائے پر عمل کا قائل ہوتا تو پیشاب کرنے سے وجوبِ غسل اور خروج منی سے وجوبِ وضو کا قائل ہوتا۔ کیوں کہ پیشاب باتفاق فقہاء نجس اور ناپاک ہے جب کہ منی مختلف فیہ۔

اور مسئلہ وراثت میں مرد کو عورت کے حصہ کا نصف حصہ دیتا کیوں کہ عورت اکتساب اموال میں مرد کے بنسبت کمزور ہے جس سے وہ مستحق زیادتی ہے۔ لیکن چوں کہ دین اسلام کا مدار اپنی عقل وسوچ پر نہیں بل کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو ثابت ہو اس پر ہے ،اس لیے میں اس کا قائل نہیں۔

’’ قَدْ قَالَ اَبُوْ حَنِیْفَۃَ لَوْ قُلْتُ بِالرَّایِ لَاَوْجَبْتُ الْغُسْلَ بِالْبَوْلِ لِاَنَّہٗ نَجَسٌ مُتَّفَقٌ عَلَیْہ ، وَالْوُضُوْءَ بِالْمَنِیِّ لِاَنَّہٗ مُخْتَلَفٌ فِیْہِ وَلَاَعْطَیْتُ الذَّکَرَ فِی الْاِرْثِ نِصْفَ الْاُنْثٰی لِکَوْنِھَا اَضْعَفَ مِنْہُ ‘‘ (مرقات ۲/۸۵)۔

(۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشہور ارشاد حجر اسود کی تقبیل کے بارے میں کہ میں جانتا ہوں کہ تو ایک ایسا پتھر ہے جو نہ تو نفع پہونچا سکتا ہے نہ نقصان، اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرا بوسہ لیتے نہ دیکھتا تو میں تیرا بوسہ نہ لیتا (مشکوٰۃ ۲۲۸)۔ یعنی یہ تقبیل اس حد تک تو درست ہے کہ اس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور آپ کے حکم کی تعمیل ہے جو باعث اجر وثواب ہے۔ ورنہ نفس پتھر ہونے کے ناتے اس لائق نہیں کہ اس کی تقبیل کی جائے۔

خلاصہ یہ کہ ہمیں اور اپنے ماتحت افراد کو دینی جملہ امور میں اپنے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کے نقش قدم کو لازم پکڑنا چاہیے۔ چاہے وہ نظریات وعقائد ہوں یا اعمال۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلاف کی کامل اتباع کی مضبوط زنجیروں میں رکھیں ان سے بال کے برابر آزادی سے محفوظ رکھیں۔ آمین۔

(۱۰) امام ومؤذن کی صفات (فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ)

امامت کے لحاظ سے امام کی ذمہ داری کو ہم ان شاء اللہ جزء چہارم میں بیان کریں گے البتہ کچھ ضروری اور اجمالی باتیں جو فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں انہیں پیش کیا جاتا ہے تاکہ اختصار کی وجہ سے ان کو یاد رکھ کر عمل میں لایا جاسکیں۔

فقیہ ابو اللیثؒ فرماتے ہیں کہ اذان کے فضائل حاصل کرنے کے لیے مؤذن کے اندر دس صفات ہونی چاہیے۔

(۱) مؤذن نماز کے اوقات سے واقف ہو۔ تاکہ صحیح وقت پر اذان پکار سکے۔

(۲) آواز کی اور گلے کی حفاظت کرے۔ تاکہ اچھی اذان ہو اور دور تک آواز جاسکے۔

(۳) اپنی غیر موجودگی میں کسی دوسرے کے اذان پکارنے پر خفا نہ ہو۔ یہ بداخلاقی ہے۔

(۴) اذان عمدہ طریقہ پر دینا جانتا ہو۔ یعنی خوش الحانی اور حروف کی صحیح ادائیگی کے ساتھ دینا جانتا ہو۔

(۵) ثواب کی نیت سے اذان دیتا ہو۔ وظیفہ یا دوسروں پر بڑائی جتانے کے لیے نہیں۔

(۶) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہو۔

(۷) امام کا انتظار اتنا کرتا ہو کہ نمازیوں کو ناگوار نہ ہو۔ اور امام کو بھی چاہیے کہ خواہ مخواہ انتظار نہ کروائے۔

(۸) مسجد میں اس کی جگہ کوئی اور بیٹھ جائے تو ناراض نہ ہو۔ مؤذن کے لیے کوئی جگہ متعین نہیں ہے دائیں بائیں کہیں سے بھی اذان (اقامت) دے سکتا ہے۔

(۹) اذان ونماز کے درمیان لمبی نمازیں نہ پڑھے کہ لوگوں کو اس کا انتظار کرنا پڑے۔

(۱۰) مسجد کی صفائی کا خیال رکھے۔ یہ مؤذن کے فرائض میں سے ہے[۱]۔

(روضۃ الصالحین ۳/ ۱۷۵)

---

[۱] اس کے ساتھ کچھ ضروری چیزیں بھی ملاحظہ ہوں۔

چوں کہ تاذین، امامت کا ایک ضمنی منصب ہے لہٰذا اذان کی صحت وغیرہ کی ذمہ داری بھی امام پر ہے نیز اذان ایک اسلامی شعار ہے جس پر بستی کی صلاح وخرابی اور غضب الٰہی سے امن موقوف ہے، لہٰذا ائمہ حضرات کو چاہیے کہ اپنی اپنی مسجدوں میں صحیح اذان دلوانے کی پوری کوشش کریں۔

(۱) باوضوء اذان پکارنے کا اہتمام کرے تا کہ اس کا ثواب بھی حاصل ہو۔

(۲) اذان پکارنے سے پہلے دل میں (بسم اللہ الرحمن الرحیم) پڑھ لے۔

(۳) اذان پکارنے کو عبادت خیال کرے۔ بل کہ دعوت الی اللہ خیال کرے کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلا رہا ہے

(۴) جب اذان باوضوء ایک عبادت اور دعوت الی اللہ ہے تو نابالغ بچوں سے اور کم عقل اور ایسے معذورین سے دلوانے سے پرہیز کرے کہ جن کو معاشرہ میں حقیر سمجھا جاتا ہو۔

(۵) اللہ اکبر کے شروع کے ہمزہ (الف) میں مدنہ کرے ورنہ معنی بدل جائے گا۔ اور اذان کو خواہ مخواہ کھینچ کھینچ کر نہ پکارے۔ صرف لفظ اللہ کے لام پر اور ہر آخری کلمہ پر (سوا اکبر) مد کی وجہ سے کھینچے لیکن وہ بھی بقدر مد اصلی۔

(۶) بہتر یہ ہے کہ مؤذن کلمات اذان کو ان کے معانی سمجھ کر اذان دے اور دوران اذان ان معانی کا خیال بھی دل میں لائے۔

(۷) اذان درمیانی رفتار سے پکارے۔ نہ جلدی جلدی پکارے نہ طویل وقفہ سے۔

(۸) حی علی الصلوٰۃ والفلاح میں دائیں بائیں صرف اپنا چہرہ گھمائے۔ سینہ نہ گھمائے۔

(۹) ختم اذان کی دعا پڑھ لے۔

(۱۰) اقامت (تکبیر) سنت کے مطابق کہے اور جلدی سے کہے۔

ان مذکورہ چیزوں پر خود مؤذن کا دھیان دینا اور اگر وہ غلطی کر رہا ہو تو امام کا اپنے مؤذن کو دھیان دلانا اور سکھانا اور عمل کرانا ضروری ہے۔ اور یہ اس کے لیے باعث اجر وثواب عمل بھی۔ لہٰذا ان چیزوں کے پڑھنے سے پہلے اور پڑھنے کے بعد کے احوال میں فرق ہو سب ہی اس فرق کو محسوس کریں کہ واقع میں اصلاح کا فرق ہوا۔ اسی کو تعلیم وتربیت کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ راہ عمل آسان فرمائیں۔ ”اِنْ کَانَ صَوَابًا فَمِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَاِلَّا فَمِنِّیْ وَمِنَ الشَّیْطَانِ“

اس طرح امام کے لیے دس صفات ضروری ہیں۔

تاکہ اس کی اور قوم کی نماز کامل ہو

(۱) قرآن پاک کو تجوید کے ساتھ صحیح پڑھتا ہو اور مسائل سے واقف ہو۔ اس کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی اور بعض مرتبہ ہوتی ہی نہیں۔

(۲) تکبیرات انتقالیہ ٹھیک سے کہتا ہو۔ تاکہ لوگ سن بھی لیں کسی کو شبہ نہ ہو۔

(۳) رکوع، سجدہ ٹھیک سے ادا کرتا ہو۔ ورنہ نماز ناقص ہوگی۔

(۴) حرام و مشتبہ چیزوں سے احتیاط کرتا ہو۔ امامت کھیل نہیں عظیم عہدہ ہے۔

(۵) جسم اور کپڑوں کو صاف رکھتا ہو۔ تاکہ مقتدیوں کو کراہت نہ ہو۔

(۶) قوم کی مرضی کے بغیر قراءت کو طویل نہ کرے۔ اتنا طویل کے جس سے پریشانی ہو۔ سنت کے مطابق پڑھے۔

(۷) اپنی امامت پر غرور نہ کرتا ہو۔ غرور کا موقع ہی کہاں ہے۔

(۸) نماز شروع کرنے سے پہلے استغفار کرلے۔ یہ جب ہی ممکن ہے کہ امام پہلے سے تیار ہو۔ بھاگ دوڑ میں بہت مشکل ہے۔

(۹) سلام پھیرتے وقت دوسروں کی (سلام کی) نیت کرے۔ داہنی اور بائیں دونوں جانبوں کے وقت۔

(۱۰) اگر مسجد میں کوئی غریب مسافر آجائے تو اس کی خبر گیری کرے کہ یہ امام کی ذمہ داری [۱] ہے (روضۃ الصالحین ۳/۱۷۶)۔

---

[۱] اس کے ساتھ درج ذیل چیزوں کا بھی لحاظ رکھے باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

عالم کی صفات

چوں کہ ائمہ حضرات عالم بھی ہیں اس لیے درج ذیل صفات بھی ان میں ہونا ضروری ہیں۔ بزبان فقیہ ابو اللیث سمر قندی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

(۱) اخلاص: اس کے بغیر علم وعمل بے کار ہیں۔ جس عمل میں اخلاص نہیں اس کا ثواب نہیں۔

باقی حاشیہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

(۱) تکبیرات انتقالیہ کہنے میں نہ انتقال سے بہت پہلے کہے نہ پورے انتقال کے بعد۔ آج کل یہ خامی بہت پائی جاتی ہے، سنت کو ملحوظ رکھے۔

(۲) امام جہری نماز میں قراءت اتنی زور سے نہ پڑھے کہ رگیں ابھر آئیں اور سانس تنگ ہو جائے یہ بھی خشوع کے خلاف ہے۔

(۳) سری نمازوں میں قراءت پڑھنے میں کم از کم ہونٹوں کو پورے طور پر حرکت دے اس طرح کہ ہونٹوں کی پھسپھساہٹ سنائی دے۔ ورنہ قراءت نہ ہوگی اور اگر قراءت نہ ہوگی تو نماز بھی نہ ہوگی۔

(۴) مائک (آلہء مکبر الصوت) کا استعمال کرے تو بہت تیز آواز نہ رکھے یہ بھی نماز کی شان کے خلاف ہے۔ اور اگر نماز کے درمیان گر جائے تو پھر عمل قلیل سے لگالے ورنہ آواز نہ پہنچنے کی وجہ سے دوسروں کی نماز خراب ہوگی۔ آج کل اکثر مسجدوں میں اس کو استعمال کیا جا رہا ہے باوجودیکہ نمازی بہت تھوڑے اور مسجد بہت چھوٹی ہوتی ہے یہ خلاف سنت ہے۔ ضرورت شدیدہ کے بغیر استعمال نامناسب ہے۔

(۵) نماز شروع کرتے وقت تکبیر تحریمہ بہت دھیان سے کہے عجلت میں نہ کہے۔ کیوں کہ نماز کا انعقاد اسی سے ہے جیسی تکبیر ہوگی ویسی پوری نماز ہوگی۔ اسی لیے روایت میں ہے کہ ہر چیز کا ایک خلاصہ ہوتا ہے نماز کا خلاصہ تکبیر تحریمہ ہے۔

(۶) سنت ونوافل مسجد میں پڑھتے وقت تمام سنن وآداب کا لحاظ کرتے ہوئے پڑھے۔ کیوں کہ عوام مسائل پوچھ کر نماز نہیں پڑھتے بل کہ پڑھنے والوں کو دیکھ کر پڑھتے اور سیکھتے ہیں۔

(۷) ایک ہے نماز پڑھنا اور ایک ہے نماز کو بنانا۔ نماز تو ایک مدت سے پڑھتے چلے آرہے ہیں اب آگے بڑھ کر نماز بنانے کے درجہ پر پہنچیں۔ خود بھی نماز بنائیں اور مقتدیوں کو بھی کہیں کہ وہ بھی اب نماز بنانے پر آئیں۔ ''اِنْ کَانَ صَوَابًا فَمِنَ اللہِ تعالیٰ وَاِلَّا فَمِنِّیْ وَمِنَ الشَّیْطَانِ''

(۲) خوف خدا : یہ اخلاص وعمل کی بنیاد ہے۔
(۳) نصیحت : یہ علم کا مقصد ہے کہ آدمی اس پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں سے بھی کرائے۔
(۴) شفقت : یہ نصیحت ودعوت کی بنیاد ہے۔شفقت ہی کہ وجہ سے آدمی دوسروں کو نیک بنانے کی کوشش کرتا ہے۔
(۵) صبر وبردباری : دعوت وتبلیغ میں ناگوار اور تکلیف دہ باتیں پیش آتی ہیں ان پر صبر ضروری ہے ورنہ تبلیغ ممکن ہی نہیں۔
(۶) تواضع: یہ علم کی شان ہے۔صحیح علم تواضع سکھاتا ہے یہ اللہ کو بھی پسند ہے اور بندوں کو بھی۔
(۷) عفت: (پاک دامنی) یہ ہر انسان کا زیور ہے خصوصًا عالم کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ورنہ وعظ ونصیحت بے اثر ہو جائیں گے۔
(۸) مطالعہ: کتب بینی سے علم بڑھتا ہے اور محفوظ رہتا ہے۔یہ ہر عالم کے لیے بہت ضروری ہے۔
(۹) افادہ : (فائدہ پہنچانا) عالم کے لیے جس طرح خود عمل کرنا ضروری ہے اس طرح دوسروں کو نصیحت کرنا اور مسائل بتانا بھی ضروری ہے۔
(۱۰) قلت حجاب : علم حاصل کرنے میں شرم جائز نہیں بل کہ محرومی کا سبب ہے۔علم سوالوں سے بڑھتا ہے "فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" ترجمہ : اگر تم نہیں جانتے تو علم والوں سے دریافت کرلو (روضہ ۳/۳۶)۔

ہر عالم کے پاس نہ بیٹھو

کسی بزرگ نے فرمایا ہر عالم کے پاس نہ بیٹھو بل کہ اس عالم کے پاس بیٹھو جو پانچ باتوں سے پانچ کی طرف بلائے۔ (۱) شک سے یقین کی طرف۔ (۲) تکبر سے تواضع کی

طرف۔ (۳) بغض وعداوت سے محبت ورغبت کی طرف۔ (۴) ریاکاری سے اخلاص کی طرف۔ (۵) دنیا کی محبت ورغبت سے زہد کی طرف۔ بعض نے اس قول کو نبی کریم ﷺ کے طرف منسوب کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

دنیادار عالم

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں عالم اگر دنیا کی طرف راغب اور اس کا حریص ہوتا ہے تو اس کی صحبت، جاہل کی جہالت، فاسق کے فسق کو بڑھاتی ہے اور ان کے دلوں کو سخت کرتی ہے۔

علم کے مراتب

فقیہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں علم کا ابتدائی حصہ خاموشی، دوسرا غور وفکر، تیسرا حفظ، چوتھا عمل، پانچواں تبلیغ ہے۔ اسی طرح علماء کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ عالم باللہ وبامر اللہ۔ جو حدود وفرائض سے واقف ہو اور خوف خدا کے ساتھ عمل بھی کرتا ہو۔

۲۔ عالم باللہ لا بامر اللہ۔ جو خدا سے ڈرتا ہو اور عمل کرتا ہو لیکن مسائل سے زیادہ واقف نہ ہو۔

۳۔ عالم بامر اللہ لا باللہ۔ جو مسائل سے تو خوب واقف ہو لیکن اس کے اندر اللہ کا خوف نہ ہو۔

(روضۃ الصالحین۔ ۳/۳۶)۔

تَنَبُّہ: عالم باللہ کا مطلب جیسے بتایا خدا کا خوف رکھنے والا لیکن وہ ایک باطنی چیز ہے۔ جس کو بالفاظ دیگر کہیں کہ رب العالمین کے جلال وجمال کا مظہر ہو۔

ان قسموں کے علماء میں فرق اس طرح بھی ہے۔

تیسری قسم کے علماء سے صرف مسائل پوچھے جائیں لیکن ان کی مجلس میں بیٹھا نہ جائے۔ دوسری قسم سے مسائل نہ پوچھے جائیں ہاں ان کے پاس بیٹھا جائے۔ اور پہلی قسم سے جو مسائل و مصادر دونوں سے واقف ہیں بطور خاص ان سے مسائل پوچھے بھی جائیں اور ان کے پاس بیٹھا بھی جائیں (توضیحات شرح مشکوۃ ۱/۴۵۱)۔

اصل مقصود دین ہے، نہ کہ ذریعہ

آپ جانتے ہی ہیں کہ ایک عبادت بالواسطہ ہوتی ہے اور دوسری بلاواسطہ۔ آج بالواسطہ عبادت کا رواج ہوگیا ہے اور بلاواسطہ کا کم۔ ضرورت ہے کہ اس کو بڑھایا جائے۔ اور اگر بالواسطہ عبادت میں نفس دین بھی چھوٹ رہا ہو تو کس قدر ناسمجھی اور غفلت کی بات ہوگی !! کیوں کہ آدمی دینی جو کام کرتا ہے اس میں وہ اس کے لیے بہت سے ذرائع بھی عمل میں لاتا ہے۔ لیکن وہ اس ذریعہ کے استعمال کو دین سمجھ بیٹھتا ہے اور اس استعمال ذریعہ میں نفسِ دین (امر الٰہی) کو بھی چھوڑ دیتا ہے!!!

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مساجد و مدارس یا سیاست وغیرہ دین کا ذریعہ ہیں۔ لہٰذا ذریعہ کی حفاظت پر مقصود کو قربان نہیں کرنا چاہیے۔ کون سا کام کس وقت کرنا چاہیے اور کون سا کس وقت اس کی سمجھ رکھنے والے کو فقیہ کہتے ہیں۔ اور فقیہ الاھم بالاھم کی رعایت کرتا ہے۔

دین (اوامر الٰہیہ) کو کسی حال میں چھوڑنا نہیں چاہیے اور کسی بھی منکر کے ارتکاب سے سخت اجتناب کرنا چاہیے۔ اللہ نہ کرے اگر کسی منکر پر عمل کرنے میں مسجد و مدرسہ کی حفاظت نظر بھی آئے تو یہ نظر کا دھوکہ ہے۔ منکر (گناہ) اختیار کرنا کسی بھی صورت میں دین نہیں کہلائے گا!! منکر کے ارتکاب سے اللہ تعالیٰ کی مدد ہٹ جاتی ہے۔ اور جس کام میں سے اللہ کی مدد ہٹ جائے وہ دنیا و آخرت کا بوجھ ہے اور مصیبت کا سبب۔

اس بارے میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قابل عبرت واقعہ یاد رکھنا چاہیے۔ جب وہ دارالعلوم کی کمیٹی کے ممبر بنے تو کسی نے مشورۃً ان کو لکھا کہ فلاں بااثر رئیس کو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا رکن بنالیا جائے، کیوں کہ نہ بنانے کی صورت میں فساد کا خطرہ ہے۔

حضرتؒ نے جواب میں فرمایا کہ اگر عنداللہ مجھ سے سوال ہوا کہ نالائق کو رکن کیوں بنایا؟ تو اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ ہوگا اور رکن نہ بنانے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ یہی ضرر ہوسکتا ہے کہ مدرسہ بند ہوجائے گا جس کا میں یہ جواب دے سکوں گا کہ میں نے تو آپ کے حکم کی تعمیل کی تھی جس پر اگر مدرسہ بند ہوگیا تو اس میں میرا کیا قصور؟ حضرت کے اس تقویٰ کا یہ اثر اور نتیجہ ہوا کہ وہ رئیس صاحب مدرسہ کے خلاف چیختے رہے مگر الحمدللہ دارالعلوم مسلسل حیرت انگیز ترقی پر گامزن رہا (تحفۃ الائمہ ۳۱۳ از احسن الفتاویٰ)۔

حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات میں ہے کہ آج کل دین کے باب میں یہ غلط فہمی عام ہوگئی ہے کہ مبادی کو غایات کا اور ذرائع کو مقاصد کا درجہ دے دیا جاتا ہے!! اگر غور کروگے تو معلوم ہوگا کہ دین کے تمام شعبوں میں یہ غلطی گھس گئی ہے جو ہزاروں خرابیوں کی جڑ ہے (ملفوظات ۸۸)۔

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندویؒ فرماتے ہیں کہ اہل دین اپنے دینی شعبوں میں مقصد کے حصول کے لیے جو مختلف وسائل وطریقے اختیار کرتے ہیں انہیں اپنے اس کام میں شرعی مقاصد وحقائق کی پوری رعایت کرنی چاہیے اور انہیں اس پر غور کرلینا چاہیے کہ کتاب وسنت سے کیا ثابت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ سارا زور وسائل پر لگ جائے اور مقصد کنارہ پر ہوجائے!! انہیں وسائل کے بجائے مقاصد پر زور صرف کرنا چاہیے، جب تک اس پہلو پر توجہ نہ دی جائے گی کما حقہ نہ کمال دین حاصل ہوگا اور نہ مقاصد دینیہ (تزکیہ واحسان ۱۷)۔

اس بارے میں اس حدیث شریف کو ملحوظ رکھنا بھی مفید ہوگا ''عن غُضیفِ بنِ الحارثِ۔۔فَتَمَسُّكٌ بِسُنَّةٍ خَيْرٌ مِنْ اِحْدَاثِ بِدْعَةٍ '' (مشکوٰۃ ۱/ ۳۰)۔پس سنت کو مضبوطی سے پکڑنا بدعت (حسنہ) کے ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔

صاحب مظاہر حق رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ کسی سنت کو پکڑنا اور طریقہ نبوی کی پابندی کرنا خواہ اس کی نوعیت وصورت کتنی ہی معمولی اور مختصر کیوں نہ ہو۔ بدعت کے ایجاد کرنے سے بہتر ہے اگر چہ وہ حسنہ ہی کیوں نہ ہو اور وہ بظاہر کتنا ہی بڑا کام نظر کیوں نہ آتا ہو۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ روحانی ترقی کے مدارج جس نور کے ذریعہ طے ہوتے ہیں وہ صرف سنت اور طریق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی و پابندی سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب کہ بدعت میں پھنسنا اس نور سے محروم ہونا اور ظلمت کو بلانا ہے (مظاہر حق ۱/ ۲۴۴)۔(مزید تفصیل کے لیے کتاب کا مطالعہ فرمائیں آگے عمدہ تفصیل ہے)۔

نیز بعض دفعہ آدمی بذریعہ ''ایجاد حسنہ'' طاعات کے کام انجام دیتا ہے وہ اچھا ہے جب کہ امور شرع کی رعایت سے ہو۔لیکن اگر اس سے عجب وتکبر پیدا ہو اور دوسروں کی تحقیر وتذلیل ہو تو علمائے اسلام فرماتے ہیں ایسی طاعات سے (جن سے عجب پیدا ہو) ایسی معصیت بہتر ہے جو اپنے کو خطا کار سمجھنے کا باعث وذریعہ ہو!!!۔'' مَعْصِيَةٌ اُوْرِثَتْ ذُلًّا وَّاسْتِحْقَارًا خَيْرٌ مِنْ طَاعَةٍ اُوْرِثَتْ عُجْبًا وَّاسْتِكْبَارًا (مرقات ۱/ ۱۳۸)۔

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ '' کے تحت توحید کامل کی طویل تفصیل بیان کی ہے اور دلائل سے اس کو ثابت کیا ہے۔مختصر یہ کہ توحید کامل تین توحیدوں کا مجموعہ ہے۔(۱) توحید ذات (۲) توحید صفات (۳) توحید عبادت۔

توحید ذات یعنی واجب الوجود اور اس کی ذات کو ایک ماننا۔یعنی الوہیت کے قابل

اسی کو ماننا۔

توحید صفات یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات میں کسی کو شریک نہ کرنا۔

پھر دلائل کے بیان میں ذرائع کا ذکر کیا ہے کہ یہ اسلام ہی کی خصوصیت ہے کہ اس میں ذرائع کی عبادت نہیں ہوتی برخلاف دوسرے مذاہب کے کہ ان میں ایسی کامل توحید نہیں کیوں کہ ان میں غیر اللہ یعنی ذرائع کی بھی عبادت ہوتی ہے جب کہ اسلام میں ذرائع کی عبادت ہے ہی نہیں!!!

آپ سوچیے کہ اگر ذریعہ اور واسطہ کی عبادت اسلام میں جائز ہوتی تو کون سا ذریعہ سب سے بڑا اور اہم ہے جس کی عبادت ہوتی؟ تو امام رازیؒ فرماتے ہیں سب سے بڑا ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت ہوتی کیوں کہ وہی توحید کامل کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ یہ تو مذہبی ذریعہ کا ذکر تھا۔ اور مادی دنیا میں شاید سورج کی پرستش جائز ہوتی کہ مادی لحاظ سے بڑا ذریعہ وہی معلوم ہوتا ہے۔

اور جب عبادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جائز نہیں اور (سورج کے) اوقاتِ مکروہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کو بھی سورج کے پرستاروں کی مشابہت سے بچنے کے لیے مکروہ قرار دیا گیا تو پھر مخلوق میں کس کی عبادت ہو سکتی ہے!!

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ سفر سے آئے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تعظیماً سجدہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعجب سے پوچھا "مَاھٰذَا یَا مُعَاذُ" معاذ یہ کیا حرکت ہے؟ عرض کیا یا رسول اللہ میں نے دوران سفر عیسائی قوم کو اپنے بزرگوں کی تعظیم کرتے اور سجدہ کرتے دیکھا تو میں نے سوچا کہ آپ سے بڑھ کر تعظیم کا مستحق ہے ہی کون؟ لہٰذا میں نے آپ کو سجدہ کرنا چاہا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا اگر خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز ہوتا تو

میں عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔

آپ کے اس ارشاد میں اصول اسلام کا ایک بہتا دریا نظر آتا ہے! لیکن ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی معلوم ہوتا ہے (واللہ اعلم) کہ بیوی (عورت) کی ربوبیت اور پرورش خاوند کے ذمہ ہے۔ مادی بھی روحانی بھی۔ مادی تو نان نفقہ مکان وغیرہ ہیں کہ یہ خاوند ہی کے ذمہ ہیں اور دینی جیسے ارشاد ہے۔ "قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا" (اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ) تو گویا خاوند عورت کی دینی ودنیوی ربوبیت کا ذریعہ اور سبب ہے۔

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں حدیث کو اب یوں سمجھئے کہ اگر ربوبیت کا سبب بننے کی وجہ سے کسی کو سجدۂ تعظیمی جائز ہوتا تو شوہر کے لیے جائز ہوتا (یاماں باپ یا بادشاہ کے لیے بھی جائز ہوتا)۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ سجدہ اسباب ربوبیت کے لیے جائز نہیں چاہے وہ تعظیمی ہی کیوں نہ ہو۔ پھر پیروں اور مشائخ کا سجدہ کہاں جائز ہوسکتا ہے (جن کا تو کہیں ذکر بھی نہیں) چاہے زندہ پیروں کا یا ان کے وصال کے بعد ان کی قبروں پر!! (ماخوذ از تفسیر کبیر سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں۔ ج ۱ ر ۱۰۴ و از ۲۴۵ تا ۲۵۲)۔ پوری بحث کا خلاصہ یہ کہ آدمی دینی کام میں جو ذرائع بھی اختیار کرے ان میں اس کا خوب دھیان رکھے کہ اللہ کا کوئی حکم ٹوٹنے نہ پائے چاہے اوامر سے ہو کہ نواہی میں سے۔

ائمہ کہیں جائیں تو نائب مقرر کر کے جائیں

امامت چوں کہ اجتماعی نظام کا ایک باوقار عہدہ ہے جس سے پوری قوم منسلک ہے لہٰذا جب امام کسی سفر وغیرہ کا ارادہ رکھے تو اپنی جگہ کسی ایسے شخص کو نائب بنا کر جائے جو عہدۂ امامت کے لائق ہو۔ اپنے عہدہ کا نائب مقرر کرنا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور دنیا کا دستور بھی۔

جب موسیٰ علیہ السلام بحکم الٰہی کوہ طور پر تشریف لے گئے تو حضرت ہارون علیہ السلام کو

خلیفہ بنایا اور سب کو اس بات کی ہدایت کردی کہ میرے جانے کے بعد ان کی اطاعت کرنا تاکہ تم میں یہ اختلاف نہ ہو کہ ہم موسیٰ کی غیر حاضری میں کس کی پیروی کریں۔ وہ نائب اصل کے امور کو انجام دے اور اس کے نظم وضبط کو برقرار رکھے (معارف القرآن ۶/ ۱۰۹)۔

لہٰذا نائب کا کام یہ ہے کہ وہ وقت پر نماز کی جماعت قائم کرے اور لوگوں کی ان کے اعمال مساجد (وضوء، نماز، قراءت اور دعاؤں) میں اصلاح کی فکر کرے اور ان کی پوری تعلیم وتربیت کرے۔ اور جمعہ کے خطاب میں مناسب موضوع منتخب کرکے لوگوں کی دینی ذہن سازی کرے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکۃ المکرمہ سے حنین تشریف لے گئے تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو مکہ والوں پر امیر بنا کر تشریف لے گئے اور انہیں حکم دیا کہ وہ مکہ میں لوگوں کو قرآن شریف سکھائیں اور ان میں دین کی سمجھ پیدا کریں۔ پھر جب وہاں سے مدینہ واپس جانے لگے تو دوبارہ حضرت معاذ کو مکہ والوں پر نائب مقرر فرمایا (مرقات ۴/ ۱۵۴)۔ معلوم ہوا کہ ائمہ کو نائب بنائے بغیر کہیں جانا نہیں چاہیے۔

اخیر میں ایک اہم اور خاص صفت : اخلاص

اخلاص کی تعریف: ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ اخلاص کسی عمل کو صرف اللہ کی رضا کی نیت سے کرنے کو کہتے ہیں۔ حتی کہ اس کے علاوہ نیت سے کرنے کو اخلاص نہیں کہیں گے چاہے وہ نیت دین کی ہو۔ مثلاً حصول جنت وغیرہ۔ اس تعریف سے گویا اخلاص کی دو قسمیں ثابت ہوئیں۔ (۱) اخلاص خواص۔ (۲) اخلاص عوام۔

(۱) کسی عمل کے اندر نیت صرف اور صرف رضاء الٰہی کی ہو حتی کہ دینی بھی کوئی غرض نہ ہو مثلاً حصول جنت وغیرہ۔ یہ خواص کا اخلاص ہے۔

(۴) کسی عمل کے اندر نیت صرف دین کی ہو دنیوی غرض (مثلاً ریا نمود وغیرہ) نہ ہو البتہ رضاء الٰہی کی نیت موجود نہ ہو۔ یہ بھی اخلاص ہی ہے کیوں کہ اس میں دنیوی غرض فاسد نہیں ہے۔ تاہم پہلے درجہ سے کم کی نیت ہونے کی وجہ سے یہ کم رتبہ کا اخلاص کہلائے گا۔ یہ عوام کا اخلاص ہے۔

اخلاص وریا کی ایک عجیب تعریف ملاحظہ ہو۔ حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کسی عمل کو غیر اللہ کے لیے کرنا تو شرک ہے!! اور کسی عمل کو غیر اللہ کی وجہ سے چھوڑنا ریا کاری ہے!! (پہلے کی مثال یہ کہ کسی کو دکھانے کے لیے نماز پڑھنا، صدقہ دینا اللہ کا ذکر کرنا وغیرہ۔ اور دوسری کی مثال یہ کہ کسی گناہ کو اس لیے چھوڑنا کہ لوگ دیکھ رہے ہیں اگر کروں گا تو لوگ مجھے کیا کہیں گے تو یہ (ترک معصیت وغیرہ) ریا کہلائے گا)۔

اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں مذکورہ نیتوں سے بچا کر عمل کو انجام دینے کی توفیق عطا فرمائیں۔ "العملُ لِغَیرِ اللہِ تَعَالیٰ شِرْکٌ" ۔ وَتَرْکُ الْعَمَلِ لِغَیْرِ اللہِ رِیَاءٌ وَالْاِخْلَاصُ ان یُخَلِّصَکَ اللہُ مِنْھُمَا۔" (مرقات ۲۷۹/۱)۔

اخلاص کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک زریں مقولہ منقول ہے۔ حضرت کی ذہانت وفطانت کے اقوال واحوال اہل علم خوب جانتے ہیں۔ آپ فرماتے تھے:

(۱) جنہوں نے طلب جنت کے خاطر عبادت کی تو یہ عبادت تاجروں کی عبادت کی طرح ہے (کہ جس طرح تاجر کا مقصد لین دین ہوتا ہے اور منافع حاصل کرنا ہوتا ہے اس طرح یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بدلے جنت حاصل کرنا چاہتے ہیں)۔

(۲) جنہوں نے عذاب دوزخ کے ڈر سے عبادت کی تو یہ عبادت غلاموں کی سی عبادت ہے (کہ غلاموں کو آقا کی بات مانے بغیر چارہ نہیں، ورنہ سزا ہوگی)۔

(۳) جنہوں نے اپنے مولا و پروردگار کی رضاء وخوشنودی کے لیے اور اس کی نعمتوں کے شکرانہ

کے طور پر عبادت کی تو یہ عبادت احرار وآزادلوگوں کی سی عبادت ہے!! (جن کے پیش نظر نہ دینی غرض ہے نہ دنیوی نہ طلب نہ ڈر صرف رضا مقصود ہے)۔ یہی عبادت سب سے اعلیٰ درجہ کی ہے (مرقات ۳/۱۴۲)۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کی آیت "اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ (بقرۃ ۱۳۱) اور "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ " کی تفسیر میں تفصیل سے بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ پہلی آیت میں اسلام اور دوسری میں دین سے مراد اطاعت حق ہے جو تمام آسمانی کتابوں اور شریعتوں کا خلاصہ اور روح ہے۔ اور اطاعت حق خواہشات نفسانی اور اتباع ہوا کو چھوڑ کر ہدایت کی پابندی کرنے کو کہتے ہیں۔

پھر لکھا ہے کہ حقیقی اسلام یہ ہے کہ اپنی اغراض اور خواہشات سے بالکل خالی الذہن ہو کر انسان کو اس کی تلاش ہو کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کس میں ہے۔ اور اس کا فرمان میرے لیے کیا ہے ؟ وہ ایک غلام کی طرح گوش برآواز رہے کہ کس طرف جانے کا اور کس کام کے کرنے کا حکم ملتا ہے ؟ اور اس کام کو کس انداز سے کیا جائے جس سے وہ مقبول ہو اور میرا مالک اس سے راضی ہو اس کا نام عبادت و بندگی ہے!!

اس جذبہ اطاعت ومحبت کا کمال انسان کی ترقی کا آخری مقام ہے جس کو مقام عبدیت کہا جاتا ہے جہاں پہنچ کر ابراہیم کو خلیل اللہ اور سید الانبیاء کو عبد کا خطاب ملتا ہے علیہم السلام۔ (معارف القرآن ۱/۲۸۷)۔

مخلص کون ہے؟

فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ کسی نے ایک بزرگ سے پوچھا

مخلص کون ہے؟ تو انہوں نے فرمایا مخلص وہ ہے جو اپنی نیکیوں کو اس طرح چھپائے جس طرح آدمی اپنی برائیوں کو چھپاتا ہے۔ کتنی عجیب بات بتائی!۔ان سے عرض کیا گیا کہ اخلاص کی غایت کیا ہے؟ فرمایا کہ تو اپنی اس تعریف کو ناپسند کرے جو لوگوں کی جانب سے کی جائے (روضۃ الصالحین ۱/ ۱۴)۔

اخلاص کس سے سیکھیں ؟

جب ایک بزرگ نے فرمایا کہ آدمی کو ادب واخلاص چرواہے سے سیکھنا چاہیے؟ تو ان سے پوچھا گیا یہ کس طرح؟ تو انہوں نے فرمایا جب چرواہا بکریوں کے پاس جنگل میں نماز کے وقت پر نماز ادا کرتا ہے تو اس کو اس کا خیال تک نہیں ہوتا کہ یہ میری بکریاں میری تعریف کریں گی۔ اس طرح عامل کو چاہیے کہ وہ لوگوں کی تعریف وبرائیوں سے بے نیاز ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت وبندگی بجالائیں (روضۃ الصالحین ۱/ ۱۷)۔

تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جو لوگ صرف فرائض کا اہتمام کرتے ہیں اور ضروری سنن رواتب وغیرہ پر اکتفاء کرتے ہیں نوافل وغیرہ زائد عبادتوں کا اہتمام نہیں کرتے ان کا یہ عمل بتلاتا ہے کہ وہ اپنا فریضہ اتارتے ہیں یعنی ان میں ریاکاری کا کوئی خاص جذبہ نہیں ہوتا۔

اس کے برخلاف جو حضرات اشراق واوابین، چاشت وتہجد اور ان کے علاوہ بھی رات ودن کے نوافل وغیرہ ادا کرتے ہیں ان میں البتہ ریاکاری کا خطرہ ہوتا ہے خصوصًا جب کہ وہ ان کو مجمع اور لوگوں کے سامنے ادا کرنے کا بڑا اہتمام کرتے ہیں۔ اور اس کی شرعی وجہ بھی ہے کہ جو جتنا اعمال پر کھڑا ہوتا ہے شیطان ان ہی لوگوں پر اپنا زور زیادہ صرف کرتا ہے۔

نیز جو حج کرنے والا ہو بطور خاص عمرہ پر عمرہ کرے، روزہ رکھنے والا ہو بطور خاص نوافل روزے رکھے، اور مال کی خیرات کرنے والا ہو بطور خاص جو خیرات میں مشہور ہو ان

سب میں بھی ریا کاری کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔اور ان دو طبقوں سے زیادہ اجتماعی کوئی کام کرنے والوں میں مثلاً مساجد کے نظام کو سنبھالنے والوں، مدرسہ۔۔۔۔۔ تقریر وخطاب۔۔۔ خانقاہ۔۔۔اور کچھ تبلیغ۔۔اور کچھ تصنیف وغیرہ کے کام کرنے والوں میں بھی اس کا احتمال زیادہ ہوتا ہے [۱]۔

اخلاص کی علامت

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اخلاص کی علامت بتائی ہے۔فرماتے ہیں کہ علامہ شعرانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اخلاص کی ایک علامت لکھی ہے وہ یہ کہ تم جو کام کر رہے ہو، اگر کوئی دوسرا اس کام کو کرنے والا تم سے اچھا اس بستی میں آجائے اور وہ کام ایسا ہو جو علی العین واجب نہ ہو جیسے مدرسہ و مسجد کا اہتمام، وعظ کہنا، پیری

---

[۱] مضمون بالا کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ سب ریا کار ہیں (نعوذ باللہ من ذلک) کسی کی کیا مجال کہ کسی کو ریا کار کہے۔استغفر اللہ۔یہ صرف اصلاح کے لیے بطور احتمال بتایا گیا ہے تا کہ توجہ ہو کیوں کہ صرف ریاء واخلاص کی یا کسی اور صفت کی تقریر کر دینے یا لکھ لینے اور پڑھ لینے سے اصلاح کی طرف مکمل توجہ نہیں ہوتی جب تک اس کے مقام اور اس کے اسباب اور اس کے ازالہ کے علاج سے آگاہ نہ کیا جائے۔

ورنہ کس کا کتنا اخلاص ہے وہ ایک باطنی شی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ہاں سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں بڑی ہی عجیب بات فرمائی ہے اور واقع میں وہ اس کے حقدار ہیں کہ وہ یہ فرمائیں کیوں کہ ان کو حدیث شریف میں باب علم فرمایا گیا ہے۔"اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا" وہ یہ کہ ریا کاروں کے ریا والے اعمال کی خبر تو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں ہوتی البتہ کامل مخلصین (جنھیں ریا کاری سے کبھی کوئی واسطہ ہی نہ پڑا ہو) کو دوسروں کے اخلاص وریا کے اعمال میں تمیز ضرور ہو جاتی ہے وہ لوگوں کے مخلصانہ اور ریا کے اعمال میں فرق محسوس کر لیتے ہیں۔یہ ان کے کامل اخلاص کی برکت ہوتی ہے۔

مریدی کرنا، کسی نیک کام کے لیے چندہ کرنا وغیرہ وغیرہ تو تم کو اس کے آنے کی خوشی ہو رنج نہ ہو۔

بل کہ تم خود لوگوں کو اس کے پاس بھیجو کہ وہاں جاؤ وہ مجھ سے بہتر ہیں اور سارا کام خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالے کر کے خود ایک گوشہ میں بیٹھ جاؤ اور دل میں خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے ایسے آدمی کو بھیجا جس نے تمہارا بوجھ اٹھالیا۔ اگر یہ حالت ہو تو تم واقعی مخلص ہو۔

مگر اب تو حالت یہ ہے کہ اگر کسی عالم کی بستی میں کوئی دوسرا چلا آئے جس کی طرف عوام کا رجوع ہونے لگے تو جلتے مرتے ہیں۔ اور دل سے یہ چاہتے ہیں کہ اس شخص سے کوئی ایسی بات ظاہر ہو جس سے عوام بدگمان ہو جائیں اور اس کو چھوڑ دیں، سمجھتے ہیں کہ بس تمام لوگوں کو ہماری ہی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ کسی اور کی طرف رخ بھی نہ کرنا چاہیے اس حالت میں تم ہرگز مخلص نہیں ہو بل کہ اخلاص سے مفلس ہو (العلم والعلماء، ۱۴۰ از التبلیغ ترجیح الاخرۃ ج ۲۰/ ۲۴۸)۔

اخلاص لانے کا طریقہ

اخلاص حاصل کرنے کے لیے جدوجہد سے کام لینا ہوگا۔ صرف اعمال کر لینے سے اخلاص حاصل نہیں ہوگا۔ پہلے ریا کے جذبہ کو مٹانے کی بھرپور جدوجہد کریں۔ مثلاً:

(۱) اعمال اختیار کرنے کے وقت اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرتوں کا استحضار کیا جائے اور جن کو دکھانے کے لیے کرنے کا دل میں جذبہ ابھرتا ہے ان کو مردہ خیال کیا جائے۔

(۲) اخلاص پر قبولیت عمل اور اس کی برکت کا اور ریا کی وجہ سے پکڑ و سزا کا تصور کیا جائے۔ اس طرح دل پر بوجھ ڈال کر اخلاص کے حصول کی کوشش کریں۔

(۳) ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے اخلاص کی حقیقت مانگتے رہا کریں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہر چھوٹے بڑے عمل میں کامل اخلاص کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

يَارَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

تمت بالخیر



خاتمۂ کتاب

ہم اولاً ائمہ حضرات کی پوری جماعت کو امامت جیسے عظیم منصب کے حصول پر صد مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ درحقیقت وہ امامت میں نائب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور ان کی اس خدمت کو سو بار سلام کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ اس نعمت عظمیٰ پر اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر ادا کریں۔

ایک بات جو فطری اور یقینی ہے اسے ضرور ذہن نشین رکھیں کہ ہر چیز اپنی کچھ وجوہات کی بنا پر ضرور انحطاط وگراوٹ اور کمی کوتاہی کی شکار ہوتی ہے انہی میں سے امامت بھی ہے۔ امامت کے دوران بھی امامت میں انحطاط وگراوٹ پیش آتی ہے جس کی کچھ وجوہات ہیں۔ ہم انہیں نقشہ میں پیش کرتے ہیں تاکہ اختصار بھی حاصل ہو اور سمجھنا بھی آسان ہو۔

ان وجوہات سے ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ ائمہ کو بدنام کرنا ہے یا ان کو لوگوں کی نظروں میں گرانا ہے۔ حاشا وکلا۔ مقصد ائمہ کو انحطاط کے اسباب کی طرف توجہ دلانا ہے تاکہ انہیں جان کر اپنی اصلاح کرسکیں کیوں کہ انہیں جانے بغیر اصلاح ناممکن ہے۔ یہی وہ احوال اور وہ وجوہات ہیں جن کی اصلاح کی طرف مختلف مصنفین نے توجہ دلائی ہے۔ بس اب کام ائمہ کا رہ جاتا ہے کہ جو کچھ اصلاح کی بات سامنے آئے اسے خیر مقدم کہہ کر قبول کرلیں۔

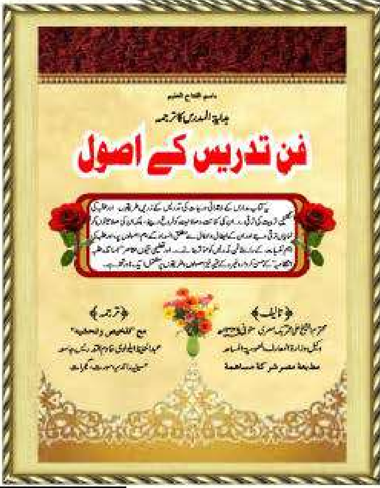
(۱)	بعض ائمہ یقیناً علمی لحاظ سے امامت کے اہل ہوتے ہیں۔ مثلاً ۱۰ ؍ ۲۰ فی صد۔
(۲)	بعض ائمہ یقیناً علمی لحاظ سے امامت کے نااہل ہوتے ہیں۔ مثلاً ۴۰ ؍ ۵۰ فی صد۔
●	بعضوں کی تو قراءت بھی صحیح نہیں ہوتی حتی کہ سورۂ فاتحہ بھی صحیح نہیں ہوتی۔
●	بعضوں کو اہم اہم مسائل کی بھی جانکاری حاصل نہیں ہوتی۔

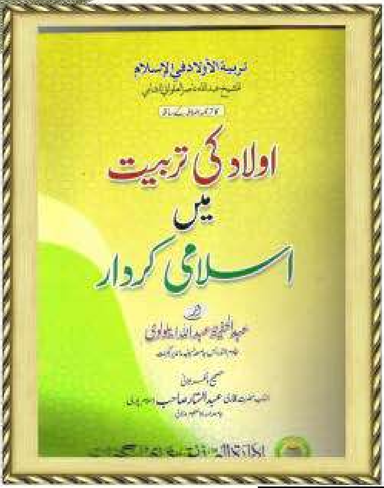
(۳)	بعض ائمہ عملی لحاظ سے امامت کے نااہل ہوتے ہیں۔
●	امامت کے بعد اکثر اوقات لایعنی کاموں میں ضائع کر دیتے ہیں۔
(۴)	بعض ائمہ ایسے بےفکر وست ہوتے ہیں کہ نہ اپنی فکر نہ مقتدیوں کی اصلاح کی فکر۔
(۵)	بعض ائمہ امامت سے صرف معاش چاہتے ہیں۔ان کو صرف تنخواہ سے مطلب ہوتا ہے۔
(۶)	بعض، متولیان کے خوشامدی ہوتے ہیں، خودداری وغیرت سے خالی ہوتے ہیں۔
●	بعض، دوراندیشی ودانشمندی سے کورے ہوتے ہیں۔
(۷)	بعض، ڈرپوک ہوتے ہیں جو نماز پڑھانے کے سوا کچھ نہیں کرپاتے۔

سوچیے ایسی پوزیشن (حالت) میں کیا منصب امامت قوم ومعاشرے میں کوئی انقلاب لاسکتا ہے!! اس کے برخلاف اگر ائمہ علمی وعملی اہلیت کے حامل ہوں، اس عہدے کی عظمت سے قلب لبریز اور رضاء الٰہی سے وہ منور ومعمور ہو، فکر معاش سے آزاد ہو کر اپنے کردار میں فعال ہوں اور ہر طرح کی اصلاح میں متفکر ہوں اور دوراندیشی ودانشمندی کے حامل ہوں تو یہ منصب قوم وجماعت میں کیسا لاجواب انقلاب پیدا کرے!!

تنبیہ : جو ائمہ علمی اہلیت رکھتے ہیں وہ بھی رواجی امامت کرتے کرتے (بےفکری کی وجہ سے) بتدریج اہلیت کھو بیٹھتے ہیں۔ لہٰذا انہیں چاہیے کہ اپنی اہلیت پر حیات طاری رکھیں فکر سے کام لیں۔ اللہ تعالیٰ ان پڑھی لکھی باتوں پر عمل کی توفیق نصیب فرمائیں۔ آمین۔

مؤلف کی دیگر کتابیں





طلب کے ٹھکانے :

مکتبہ احمدیّہ راندیر، سورت	99746 04855
مکتبہ احمدیّہ ایلول، سابرکانٹھا	75750 90455
کتب خانہ رشیدیہ چھاپی ہایوے بناس کانٹھا	99041 11938
مفتی رمضانی صاحب، گودھرا، پنچ محل، گجرات	73833 13951
جمعیت علماء دریا پور، احمد آباد	079-22169200
مولانا حمزہ صاحب، دیوا، دارالعلوم، انکلیشور	94284 42151
قاضی بک ڈپو رانی تلاؤں، سورت	0261-2491985
مدرسہ الیاسیہ منگرول پیرواشم (مہاراشٹر)	89755 14144
مولانا محبوب صاحب، ایلولوی، میگنگر (ایم، پی)	88190 56252
مولانا خالد سیف اللہ پالیہ مسجد (بنگلور ۲۱)	96119 38995

Printed By : HIDAYAT ART 9974034310